ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

1966

برہان

مرتبہ

سعید احمد اکبر آبادی

مکمل لغات القرآن

(چھ جلدوں میں)

قرآن کریم کے الفاظ کی شرح اور اس کے معانی و مطالب کے حل کرنے اور سمجھنے کے لئے اردو میں اس سے بہتر اور جامع کوئی لغت آج تک شائع نہیں ہوئی۔ اس عظیم الشان کتاب میں الفاظِ قرآن کی مکمل اور دلپذیر تشریح کے ساتھ تمام متعلقہ بحثوں کی تفصیل بھی ہے۔ ایک مدرس اس کتاب کو پڑھ کر قرآن مجید کا درس دے سکتا ہے اور ایک عام اردو خواں اس کے مطالعہ سے نہ صرف قرآن شریف کا ترجمہ بہت اچھی طرح کرسکتا ہے بلکہ اس کے مضامین کو بھی بخوبی سمجھ سکتا ہے اور اہل علم و تحقیق کے لئے اس کے علمی مباحث لائق مطالعہ ہیں "لغات قرآن" کے ساتھ الفاظ قرآن کی مکمل اور آسان فہرست بھی دی گئی ہے جس سے ایک لفظ کو دیکھ کر تمام لفظوں کے حوالے بڑی سہولت سے نکالے جاسکتے ہیں۔ "مکمل لغات قرآن" اپنے انداز کی لاجواب کتاب ہے جس کے بعد اس موضوع پر کسی دوسری کتاب کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

جلد		صفحات	تقطیع	غیر مجلد	مجلد
جلد اول	صفحات	۳۳۴	بڑی تقطیع	غیر مجلد پانچ روپے	مجلد چھ روپے
جلد دوم	؍	۳۳۶	؍	؍ پانچ روپے	؍ چھ روپے
جلد سوم	؍	۳۳۲	؍	؍ پانچ روپے	؍ چھ روپے
جلد چہارم	؍	۳۸۹	؍	؍ چھ روپے	؍ سات روپے
جلد پنجم	؍	۵۰۰	؍	؍ آٹھ روپے	؍ نو روپے
جلد ششم	؍	۳۲۴	؍	؍ پانچ روپے	؍ چھ روپے

(پوری کتاب کے مجموعی صفحات ۲۲۱۲)

مکتبہ برہان۔ اردو بازار، جامع مسجد، دہلی

برہان دہلی

جلد ۷۰ | ماہ ذی الحجہ ۱۳۹۲ھ مطابق جنوری ۱۹۷۳ء | شمارہ ۱

نظرات

۲۷ر اور ۲۸ر دسمبر کو بمبئی میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا کنونشن اس دھوم دھام اور جوش و خروش سے منعقد ہوا کہ تحریکِ خلافت کے زمانہ کی یاد تازہ ہوگئی۔ لیکن یہ اجتماع اس اعتبار سے اپنی نظیر آپ تھا کہ اس میں مسلمانوں کی مذہبی۔ تہذیبی اور سیاسی و تعلیمی تنظیمات اور اداروں میں سے کوئی تنظیم اور کوئی ادارہ ایسا نہیں تھا جس کی خاطر خواہ نمائندگی اس اجتماع میں نہ ہوئی ہو۔ اور پھر ان مختلف الافکار اور مختلف المسالک حضرات کی یہ شرکت محض رسمی نہیں تھی۔ بلکہ سب ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح گھلے ملے تھے کہ گویا ان میں کسی قسم کا کوئی اختلاف ہی نہیں۔ دو روز صبح سے شام تک کئی کئی نشستیں ہوئیں۔ مگر کیا مجال کہ کسی بھی شخص کی زبان سے قصداً یا بلا ارادہ کوئی ایسا لفظ نکلا ہو جس سے کسی خاص مسلک کے ساتھ اس کے وابستہ ہونے کا اشارہ نکلتا ہو۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایک مقصدِ عظیم پر مسلمانوں کا یہ مخلصانہ اتحاد اور ایک جہتی اس ملک میں ان کی مذہبی زندگی کے بقا اور اس کے تحفظ کے لیے ایک فالِ نیک ہے۔ اور یہ اس امر کی واضح دلیل ہے کہ مسلمانوں میں باہم کیسے ہی اختلافات اور تفرقے ہوں۔ لیکن جہاں تک نفسِ مذہب اور [illegible] شریعت کی بالا [illegible] اور اس کی حفاظت کا تعلق ہے وہ سب ایک اور بنیانِ مرصوص کی [illegible] ح متحد ہیں۔ اس حیثیت سے یہ اجتماع مسلمانوں کا ایک نہایت اہم اور عظیم تاریخی اجتماع تھا [illegible] اور اس کے اثرات دور رس اور دیرپا ہوں گے۔ مندوبین اور مجلس مضامین کے اجتـ [illegible] ـات کے علاوہ دو [illegible]

شب[illegible] جو عام جلسے میدان میں منعقد ہوئے ان میں بھی مسلمانوں نے اس کثرت اور ولولہ و امنگ سے شرکت کی کہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی غالباً تقسیم کے بعد سے اب تک مسلمانوں کے اتنے بڑے اجتماعات کبھی نہیں ہوئے۔ بمبئی میں اگرچہ سردی کم ہوتی ہے۔ تاہم موسم تو سردی کا ہی ہے۔ اس موسم میں کھلے میدان میں شب کے دو ڈھائی بجے تک ہزاروں انسانوں کا صبر و سکون سے بیٹھے رہنا اور تقریریں دلچسپی اور توجہ سے سننا اگر اس کو اسلام کے ساتھ والہانہ محبت اور جذبہ کا نتیجہ نہ کہا جائے تو اور کیا کہیئے !!

مسلم پرسنل لا کے سلسلے میں رہ رہ کر ملک میں آوازیں اٹھتی تھیں اور اس کا معاملہ گومگو کا تھا۔ ایک طرف حکومت کے بعض اعیان و اساطین کی طرف سے پارلیمنٹ، قانون ساز اسمبلی یا پبلک میں آواز اٹھتی تھی کہ پورے ملک کے لیے ایک ہی سول کوڈ ہونا چاہیے۔ کیونکہ قومی یکجہتی اس کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ دوسری جانب کچھ نام نہاد ترقی پسند مسلمانوں کی طرف سے مطالبہ ہوتا تھا کہ مسلم پرسنل لا میں تغیر و تبدل ہونا چاہیئے۔ تاکہ وہ زمانہ کی موجودہ ضرورتوں اور تقاضوں کے مطابق ہو سکے۔ مسلمان اخبارات میں اس قسم کے خیالات کی تردید ہوتی رہتی تھی۔ ان حالات میں یہ بہت اچھا ہوا بلکہ ضروری بھی تھا کہ مسلمان جماعتوں اور اداروں سب نے ایک آواز ہو کر اپنا ایک فیصلہ واضح اور غیر مشتبہ الفاظ میں ظاہر کر دیا۔ تھوڑی بہت مخالفت تو ہر چیز کی ہوتی ہے۔ اس فیصلہ کے خلاف بھی وقتاً فوقتاً آوازیں بلند ہوتی رہینگی لیکن مسلمانوں کی رائے عامہ کیا ہے ؟ - بلا اختلافِ مسلک و مشرب جمہور علماء و زعما کا کیا فیصلہ ہے ؟ بمبئی کے اس اجتماع کے بعد اس سوال کے جواب میں اب کسی کو — نہ حکومت کو اور نہ اکثریت کو کوئی شک و شبہ نہیں ہونا چاہیئے۔

اگرچہ اس کنونشن میں اور پبلک جلسوں میں تقریریں بڑے جوش و خروش اور

لیکن مسلمانوں کو یہ کبھی فراموش نہ کرنا چاہیے کہ ان جوشیلی تقریر
بلند آہنگی کے ساتھ کی گئیں
اور بلند بانگ دعاوی کا بھرم اسی وقت قائم رہ سکتا ہے جب کہ ان کے ساتھ عمل کی حا
ہو۔ صرف ہندوستان میں نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کا اس وقت حال یہ ہے کہ باتیں دنیا
کی کریں گے۔ جھبکیاں دینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھینگے۔ خطابت اور تقریر کے جوش
حزم و احتیاط کا تسمہ لگا نہ رہنے دیں گے۔ لیکن ان کے دعاوی محض لفاظی کا مظا
ہوں گے اور عمل سے ان کا تعلق بس یونہی برائے نام ہوگا۔ قول و عمل کی یہ عدم
ایک قوم کی زندگی اور اس کی بقا کے لیے کتنا عظیم خطرہ ہے؟ اس کی دلیل اس
اور کیا ہوگی کہ قرآن مجید میں سخت وعید کے انداز میں فرمایا گیا: اے ایمان والو! تم
باتیں زبان سے کیوں نکالتے ہو جن پر تم عمل نہیں کرتے۔ یاد رکھو اللہ کو سب
یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ تم وہ کہو جس پر تم عمل پیرا نہ ہو۔

آج یہاں اور وہاں ہر جگہ اسلام اور مسلمانوں کو جو معاملات و مسائل پیش
ہیں وہ خود مسلمانوں کی بے عملی۔ بلکہ بدعملی کے باعث پیش آرہے ہیں اور اس کا سب
زیادہ المناک پہلو یہ ہے کہ ان کی بدعملی سے دینِ قیم بدنام ہو رہا ہے، شریعت
دشمنوں اور بدقواروں کے طعن و تشنیع کا ہدف بنی ہوئی ہے۔ اور اس
بڑھ کر یہ کہ حضور پُر نور جو رحمتِ عالم بن کر تشریف لائے اور اس حیثیت سے کوئی
نہیں کہ انسانیت کے سب سے بڑے محسن آپ ہی ہیں اب لوگوں کی جرأت کا یہ
ہے کہ مسلمانوں کی بدعملی کے باعث آپ کی شانِ اقدس میں کھلی گستاخیاں کر
نہیں شرماتے،

مسلم پرسنل لا تو اپنے اصطلاحی معنی میں صرف ایک جزوی چیز ہے۔ ورنہ

پوری شریعت اور اس کے قانون کا ہے۔ اس کے متعلق یہ بات بالکل صاف اور واضح ہے
اس میں کوئی کسی قسم کا تغیر و تبدل باین معنیٰ نہیں ہو سکتا کہ اس کے حلال کو حرام اور
حرام کو حلال نہیں بنایا جا سکتا، اس کا اختیار کسی اور کو تو کیا ہوتا! خود آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کو بھی نہیں تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ نے ایک خاص تاثر کے ماتحت ایک مباح
چیز کے استعمال نہ کرنے کا عہد فرما لیا تو قرآن میں آپ کو اس پر ٹوکا گیا اور یہاں تک فرمایا
گیا: "آپ لوگوں کا اس درجہ خیال کرتے ہیں حالانکہ اتنا خیال تو صرف اللہ کا کرنا چاہیئے"
البتہ حالات شخصی و انفرادی ہوں یا جماعتی و قومی دو قسم کے ہوتے ہیں ایک معمولی
(ORDINARY) اور دوسرے غیر معمولی (EMRGENT) علاوہ ازیں انسانی
سماج و تمدن کے ارتقا کے ساتھ سماجی قدروں اور خیر و شر و نفع و ضرر کے معیاروں میں
بھی تبدیلی پیدا ہوتی رہتی ہے اور کوئی قانون جس کا بنیادی مقصد انسانوں کی فلاح
و بہبود ہو ان چیزوں سے صرف نظر نہیں کر سکتا۔ اس بنا پر یہ لچک شریعتِ اسلام
میں بھی موجود ہے اور اس میں اس بات کی صلاحیت بدرجہ اتم ہے کہ سماج میں حالات خواہ کسی قسم کے
بھی پیدا ہوں شریعت ان سے عہدہ برا ہو سکتی اور ان کی تلافی کر سکتی ہے۔

لیکن یہ ادل بدل کرنے کا حق کس کو ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود چونکہ خود شارع
یا بانیٔ شریعت تھے اس بنا پر کتبِ حدیث کا مطالعہ وقتِ نظر سے کیجئے تو معلوم ہوگا
کہ جس طرح ایک طبیبِ حاذق مریض کے حالات و کیفیتِ مرض میں تغیر و تبدل رونما ہوتا ہے
اس کے مطابق وہ اپنے نسخہ میں بھی ترمیم و تنسیخ کرتا رہتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
نے حکومت کے باب معاملہ کے حالات کے پیش نظر احکام میں تغیر و تبدل کثرت سے کیا ہے، رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ حق خلفائے راشدین کی طرف منتقل ہو گیا۔ کیونکہ یہ حضرات آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین تھے اور اس بنا پر ان کی سیاست بھی دین کے تابع تھی حضرت عمر

خلفائے راشدین میں طبعاً سب سے زیادہ جری۔ جسور اور بیباک تھے اور پھر کثرتِ فتوحات
اور مملکتِ اسلامی کی توسیع کے باعث گوناگوں حالات بھی کثرت سے آپ کے عہدِ خلافت میں ہی پیش
آئے اس بنا پر احکام میں رد و بدل کرنے کے حق کا استعمال بھی سب سے زیادہ آپ نے ہی کیا ہے۔
تاریخ و سیر کی کتابوں میں جس کو اجتہاداتِ عمر کہتے ہیں وہ اسی حق کے استعمال کا مظہر ہیں خلافتِ
راشدہ کے اختتام کے بعد چونکہ ملوکیتِ عضوض قائم ہوگئی اور دین کو سیاست کے تابع بنا لیا گیا۔
اس بنا پر اب احکام میں رد و بدل کا اختیار کسی حکومت کو نہیں دیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ اب یہ اختیار
مفتی اور قاضی یا علمائے مجتہدین۔ یا مسلمانوں کی مرکزی مجلس شوریٰ جس کے فیصلوں کو اجتماع کا۔
مرتبہ و مقام حاصل ہے ان کی طرف منتقل ہوگیا۔ حکومت اور ریاست کی جو صورت خلافتِ
راشدہ کے بعد قائم ہوئی تھی۔ چند مستثنیات کو چھوڑ کر بدقسمتی سے وہ اب تک قائم ہے اس
بنا پر یہ امر تو بالکل صاف ظاہر ہے کہ احکامِ شریعت میں رد و بدل کا حق کسی سیکولر اور غیر مسلم
گورنمنٹ یا اس کی پارلیمنٹ کو تو کیا ہوتا موجودہ زمانہ کی مسلم حکومتوں کو بھی نہیں ہے۔

بمبئی کنونشن میں جو قرار داد منظور ہوئی ہے اس کا حاصل بس یہی ہے اور اس کے سو
کچھ اور نہیں لیکن مسلمانوں کو سمجھنا چاہیئے کہ موجودہ زمانہ میں اسلام کے جو تقاضے اور وقت کے
جو مطالبات ہیں یہ کنونشن اور اس کی تجویزیں ان کے لیے نہ کافی ہیں اور نہ ان سے ان کی تکمیل
میں کوئی مدد ملتی ہے۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ مسلمانوں کے سماج میں چند در چند خرابیاں
ہیں ان کا خوش حال اور متمول طبقہ دولت کے پندار میں مباحات کا غلط استعمال کھلے بندوں
اور بڑی ڈھٹائی سے کر رہا ہے اور وہ ذرا اس بات کو محسوس نہیں کرتا کہ اس کا یہ عمل غریب اور
متوسط طبقہ کے لیے سخت پریشانی اور تشویش کا باعث بنا ہوا ہے اور اس بنا پر یہ شریعت
اسلامیہ کی اسپرٹ اور روح کے سرتا سر خلاف ہے جب ایک طبقہ میں فساد ہوتا ہے
ناممکن ہے کہ اس کی موجِ سبک گام دوسرے طبقات کی معیشت اور معاشرت کی دنیا

تک نہ پہونچے۔ چنانچہ اندازہ کیجیے، آخر کتنی عورتیں جو ہمارے سماج میں مظلومیت اور کس مپرسی کی زندگی گزار رہی ہیں۔ کتنی لڑکیاں ہیں جو شباب کی منزل کی آخری حد پر پہونچ جانے کے باوجود اب تک بن بیاہی بیٹھی ہیں اور صرف اس لیے کہ رسم ورواج نے عقد نکاح کے لیے اپنے ہاتھ سے جو بت تراشے ہیں۔ ان بدنصیب لڑکیوں کے ماں باپ ان بتوں پر چڑھاوے کا بندوبست نہیں کر سکتے ؛ علاوہ ازیں کتنے بچے اور بچیاں ہیں جو حرمان و بدنصیبی کی زندگی بسر کرنے پر صرف اس لیے مجبور ہیں کہ ان کے بیرحم باپوں نے ان کی ماؤں کو کسی معقول وجہ کے بغیر طلاق دیدی ہے، یا طلاق تو نہیں دی لیکن ایک اور عقد کر لینے کے باعث پہلی بیوی کو "کالمعلقہ" بنا کر چھوڑ دیا ہے۔ یہ اور اس کے علاوہ اور دسیوں معاشرتی خرابیاں ہمارے ملّی وجود کے وہ ناسور ہیں جو رفتہ رفتہ ہماری توانائی اور طاقت کو کم کر رہے ہیں۔ بمبئی کنونشن نے اس طرف کوئی توجہ نہیں کی اور نہ ان مسائل سے کوئی تعرض کیا، البتہ کنونشن میں ایک مستقل بورڈ کی جو تجویز منظور ہوئی ہے۔ ممکن ہے وہ اس جانب توجہ کرے۔ بہر حال مسلم پرسنل لا کی حفاظت اور اس کے وقار کو باقی رکھنا ہے تو اس کی سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ مسلمان اس پر سچ مچ عمل کریں اور اس کا ایک ایسا نمونہ بن کر دنیا کے سامنے آئیں کہ دوسرے لوگوں کو قانونِ شریعت کی طرف کشش ہو اور وہ معترض اور نکتہ چین ہونے کے بجائے اس کے مداح اور معترف ہوں۔ پھر ان معاملات میں مسلمانوں کی رہنمائی ان کی نگرانی اور احتساب کے لیے ایک مجلسِ مشاورتِ ملّی ہونی چاہیے جو حالاتِ نو بنو کا جائزہ لیتی اور ان کے مطابق مسلمانوں کے لیے ایک راہِ عمل کی نشاندہی کرتی رہے۔

اگر یہ کنونشن اس آل انڈیا مجلسِ مشاورتِ ملّی کے قیام کا پیش خیمہ بن سکی اور اس سے اس کی راہ ہموار ہونے میں مدد ملی تو سمجھیے کہ ایک بہت بڑا کام ہو گیا۔ کنونشن جیسا تاریخی اور ہمہ گیر اجتماع روز روز نہیں ہو سکتا۔ اگر اس کو صرف چند تجویزوں کے پاس کر دینے

تک محدود رکھا گیا تو یہ مسلمانوں کی نا اہلیت اور کارکردگی کا ایک اور ثبوت ہوگا۔

بمبئی کے مسلمان عالی ہمتی۔ اولوالعزمی اور ملّی و قومی معاملات و مسائل کے احساس و شعور اور ان کے ساتھ عملی دلچسپی کے لیے مشہور ہیں۔ چنانچہ مہاراشٹر کالج جہاں مہمانوں کے قیام و طعام اور کنونشن کی نشستوں کا انتظام تھا خود مسلمانانِ بمبئی کے ان اوصاف و خصوصیات کا ایک زندہ ثبوت ہے۔ یہ چھ منزلوں کا نہایت عالیشان کالج ہے۔ جس کو انجمن خیر الاسلام نے اب سے چار برس پہلے چند ماہ میں بنا کر کھڑا کر دیا ہے۔ انجمن کو اس کی تعمیر کا خیال اس طرح پیدا ہوا کہ اس نے محسوس کیا سنٹرل بمبئی کے ایک حصہ میں لاکھوں غریب (جن میں اکثر و بیشتر مسلمان ہی ہیں) بستے ہیں۔ اُن کے لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے اعلیٰ تعلیم کا کوئی بندوبست نہیں ہے۔ کیوں کہ اعلیٰ تعلیم گاہیں جو کچھ بھی ہیں جنوبی بمبئی میں ہیں اور وہاں ان غریب طلبا اور طالبات کے لیے داخلہ لینا سخت مشکل کام ہے۔ اس خیال کا آنا تھا کہ انجمن نے کمرِ ہمت باندھ لی اور وزیرِ تعلیم سے گفتگو کے بعد دو ہزار مربع گز کی ایک زمین خریدی۔ ۱۱ جنوری ۱۹۶۸ء کو ڈاکٹر رفیق زکریا وزیرِ مہاراشٹر گورنمنٹ کے ہاتھوں کالج کا سنگ بنیاد رکھا گیا اور صرف پانچ مہینوں میں یعنی جون ۱۹۶۸ء کے ختم تک سہ منزلہ بلڈنگ مکمل ہوگئی اور اس میں کالج کا جس میں آرٹس اور سائنس دونوں کی تعلیم ہوتی ہے باقاعدہ افتتاح ہوگیا۔ اس کے بعد ابھی پورا ایک برس بھی نہیں ہوا تھا کہ منصوبہ کے مطابق تین اور منزلیں تعمیر ہوگئیں اور آج یہ عظیم الشان اور پرشکوہ کالج سنٹرل بمبئی کے قلب میں اپنی شش منزلہ عمارت کے ساتھ کھڑا مسلمانانِ بمبئی کی اولوالعزمی۔ بیدار دماغی اور روشن خیالی کی رجز خوانی کر رہا ہے۔ اس علاقہ میں کالج کی ضرورت کتنی شدید تھی! اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ پہلے ہی سال میں یہاں چھ سو طلباء اور طالبات کا داخلہ ہوا یہ ۱۹۶۸ء کی بات تھی ۱۹۷۱ء میں یہ تعداد بڑھتے بڑھتے ایک ہزار آٹھ سو پچاس تک پہنچ گئی۔ اس بلڈنگ میں

سائنس [illegible] کا ایک ہوسٹل بھی ہے۔ علاوہ ازیں انجمن نے اس بلڈنگ میں ایک میڈیکل سنٹر بھی قائم کر رکھا ہے جس کی حیثیت ایک خیراتی شفاخانہ کی ہے، انجمن کا یہ عظیم کارنامہ جب منظرِ عام پر آیا تو پورے مہاراشٹر میں دھوم مچ گئی۔

بمبئی میں مسلمانوں کے اور دوسرے ادارے اور انجمنیں بھی ہیں جو عام فلاح و بہبود کے کام خاموشی اور مستعدی سے کر رہے ہیں لیکن ان سب سے زیادہ فعّال اور سرگرم غالباً انجمن خیر الاسلام ہی ہے۔ [illegible] میں اس نے اپنی چوالیسویں سالانہ رپورٹ شائع کی ہے اس میں بتایا ہے کہ اس وقت وہ اپنے زیرِ انتظام بارہ ہائی اسکول (لڑکوں اور لڑکیوں کے الگ الگ جن میں ذریعہ تعلیم اُردو ہے۔ تین کالج (بمبئی اور پونا میں) ایک طبیہ کالج۔ ایک شفاخانہ، ایک میڈیکل سنٹر، ایک صنعتی تعلیم کا ادارہ، دس کنڈر گارڈن، چار یتیم خانے (لڑکوں اور لڑکیوں کے الگ الگ) یہ سب ادارے جن پر مجموعی خرچ کم و بیش پچاس لاکھ سالانہ ہوتا ہے۔ بڑی کامیابی اور خوش اسلوبی سے چلا رہی ہے۔ اس رپورٹ میں اسکولوں اور کالجوں کے امتحانات کے جو نتائج شائع کئے گئے ہیں وہ نہایت حوصلہ افزا اور ولولہ آفریں ہیں لڑکوں اور لڑکیوں کی ایک بڑی تعداد نے فرسٹ ڈویژن میں کامیابی حاصل کی اور یونیورسٹی سے انعامات پائے ہیں انجمن نے ان اداروں کے قیام پر ہی اکتفا نہیں کیا، بلکہ جہاں جہاں ضرورت ہے وہ مزید ہائی سکول اور کنڈر گارڈن کلاسز کھولتی جا رہی ہے۔ یہ کام عام فلاح و بہبود کے ہیں اس لیے غیر مسلم بھی ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ لیکن چونکہ سرمایہ سب انجمن کا ہے اس بنا پر ایڈمنسٹریشن سب مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے، اور اس بنا پر ان سب اداروں میں عربی، فارسی اور اُردو کی تعلیم کا اور گورنمنٹ کی پالیسی کے باعث۔ اخلاقیات کے زیرِ عنوان اسلامیات کی تعلیم اور اس کے مطابق طلباء اور طالبات کی اخلاقی نگرانی اور تربیت کا بھی خاص اہتمام و انتظام ہے۔ اس معاملہ میں مسلمانانِ بمبئی کی ہمت و جرأت کا اندازہ اس ایک بات سے بھی ہو سکتا ہے کہ مسلم پرسنل لا پر عظیم کنونشن انجمن کے ایک نمایاں اور نامور کالج میں منعقد ہوا۔ اور انجمن کے [illegible]

عہدہ داروں اور کالج کے پرنسپل نے اس کونشن کو کامیاب بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

۲۸۔ دسمبر کو کنونشن ختم ہوگیا، تو انجمن کے فاضل سکریٹری کی درخواست پر مہاراشٹر کالج کے قریب ہی لڑکیوں کے ایک ہائی سکول میں ۲۹ر کو شام کے چار بجے راقم الحروف نے۔ "اسلام میں عورتوں کے حقوق اور فرائض" پر ایک گھنٹہ تقریر کی۔ اگرچہ یہ زمانہ تعطیلات کا تھا۔ مگر پھر بھی طالبات اور معلمات اور کچھ مقامی خواتین کا ایک اچھا خاصہ اجتماع تھا۔ پہلے محترمہ پرنسپل نے مقرر کے خیر مقدم میں تقریر کی اس کے بعد مولانا ظل الرحمٰن صاحب نے اپنی تقریر میں انجمن اور اس کے کارناموں کا تعارف کرایا۔ اور پھر راقم الحروف کی باری آئی طالبات اور دوسری خواتین سب کے چہرہ بشرہ سے اسلامی شرم وحیا۔ سادگی اور بھولے پن کا رنگ صاف نمایاں تھا۔

بمبئی کی اس ایک انجمن کے کارناموں کا یہ مختصر تذکرہ سننے کے بعد شمالی ہند کے مسلمانوں کو بتانا چاہیے کہ یہاں بھی تو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور دوسری انجمنیں قائم ہیں انھوں نے تقسیم کے بعد سے اب تک کتنے کالج کتنے ہائی سکول۔ کتنے صنعتی تعلیم کے ادارے کتنے نرسیریز، اور کتنے یتیم خانے قائم کئے ہیں؟ کوئی نیا کالج اور نیا ہائی سکول قائم کرنا تو بڑی بات ہے تقسیم سے پہلے سے جو اسلامیہ کالج اور اسکول چلے آرہے ہیں آج خود ان کا کیا حال ہے؟ کیا موجودہ زمانہ کی ضرورتوں اور تقاضوں کے مطابق ان کو ترقی یافتہ درس گاہیں کہا جا سکتا ہے اور کیا وہ فنڈ کی کمی کا شکار نہیں ہیں؟

تو بخویشتن چہ کردی کہ بما کنی نظیری
بخدا کہ واجب آمد زتو احتراز کردن

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

اسلامیان ہند کا تہذیبی ورثہ

(۷)

از:۔ سعید احمد اکبر آبادی

حکومت کے مقابلے میں علی گڑھ کالج کی یہ کامیابی اس قدر عظیم تھی کہ ملک بھر کے مسلمانوں نے اس کا جشن منایا۔ شعرا نے نظمیں کہیں قطعات لکھے۔ اخبارات میں مضامین شائع ہوئے۔ نواب صاحب اور ٹرسٹیوں پر مبارک باد کے خطوط اور ٹیلیگراموں کی بھرمار ہو گئی حضرت اکبر الہ آبادی نے کالج کی زندگی میں اس اہم واقعہ کی تاریخ "وقارِ عظیم" نکالی [1]

ایک سبق اس زمانہ کے مسلمانوں کے لیے اس واقعہ کا یہ پہلو خاص طور پر نگاہ میں رکھنے کے لائق ہے کہ اس زمانہ میں سرسیّد کے زیرِ قیادت مسلمانوں کی پالیسی حکومت سے تعاون اور اشتراکِ عمل کی تھی۔ لیکن اس پالیسی کے اختیار کرنے میں دخل حکومت کی چاپلوسی یا خوشا

---

[1] جن دنوں میں یہ معرکہ برپا تھا اس زمانے میں بھی اکبر الہ آبادی مرحوم نے ایک دوست کو پرائیویٹ خط میں یہ شعر لکھا تھا۔

کالج کے در پہ لکھ دے کوئی آب گولڈ سے　　　ختم ہو سکے نہ سکرٹری آرچ بولڈ سے

موصوف اس شعر کے بعد یہ بھی لکھتے ہیں:۔ آرچ اور ختم کی رعایت قابلِ لحاظ ہے۔

کا ہرگز نہیں تھا۔ بلکہ انھوں نے یہ راہ سوچ سمجھ کر قومی اور ملّی مفاد کے پیش نظر پسند کی تھی۔ اس بنا پر ان میں خوف اور جبن نہیں تھا۔ اور جب کبھی ان کو ملّی مفاد کے لیے کوئی خطرہ نظر آتا تھا وہ برملا حکومت پر اس کا اظہار اور اظہار پر اصرار کر بیٹھتے تھے۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کے نزدیک حکومت سے وفاداری کے معنی حکومت کی غلامی کے نہیں تھے۔ خود سرسید کی زندگی میں اس قسم کے متعدد مواقع پیش آ چکے تھے اور اب نواب وقار الملک کے عہد میں تو یہ ایک واقعہ ایسا پیش آیا جس نے ہندوستان کے سب مسلمانوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔"

آپ پوچھ سکتے ہیں کہ جب انگریزوں کے دورِ غلامی میں مسلمانوں کی بے خوفی اور بے جگری کا یہ عالم تھا تو آج قومی حکومت کے زمانہ میں یہ بات کیوں نہیں؟ گذارش یہ ہے کہ اس کے وجوہ و اسباب چند در چند ہیں۔ لیکن بڑی وجہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں علی گڈھ کالج صرف ایک کالج نہ تھا۔ بلکہ ایک تحریک تھا۔ اس بنا پر اس کالج کے سکریٹری اور ٹرسٹی مسلمانوں کے لیڈر اور ان کے قائد بھی ہوتے تھے۔ لیکن تقسیم کے بعد سے علی گڈھ یونیورسٹی کی یہ حیثیت ختم ہو گئی۔ اور اب وہاں زمامِ اختیار و اقتدار جن ہاتھوں میں ہوتی ہے وہ بلا واسطہ یا بالواسطہ حکومت کے منتخب لوگ ہوتے ہیں اور مسلمانوں کے معتمد علیہ نہیں ہوتے یہ دوسری بات ہے کہ کسی نے اپنے بے غل وغش اور بے لوث کیرکٹر کے باعث مسلمانوں کا اعتماد حاصل کر لیا ہو۔

ٹرسٹیوں کا اعلان | بہرحال اس واقعہ سے حکومت کو غلط فہمی ہو سکتی تھی کہ علی گڈھ کالج نے حکومت سے وفاداری اور اس کے ساتھ اشتراکِ عمل کی پالیسی میں تبدیلی کر لی ہے اور بعض حلقوں میں اس کا اظہار کیا بھی گیا۔ چونکہ اس سے کالج کو نقصان پہونچ سکتا تھا۔ اس بنا پر کالج کے ٹرسٹیوں نے ایک وضاحتی بیان شائع کیا اور اس میں انھوں نے صاف لفظوں میں کہا۔

"ہم اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ (یورپین) اسٹاف کی امداد اور ان کا درست رویہ کالج کی روایات کو قائم رکھنے کے لیے نہایت ضروری ہے، پس ہم لوگوں کی کارروائی کا جو فرض کے سچے اور اعلیٰ احساس کا نتیجہ ہے۔ کچھ اور مطلب بتانا سخت بیہودہ اور نامناسب اور سراسر ناجائز ہے۔" (ص ۵۰۴)

جدید پرنسپل | نواب صاحب کی معاملہ فہمی اور دور اندیشی کی داد دینی چاہیئے کہ مسٹر آرچ بولڈ کا استعفا منظور کر لینے کے بعد اب انہوں نے نیا پرنسپل منتخب کیا تو وہ بھی انگریز تھا اور کالج کے یورپین اسٹاف کا سینیر ممبر ہی تھا۔ لیکن اس طرح کے تقرر سے پہلے اس کو ایک مفصل خط لکھا کہ بحیثیت پرنسپل کے اس کے فرائض کیا ہوں گے اور سکریٹری اور کالج کے ٹرسٹیوں کو اس سے کیا توقعات ہوں گی۔ گویا پرنسپل اب بھی ایک انگریز ہی کو رکھا۔ مگر اپنی شرائط کا پابند بنا کر! "جام وسندان باختن" اسی کو کہتے ہیں۔ "موصوف نے جب ان سب شرائط کو تسلیم کر لیا تو ان کا تقرر ہوا۔ ابتداءً دو برس کے لیے آزمائشی طور پر اور اس کے بعد مستقل، جب پرنسپل کو اس طرح پابند بنا لیا تو اب اسٹاف کے باقی لوگوں سے کیا خطرہ ہو سکتا تھا۔ ان کا نام مسٹر نول تھا۔

باقی اصلاحات و انتظامات | جب اس معرکہ سے فراغت ہوئی اور نواب صاحب سکریٹری کے اختیارات کو اپنی صوابدید کے مطابق آزادی کے ساتھ استعمال کرنے کے لائق ہو گئے تو اب انہوں نے دوسرے اہم اور ضروری امور کی طرف توجہ کی۔ اس سلسلہ میں انھوں نے تین چار برس کی مدت میں ہی جو کارنامے انجام دیئے ہیں ان کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ قدرت نے ان میں کس بلا کی قوت عمل اور دل ودماغ کی توانائی سے نوازا تھا۔ یہ سب کچھ یقیناً ایک غیر معمولی مشنری اسپرٹ کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ ان اصلاحات کا خلاصہ مولف وقار حیات کی زبان سے سن لیجئے۔ لکھتے ہیں:۔

"نواب صاحب کے زمانہ میں کالج میں بہت سی اصلاحات اور جدید انتظامات عمل میں آئے۔ مثلاً دفتر کی تہذیب وترتیب، پابندیِ اوقات۔ نظام عمل کی تبدیلیاں جدید اساتذہ کا تقرر، دینیات کا خاص انتظام۔ قوانین کی ترمیت واصلاح، پریس وانسٹی ٹیوٹ گزٹ کی ترقی، کاروبار کی مختلف شعبوں پر تقسیم، اور مقامی ٹرسٹیوں کو کام میں شرکت کا موقع دینا، سنڈیکیٹ کا قیام۔ ٹرسٹیوں کی تعداد میں اضافہ، اساتذہ کے حقوق اور مدارج ترقی کا تعین، اور ان کو

ٹریننگ میں بھیجنے کا انتظام ، جدید عمارات کی تعمیر، سائنس اسکول کی ترقی،
غرض اسی قسم کی متعدد اصلاحیں ہوئیں اور انتظامی تغیرات عمل میں آئے
جن کے لکھنے کے لیے ایک اور مستقل کتاب کی ضرورت ہے (ص ۴۹۹)
تاہم جو چند بہت ہی نمایاں اصلاحات ہیں وہ یہ ہیں :-

پہلے صرف کالج کے ٹرسٹیوں کی ایک مجلس تھی جس کا اجلاس سال میں دو مرتبہ ہوتا تھا۔ آج کل کی اصطلاح میں اسی کو کورٹ (COURT) سمجھئے۔ نواب صاحب نے ایک سنڈیکیٹ قائم کیا جو فوری ضرورتوں کے وقت اہم امور کا فیصلہ کرسکے اور اس کے اختیارات وسیع رکھے۔ آج کل اس قسم کی ذمہ دار کمیٹیوں کو بعض یونیورسٹیوں میں (مثلاً کلکتہ مدراس اور بمبئی وغیرہ) سنڈیکیٹ ہی کہتے ہیں اور بعض یونیورسٹیوں (مثلاً علی گڑھ ، دہلی ، بنارس وغیرہ) میں اسی کا نام اکزکٹو کونسل ہے ، اس زمانہ میں سنڈیکیٹ کے ممبروں کی تعداد سولہ تھی، ساتھ ہی نواب صاحب نے ٹرسٹیوں کی تعداد میں اضافہ کرایا اور مقامی ٹرسٹیوں کو بھی کالج کے کاروبار میں عملی حصّہ لینے کے مواقع فراہم کیے۔

طلبا کو جو مالی امداد ان کے افلاس کے باعث دی جاتی تھی۔ نواب صاحب نے تجویز کی کہ اب یہ امداد قرض حسنہ کی شکل میں دی جائے۔ کالج میں پہلے طلبا کے علاج کے لیے ایلوپیتھک طریقۂ علاج کا انتظام تھا۔ اب نواب صاحب نے یونانی مطب کا بھی انتظام کیا۔ لیکن ساتھ ہی انگریزی طریقۂ علاج کو بھی ترقی دی کالج میں کوئی فیلوشپ نہیں تھا۔ نواب صاحب نے اسے قائم کیا۔

<u>دینیات کے لیے وظیفہ</u> کالج میں دینیات کی تعلیم کا جو نظام قائم تھا وہ ناکافی تھا۔ اور نواب صاحب اس سے مطمئن نہیں تھے۔ اس تعلیم سے زیادہ دینی مسائل سے کچھ شد بد ہو جاتی تھی۔ حالانکہ مسلمانوں کی ایک اہم ضرورت یہ بھی تھی کہ انگریزی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اشخاص اعلیٰ درجہ کی مذہبی اور دینی تعلیم بھی براہ راست عربی کے ذریعہ حاصل کریں۔

نواب صاحب اس ضرورت کو شدّت سے محسوس کرتے تھے اس لیے انھوں نے تجویز کی کہ کسی گریجویٹ کو جو مذہبی تعلیم حاصل کرنے کا ذوق رکھتا ہو اس کو کالج سے تین برس کے لیے پچاس روپیہ ماہوار وظیفہ دے کر دیوبند بھیجا جائے۔ یہ تجویز منظور ہو گئی۔ اور اس سلسلہ میں ایک گریجویٹ جس کا نام مشہور زمانہ تھا اس وظیفہ کے ساتھ دیوبند بھیجا گیا لیکن یہ تجربہ نہایت ناگوار اور سخت تلخ ثابت ہوا۔ یہ شخص انگریزوں کا باقاعدہ ملازم ہو کر دیوبند اور خاص طور پر شیخ الہند مولانا محمود حسن رح پر جاسوس مقرر ہو گیا اور شیخ الہند کی تحریک کی مخبری کرتا رہا۔ چنانچہ شیخ الہند اور ان کے رفقاء کی گرفتاری اس کی ہی جاسوسی اور مخبری کا نتیجہ تھی آخر اس تجویز کو ختم ہونا پڑا۔

دینیات کی تعلیم کی اصلاح خود کالج میں دینیات کی تعلیم کا جو بندوبست تھا۔ اس میں انہوں نے یہ اصلاح کی کہ اس کو ہر ایک کے لیے لازمی اور اس کے امتحان میں کامیابی کو ضروری قرار دے دیا اور لیکن واقعہ یہ ہے کہ کالج میں دینیات کی تعلیم کا نظام چلا آرہا تھا نواب صاحب اس سے بالکل مطمئن نہ تھے اور چونکہ وہ راست باز انسان تھے اس لیے مسلمانوں کو طفل تسلی دینے کی غرض سے اصل حقیقت کو پبلک سے چھپاتے نہیں تھے۔ چنانچہ ۲۰ اپریل ۱۹۱۰ء کے علی گڑھ انسٹیٹوٹ گزٹ میں دینیات کے نصاب تعلیم پر بحث کرتے ہوئے انھوں نے لکھا:۔

"درحقیقت میں خود اپنے آپ کالج کی مذہبی تعلیم و تربیت کی طرف سے ابھی تک مطمئن نہیں ہوں اور موجودہ حالت میں اس پر اطمینان ظاہر کرنا پبلک کو دھوکا دینا ہے میں مقر ہوں کہ نصابِ تعلیم دینیاتِ کالج کافی نہیں ہے۔ اور بہت کچھ ناکافی ہے"

جیسا کہ ہم نے پہلے بھی لکھا ہے نصابِ دینیات کی اصلاح تو اس لیے نہ ہو سکی کہ علماء نے اس سے دلچسپی نہیں لی۔ اور جنھوں نے دلچسپی لی بھی تو ان کے نزدیک

دینیات کی تعلیم کے لیے راہ نجات یا مالا بدمنہ پڑھا دینا کافی تھا البتہ نواب صاحب نے طلباء میں تقریروں کے ذریعے اس امر کی پوری کوشش کی کہ طلبا انگریزی تعلیم کے ساتھ عقیدہ اور عمل کے اعتبار سے پکّے اور سچّے مسلمان ہوں۔

اس موقع پر صرف ایک تقریر کا اقتباس یہ دکھانے کے لیے کافی ہوگا کہ وہ جب اس موضوع پر طلباء سے خطاب کرتے تھے تو کس جوش و خروش اور دل کے سوز و گداز کے ساتھ کرتے تھے۔ فرماتے ہیں:۔

"میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ آپ کی توجہ امور دینی کی طرف مائل کروں میں کسی شخص سے نہیں کہتا۔ بلکہ یہ چاہتا ہوں کہ آپ میں ہر ایک اپنے کو مخاطب سمجھے میں یہ جانتا ہوں کہ آپ میں سے ایک معقول تعداد روزہ نماز کی پابند ہے، اور امید کرتا ہوں کہ آپ ایسے ہی ہوں گے۔ لیکن یہ معلوم کرکے مجھے افسوس ہوا ہے کچھ لوگ مسجد میں شریک نماز نہیں ہوتے۔ حقیقت میں یہ بات قابل افسوس ہے...... یہ زمانہ آپ کی تحصیل کا ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے کہ آپ اس آیندہ وقت کے لیے تیار ہوں۔ کوشش کیجیے اور سخت کوشش کہ آپ مسلمانوں کے لیے اعلیٰ درجہ کا نمونہ ہوں وہ روش اختیار کیجیے، ایسے پاک وصاف مذہبی طریقے پر چلیے کہ مسلمان آپ پر پورا بھروسہ رکھیں، حقیقت میں آپ کسی طرح قومی لیڈر نہیں ہو سکتے اگر آپ اسلامی شعائر کے پابند نہیں ہیں، یہ لال لال ٹوپیاں، یہ کالے کالے کوٹ، پبلک جلسوں میں اور کانفرنس کے پنڈال میں تو بہت دکھائی دیں، اور کس قدر جائے افسوس ہے کہ ان کی تعداد مسجد میں کم ہو، الغرض! اگی پکار تو بہت ہے لیکن سب سے مقدم جو فرض مسجد کا ہے، وہی نہیں ہوا تو سب ہیچ ہے۔

(ص ۵۲۶)

چوں کہ نواب صاحب نماز باجماعت کی تاکید کرتے تھے اور سب طلباء کو یونیورسٹی مسجد میں پانچوں وقت حاضر ہونا مشکل تھا۔ اس لیے انھوں نے ہر ہوسٹل میں ایک کمرہ نماز کے لیے مخصوص کر دیا اور اس کے لیے ایک امام اور ایک موذن کے تقرر کی منظوری بھی دے دی۔ چنانچہ یہ نظام اس وقت سے اب تک برابر چلا آرہا ہے۔ اور ہالوں کی مزید تعمیر اور ان میں وسعت

کے ساتھ اماموں اور موذنوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔

علاوہ ازیں نواب صاحب نے کالج کی عمارتوں میں بہت اہم اور قابلِ قدر اضافہ
کیا۔ کالج کی مالی حالت بھی مستحکم بنائی۔ کالج کو مسلم یونیورسٹی بنانے کی تحریک شروع ہو چکی
تھی۔ اس سلسلہ میں نواب صاحب نے اپنی سعی اور جد و جہد سے چھبیس لاکھ
روپے جمع کیے۔ اس زمانہ کے حالات کو پیشِ نظر رکھا جائے تو دو تین برس کی مدّت میں
ہی اس قدر خطیر رقم جمع کر لینا جہاں ایک طرف نواب صاحب کی غیر معمولی تگ و دو اور
کاوش کی دلیل ہے۔ اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ مسلمانوں کو کالج سے کس درجہ تعلقِ خاطر تھا اور
وہ کس طرح کالج کو جلد یونیورسٹی کی شکل میں دیکھنے کے لیے بے قرار تھے۔

نواب صاحب نے جب کالج کے سکریٹری کا عہدہ سنبھالا تھا ان کی عمر ۶۷ برس کی تھی اور
اس میں کم و بیش پچاس برس انھوں نے بڑی محنت اور شدید مصروفیت میں بسر کیے تھے۔ اب
ضرورت تھی کہ وہ آرام کرتے اور حیاتِ مستعار کے باقی دن اپنے وطن میں
راحت و سکون سے گذارتے۔ لیکن قدرت نے ان کے دل میں قوم کی خدمت کا
جو والہانہ جذبہ ودیعت کیا تھا۔ اس نے ان کو چین نہ لینے دیا۔ چنانچہ جب یہ
عظیم ذمہ داری ان کے سپرد کی گئی تو انہوں نے اس کا حق مستعد نوجوانوں کی طرح
ادا کیا۔ لیکن عمر تو بہر حال ضعیفی اور انحطاط کی ہی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صحت
نے جواب دے دیا۔ ادہر نواب صاحب کے ابتدائی تقرر کی مدت سنہ ۱۹۱۰ء کے
وسط میں ختم ہو رہی تھی۔ اس لیے انھوں نے اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش
ہو جانے کی بڑی کوشش کی اور مدت کے ختم ہونے سے پہلے ہی استعفا دے دیا۔
لیکن نواب صاحب نے کالج کی جو نہایت عظیم الشان خدمات انجام دی تھیں
ان کی وجہ سے صورتِ حال یہ قائم ہو گئی کہ نواب صاحب غلبہ مرض، اضمحلال
ضعیفی کی ترقی کے باعث بار بار استعفا پیش کرتے تھے اور ٹرسٹی صاحبان

اسے ردکردیتے تھے۔ یہ سلسلہ دو برس تک چلتا رہا۔ آخر ۱۹۱۲ء کے ماہ جولائی میں نواب صاحب نے جواب ۷۳ برس کے تھے۔ صحت کی نادرستگی اور افراطِ ضعف سے سخت مجبور ہوکر جب پھر استعفا پیش کیا تو ٹرسٹیوں کو بادل نخواستہ منظور کرنا ہی پڑا۔ اس موقع پر ٹرسٹی حضرات نے اپنی مجلس میں بصورتِ تجاویز اور اخبارات نے مضامین اور افتتاحیوں میں اور زعمائے ملک و قوم نے خطوط اور ٹیلیگراموں کے ذریعہ نواب صاحب کی ذات اور کالج کی خدمات کے بارہ میں جن عمیق احساسات و جذبات کا اظہار کمال خلوص و محبت کی زبان میں کیا ہے اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ علی گڑھ کالج کو اس کے واقعی مقاصد کا ایک زندہ اور عملی پیکر بنانے کا سہرا نواب وقارالملک کے سر ہے۔ مرحوم کے عہد سے پہلے بھی یہ مقاصد تھے۔ لیکن مصلحت پسندی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے عزائم تھے لیکن اندیشۂ سود وزیاں کے حصار میں بند، جذبات واحساسات شبنم آلود تھے۔ اور یقینِ محکم عملِ پیہم سے ہم کنار نہ تھا۔ چنانچہ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی لکھتے ہیں:۔ مثلاً "پہلے رمضان المبارک میں بے تکلف "ڈائننگ ہال گرم ہوتا تھا"

نواب صاحب علی گڑھ کالج کی تاریخ میں پہلے شخص ہیں جنھوں نے کالج کے مقاصد کو رفعتِ پروازدی۔ عزائم میں آزادی کی رُوح پیدا کی اور ایمان و عمل کو باہم گرہم کنار و ہم قریں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اب مسلمانوں کا مذہبی طبقہ بھی کالج کی طرف کشش محسوس کرنے لگا۔ وقارِ حیات کے مصنف نے نواب صاحب کے عہد پر تبصرہ کرتے لکھا ہے۔

"جب انہوں نے کالج کا کام اپنے ہاتھ میں لیا تو کالج بھی ان کی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ دفعتہً پبلک کا اعتماد کالج پر بڑھ گیا۔ اس کے علاوہ لوگوں کو یہ حسنِ ظن بھی پیدا ہوا کہ ان کی (نواب صاحب) توجہ سے طلباء کی مذہبی اور اخلاقی حالت کی اصلاح ہوگی۔ چنانچہ ایسا ہی

ہوا، انھوں نے نماز کا خاص انتظام کیا۔ مذہبی تعلیم و تربیت پر پوری توجہ کی، اخلاقی نگرانی کا بندوبست کیا۔ مختلف اوقات میں علماء کو وعظ کے لیے بلایا۔ ایک عالم کا مستقل تقرّر کیا۔ اس کے علاوہ پرائیویٹ ملاقاتوں میں ہمیشہ طلبار کو مفید نصائح کرتے رہے، انھوں نے طلبہ میں ایک قسم کا قومی اور مذہبی احساس پیدا کیا، اور اسلامی جذبات کو نشو ونما کا موقع دیا۔ چنانچہ جنگِ طرابلس و بلقان کے موقع پر طلبہ نے جس مذہبی جوش اور ایثار کا اظہار کیا وہ انہیں کے فیضِ تربیت کا کرشمہ تھا۔ ان حالات نے علما کو بھی کالج کی طرف متوجہ کیا اور علما کی وجہ سے مسلمان بھی متوجہ ہوئے جن پر علما کا خاص اثر تھا۔ سرسیّد کے زمانہ میں ان کی صلابتِ مزاج اور مذہبی آزادی کی وجہ سے مذہبی گروہ کالج سے بیزار تھا اور عوام بے تعلق۔ اس لیے سرسیّد کا تمام زمانہ مخالفت اور کشمکش میں گذرا۔ نواب محسن الملک کا زمانہ البتہ پُرسکون تھا۔ وہ ایک نرم مزاج، مروت پسند، صلح جو، طبیعت کے شخص تھے۔ ان کی خوش تدبیری، جادو نگاری۔ اور سحر بیانی نے مخالفت کے جوش کو بہت کچھ سرد کردیا۔ لیکن مذہبی گروہ پھر بھی پہلو تہی کرتا رہا۔ اور عام مسلمان بھی عملاً متوجہ نہیں ہوئے۔ لیکن نواب وقار الملک کی مذہبی زندگی اور اسلامی معاشرت نے علما کو بھی اپنا گرویدہ بنالیا اور عام مسلمانوں نے سرسیّد کی اس تعلیمی تحریک میں عملی حصّہ لیا۔ چنانچہ جب مسلم یونیورسٹی کی تحریک شروع ہوئی تو کوئی مخالف آواز بلند نہیں ہوئی۔ مسلمانوں کے ہر طبقہ نے اس کا خیر مقدم کیا۔ علماء نے اس کی تائید کی۔ اور مجلس ندوۃ العلماء نے تو مالی اعانت سے بھی دریغ نہیں کیا

اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ان کے عہد میں کیسی زبردست تبدیلی پیدا ہوگئی تھی۔ یہ سب کامیابی درحقیقت ان کی زبردست شخصیت کا نتیجہ تھی اور ان کی شخصیت کو مذہبی روح نے بلند کردیا تھا۔" (ص۔ ۳۔ ۵۵۲)

اقتباس اگرچہ طویل ہوگیا۔ لیکن سرسید، نواب محسن الملک اور نواب وقارالملک ان تینوں کے عہد کے علی گڑھ کالج پر اس سے بہتر تقابلی تبصرہ نہیں ہوسکتا۔ اس سے معلوم ہوگا کہ علی گڑھ کالج (اور اب مسلم یونیورسٹی) کو جب ہم مسلمانانِ ہند کا تہذیبی ورثہ کہتے ہیں تو اس سے مراد کالج کی وہ ہیئت ہے جس کا خاکہ سرسید نے بنایا، اس میں آب و رنگ نواب محسن الملک نے بھرا۔ اور اس میں استحکام و استواری نواب وقارالملک نے پیدا کی۔

رسولِ شاہدؐ و مشہود

(۵)

(از جناب قاری بشیر الدین صاحب پنڈت ایم اے)

(حضرت زردشت کی پیشین گوئی (۱)

اِس پیشین گوئی کا ہر ہر لفظ بجز آنحضرتؐ کے اور کسی نبی پر صادق نہیں آتا۔ آپ کا فاتح جہان ہونا اس سلوک سے ظاہر ہے جو فتح مکّہ کے وقت کفارِ مکّہ کے ساتھ کیا گیا کہ اپنے خونخوار دشمنوں کو لاتثریب علیکم کہہ کر چھوڑ دیا۔ انبیاءؑ کرام میں محمد ہونے کی فضیلت صرف آپؐ کو حاصل ہے اور رحمت للعالمین یعنی تمام جہان کے لیے رحمت ہونا آپؐ کے پیام سے ظاہر ہے جبکہ بیشتر انبیاءؑ صرف اپنی اپنی قوم کے لیے رحمت تھے۔ آپ نے تمام انبیاءؑ کی تصدیق فرما کر ان کی مختلف قوموں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیا اس لیے آپ حاشر ہیں۔ بت پرستوں اور یزداں پرستوں کی اصلاح کرنا صرف آنحضورؐ کی خصوصیت ہے۔ غرضیکہ پیشین گوئی کی پانچوں نشانیاں صرف آنحضورؐ سے متعلق ہیں۔ اس میں لفظ "استوتریہ" نے اس پیشین گوئی کو اور بھی زیادہ ممتاز بنا دیا۔ جس کے معنی ہیں استتی یا تعریف کیا گیا (محمدؐ) یہ ژندی زبان کا لفظ ہے جو پہلوی یا فارسی زبان کے بجائے سنسکرت سے زیادہ قریب ہے۔ ژندی و سنسکرت دونوں میں اس کا مشترک مادہ ہے — "استو" بمعنی تعریف کیا گیا۔

اتھروید کی ایک پیشین گوئی میں اس کی مزید تصریح ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) آنحضورؐ اور صحابۂ کرامؓ کے متعلق پیشین گوئیاں :- (ا) پیشین گوئی کے اصل الفاظ کا ترجمہ ہے "ہم اس کی تعظیم کرتے ہیں جو نیک، طاقتور، مہربان (مسلمان) نفوس ہیں جو مقدس

زرتشت کے اصول کی حفاظت کرتے ہیں جو اپنے بادشاہ کے داہنے ہاتھ لڑتے ہیں" (فروردین یشت آیت ۶۳)

(ب) مقابلہ کرنے کا نقشہ ان الفاظ میں پیش کیا " وہ اس کی طرف اڑتے ہوئے آتے ہیں گویا وہ تیز رفتار پرند ہیں وہ میدانِ جنگ میں ایک ہتھیار اور ڈھال کی مانند آتے ہیں۔ اس کو اپنے پیچھے اور اپنے آگے رکھ کر حفاظت کرتے ہیں۔ نظر سے پوشیدہ دشمن، نکتے مخالف سے، بدکار، شرارت پر تلے نہایت خطرناک ابولہب سے اُسے بچاتے ہیں۔ ایسا ہوگا گویا کہ ہزار آدمی ایک آدمی کی حفاظت کر رہے ہیں پس نہ عمدگی سے چلائی ہوئی تلوار، اور نہ خوب پھینکا ہوا تیر اور نہ زور سے چلائی گئی برچھی اور نہ ہاتھ سے پھینکا ہوا پتھر اسے ہلاک کر سکے گا۔" (فروردین یشت آیت ۷۱)

جناب زرتشت کی ان پیشین گوئیوں میں زرتشتی تعلیم کی حفاظت اور صحابہ کرامؓ کی جان نثاری کا نقشہ ہو بہو کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ زرتشتی تعلیم کی حفاظت کرنے کا بیان پچھلے صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ صحابہ کرامؓ کا آنحضورؐ کے گرد اپنی جانوں کا زندہ قلعہ بنا لینا تو تاریخی واقعات ہیں جن سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

(ج) خدا تعالیٰ کی بات کو جناب زرتشت اِن الفاظ میں دہراتے ہیں " ایمانداروں میں اے زرتشت! نہایت زبردست ان لوگوں کے نفوس ہیں جو حاملانِ شرعِ قدیم ہیں یا ان مومنین کے نفوس جو ابھی پیدا نہیں ہوئے جو دنیا کو ازسرِنو زندگی بخشنے والے ہیں" (فروردین یشت ۱۷)

اِس پیشین گوئی کا مفہوم نہایت صاف ہے کہ اے زرتشت جس طرح تیرے پیرو تیری شریعت پر چل کر بلند مراتب کے مستحق ہیں اسی طرح آئندہ زمانہ میں ایک جماعت پیدا ہوگی جو دنیا کی اقوام اور مذاہب کو ازسرِنو زندگی بخشے گی اور اس پر اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ کا اطلاق ہوگا۔

(د) اِس پیشین گوئی میں زمانہ آئندہ کے مومنین (صحابہ کرامؓ) کی مزید نشانیاں بیان کی گئیں۔ بتایا گیا " اس کے اصحاب ترقی کریں گے جو محمدؐ کے دوست ہیں۔ دشمنوں کے

قائل نیک اندیش۔ خوش گفتار۔ خوش کردار اور اعلیٰ شریعت کے پابند جن کی زبانوں نے کبھی ایک لفظ بھی جھوٹ نہیں بولا" (زمیاد لیشت - ۹۵)

اس پیشین گوئی میں آیۃ شریفہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ کی پوری تفسیر ہے۔ آنحضورؐ کے دس ہزار نفوس قدوسیہ کا ذکر بائبل و انجیل میں ہے، ویدوں میں ہے اور ژند اوستا میں بھی ہے درحقیقت کسی پیغمبر کی صداقت اور کامیابی کا سب سے بڑا معیار اس کے ساتھیوں کی قدوسیت اور تزکیہ ہے۔ اس لیے نہایت سنجیدگی کے ساتھ غور کیجئے کہ جس نے اپنے ہزاروں ساتھیوں کو صادق القول بنادیا وہ خود کتنا بڑا راستباز ہوگا؟ صلی اللہ علیہ وسلم۔

(۳) حضرت زرتشت کی مذکورۂ بالا پانچوں پیشین گوئیاں نہایت اہم ہیں لیکن اہم ترین ایک اور ہے اس پر ٹھنڈے دل سے غور کیجئے۔ جناب زرتشت نے فرمایا "تو اس خانہ میں جلتی رہ۔ تو اس گھر میں ہمیشہ جلتی رہ۔ تو اس آتشکدہ میں شعلہ زن رہ۔ تو اس میں ترقی کر ایک مدت تک کے لیے نہایت زبردست اصلاح دنیا کے عہد تک۔ نیکی کے قیام اور زبردست انقلاب دنیا تک" (آتش نیائش۔ آیۃ ۹ بحوالہ میثاق النبیین ص۳۱)

اس آیۃ میں جناب زرتشت نے ایک مدت معینہ تک کے لیے آگ جلانے کا حکم دیا ہے یہاں تک کہ وہ آتشی شریعت والا موعود اور زبردست انقلاب مذہبی کا پیغمبر آجائے۔ اور جب وہ آجائے تو زرتشتی شریعت منسوخ ہوجائے گی۔ زرتشتی مذہب کی عبادت درحقیقت آگ جلاکر خدا کی عبادت کرنا تھا جس سے تمثیلاً یہ عہد اور اقرار لینا مراد تھا کہ وہ الٰہی شریعت اور ہدایت کی روشنی میں ہمیشہ جلتے رہیں گے۔ چناں چہ خود جناب زرتشت نے اس نکتہ کی ان الفاظ میں وضاحت فرمائی "میں تمہیں جو اس جگہ جمع ہوئے ہیں حکیم مطلق کی حکمت کی باتوں کو بتاتا ہوں۔ خدا کی حمد اور اس کی ثنا کو۔ نیک نفوس کے نغمات کو جو اعلیٰ صداقت کے حامل ہیں۔ اس صداقت میں مقدس شعلوں سے بلند اٹھتے ہوئے دیکھتا ہوں

تم حقیقت کی رُوح کو غور سے سنو۔ آگ کے شعلوں پہ نہایت پاک دل سے تدبّر کرو۔"

(راہو تواتی گاتھا یشت ۳۰ آیۃ اور ۲)

حضرت زرتشت کے اس حکیمانہ قول سے ظاہر ہے کہ آتشکدہ کی آگ تمثیلی رنگ میں شریعت کی پُرحکمت باتوں پہ چلنے اور ان پر غور و تدبر کرنے کا ایک اقرار اور عہد تھی کہ ہم شریعت کی روشنی میں ہمیشہ چلتے رہیں گے لیکن زرتشتی اس عہد کو بھول گئے اور رسمی و رواجی آتش پرستی پر اتر آئے۔ غرضیکہ جناب زرتشت نے ایران میں جو رُوحانی روشنی کی آگ جلائی تھی اس کے سرد ہو جانے پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ ایک آتشیں شریعت روشن کی قرآن کریم کی آیۃ مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا کے ماتحت حضور ؐ نے فرمایا مثلی کمثل رجل "(استوقد نارا) (بخاری) یعنی "میری مثال اس شخص (زرتشت) کی مثال ہے کہ اس نے آگ جلائی" یہ ارشاد گرامی مذکورہ بالا پیشین گوئی کے سمجھنے کے لیے کافی ہے۔

دساتیر میں آنحضور ؐ کے متعلق پیشین گوئی :- زرتشتی قوم دو فرقوں میں بٹی ہوئی ہے ایک فرقہ اگر ژند و استا کو مستند سمجھتا ہے تو دوسرا "دساتیر" کو تاہم دونوں فرقے اس بات کو ملتے ہیں کہ ایک موعود نبی اہلِ عرب میں ہوگا اس کا نام محمد ؐ ۔ وہ رحمتہ للعالمین ہوگا اس کا قانون زرتشتی قانون کا مصدِّق ہوگا۔ اس کے اصحاب نیک اور صادق ہوں گے ..... وہ بت پرستوں اور زرتشتیوں دونوں کی اصلاح کرے گا وغیرہ وغیرہ۔ مذکورۂ بالا تمام پیشین گوئیاں ژند و استا کے حوالے تھیں اب ایک نظر دساتیر پر ڈالئے تاکہ دوسرے فرقہ کو بھی دعوت غور و فکر دی جا سکے۔

موجودہ دساتیر میں مہ آباد کے نامہ سے لے کر ساسانِ پنجم کے نامہ تک ۱۵ نامے ہیں ان میں سے ساسانِ اوّل کا نامہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہے اس لیے کہ مندرجہ ذیل پیشین گوئی حضرت ساسان کی ہے جو ان کو جناب زرتشت سے پہنچی ہے انھوں نے دینِ زرتشت کی تجدید کا کام انجام دیا ہے۔ یہ پیشین گوئی پہلوی زبان میں ہے اس کے فوٹو بلاک کے ساتھ انہیں

جلد اوّل کے صفحہ ۲۲ کے مقابل دیکھا جا سکتا ہے۔ اصل عبارت معہ اُردو ترجمہ مندرجہ ذیل ہے:۔

(۱) بزبانِ پہلوی:۔ چم ، پچیم ، کا جام ، کمند ، ہرتوار جیارم ، ور تاہ

(۲) بزبان اردو:۔ جب ، ایسے ، کام ، کریں گے (ایرانی) عربوں میں سے ، ایک شخص

ہیتال ہود = ۵۵

پیدا ہو گا ، آیتہ ۵۵

(۱) یو ہزار تسام ، ہو ، ہیرتاک ، نیرتاک و سمیراک

(۲) کہ پیروؤں سے ، اس کے ، تاج اور تخت اور سلطنت

و امیراک ، سرویم ، ارتد - ۵۶

اور شریعت (ایرانی) کلیتاً ، درہم برہم ہو جائیں گے - ۵۶

(۱) و ہوند ، ہرورکام ، تیودام - ۵۷

(۲) اور ہونگے ، سرکش لوگ ، مغلوب - ۵۷

(۱) بیرن ، زشائی ، تیمار ، ویسپار ، کسوار ، آباد ، بے جوار

(۲) دیکھیں گے ، بجائے ، بتکدہ ، اور آتشکدہ ، عبادت خانہ ابراہیم ، بتوں سے خالی

ہرہ ، تیوستا ، - ۵۸

ہو کر ، قبلہ ، - ۵۸

مذکورۂ بالا تینوں آیات کی تشریح حضرت ساسان نے اپنی زبان میں کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ ریگ زار عرب میں جو ابراہیم کا بنا کردہ خانہ ہے اس میں ستاروں کے بت رکھ دیے گئے تھے اسی کی طرف منہ کر کے وہ نماز پڑھیں گے اور ان سے بت اٹھا دیں گے۔ پیشین گوئی کی آخری دو آیات یہ ہے:۔

(۱) ہو جود ، ہوش شنشور = ۵۹

(۲) اللہ ہولگند ، رحمۃ للعالمین = آیات ۵۹

(۱) د تد راہند ، شائی ہا ، سیارام ، مدیر ،
(۲) اور پھر لیں گے ، جگہیں ، آتشکدوں کی ، مدائن کی ،
(۱) و انتورام ، ہام ، د نیفود ، و نیواک ،
(۲) اور اردگرد ، اس کے کی ، اور طوس ، اور بلخ ،
(۱) و شایام ، شمناد ، ۔ ۶۰
(۲) اور مقامات ، بزرگ ، آیۃ ۶۰
(۱) و ہائیم ، ہشیام ، ورتاہ ، پاہد ، ہرتال ، و سیں ہوئ
(۲) اور شارع ، ان کا ، مرد ، ہوگا ، سخنور ، اور کلام اس کا ،
(۱) دم ہمن بلنز یدہ = ۶۱
(۲) باہم ربط رکھنے والا = آیۃ ۶۱

پیشین گوئی کی ان ساتوں آیات پر غور کیجئے ۔ آنحضور کے متعلق کتنے واضح نشانات کی نشان دہی کی گئی ہے ۔ (۱) زرتشتیوں کے گمراہ ہونے پر مصلح (موعود نبی) کا عرب سے ہونا (۲) اس سے معتقدین کی کامیابی وکشور کشائی ۔ (۳) ایران جیسی زبردست اور سرکش طاقت کا بادیہ نشین عرب قوم کے ہاتھوں مغلوب ہوجانا (۴) خانہ ابراہیم (کعبہ) کی طرف منہ کرکے نماز پڑھنا (۵) خانہ کعبہ بلکہ ملک عرب کو بتوں سے پاک کرنا ۔ (۶) آپ کا رحمۃ للعالمین ہونا (۷) آپ کے کلام کا معجزانہ انداز اور بلیغ ہوتا (۸) طوس ، بلخ ، مدائن اور دوسرے مشہور شہروں کو مسخر کرنا وغیرہ وغیرہ ۔

بہرحال ژند اوستا اور دساتیر میں دی ہوئی بشارتوں پر ہمارے پارسی بھائیوں کو نہایت سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا چاہئے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کرنا چاہئے کہ ان بشارتوں میں دی ہوئی نشانیوں کے مصداق بجز آنحضور کے اور کون ہوسکتے ہیں؟ افسوس کے ساتھ عرض کرنا پڑتا ہے کہ آجکل مذہب کے بارے میں لوگوں کا عجب

اس قدر شدید ہوگیا ہے کہ صاف اور سیدھی بات کے قبول کرنے میں بھی کمزور اور لاطائل عذر تلاش کئے جاتے ہیں۔

بزرگو اور دوستو! اب لاطائل عذرات سے کام نہیں چلے گا۔ ہم میں سے ہر شخص اس بات کو بخوبی جانتا ہے کہ ہمارا یہ زمانہ سائنس اور ٹکنالوجی کا عہد ہے۔ ان کی غیر معمولی ترقی نے عالمِ آب وگِل کو طلسم کدۂ ایجادات و اختراعات بنا دیا ہے۔ لیکن اس ترقی کا سب سے زیادہ افسوسناک اور تشویش انگیز پہلو یہ ہے کہ انسان قلب و روح کے سکون و اطمینان کی نعمت و دولت سے محروم ہوگیا ہے کیونکہ سائنس اور ٹکنالوجی کی غیر معمولی پیش رفت نے ایک طرف انسان کے ہاتھوں میں وہ محشر انگیز اسلحہ دیدیئے ہیں جو کروڑوں انسانوں کی آبادی کو چشم زدن میں سیاہ کرسکتے ہیں اور دوسری جانب اس نے اقوامِ عالم میں باہمی رقیبانہ کشمکش، ہوسِ اقتدار و تغلب، خود غرضی، مطلب پرستی اور استحصال بالجبر کے جذبات کو برافروختہ کرکے انسان کو زندگی کے اقدارِ عالیہ سے بہت دور کردیا ہے۔ ان سب کا مجموعی اثر یہ ہے کہ ایٹمی جنگ کا خطرہ ہر وقت انسان کے دل و دماغ پر مسلط ہے اور اس کے باعث امن و سکون ایک جنس نایاب بن کر رہ گئے ہیں۔

اس صورتِ حال پر جو مفکرینِ عالم غور کررہے ہیں وہ اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ دنیا میں امن و سکون نہ سیاسی اور فوجی توازن برقرار رکھنے سے حاصل ہو سکتا ہے اور نہ عدل و انصاف اور مساواتِ حقوقِ انسانی کا وعظ کہنے سے، بلکہ اگر وہ قائم ہو سکتا ہے تو صرف مذاہبِ عالم کی متفقہ جہد و سعی سے اس لئے کہ آج سیاسیات و معاشیات اور سماجیات پر مشتمل ہیں لیکن لوگ جب بار بار مذہب کی صف میں شامل نہیں ہیں۔ اس بنا پر ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کے دل و دماغ کو بدلا جائے اور ان کی اصلاح کی جائے اور یہ کام سوائے مذہب کے اور کوئی طاقت نہیں کرسکتی۔ اور وہ مذہب بحمد اللہ "مذہب اسلام" ہے اور

اس کا ماننے والا " مسلمان " یا بالفاظ دیگر یعنی الاقوامی انسان ہے۔ جو لوگ مادی ترقی کے لیے سائنس کو اساس مان کر اور توحید و رسالت نیز معاد کا انکار کرکے زندگی کی تعمیر کرتے ہیں اور سطح بینی کی وجہ سے کہتے ہیں کہ ہمارا کوئی خالق و مالک نہیں اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج نئی تہذیب خاردار پودوں کی طرح سطح زمین پر پھیل چکی ہے اور اس کے کڑوے کسیلے پھل اپنا اثر دکھلا رہے ہیں۔ انگلینڈ کے ایک رسالے " دی پلین ٹرتھ " (THE PLAIN TRUTH) کی دسمبر ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں آر۔ ای۔ میکنیر (R.E. MSCHAIR) کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے۔ لکھتا ہے کہ " تاریخ عالم میں کبھی نوجوان نسل اتنی بڑی تعداد میں کاہلی، بے چینی، مایوسی، اور بغاوت کے جذبات کا شکار نہیں ہوئی تھی جیسا کہ آج دیکھا جا رہا ہے آج کی مادہ پرست سائنسی نسل کو نہ تو اس بات کا ہوش ہے کہ وہ کس چیز کے خلاف بغاوت کر رہی ہے اور نہ وہ یہ جانتی ہے کہ اسے کیا کرنا چاہیئے " ہپیوں کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا کہ " وہ دنیا کی ہر چیز کے مخالف ہیں، ہر شے سے ناراض ہیں، ہر اصول سے برگشتہ ہیں، ہر اخلاق سے منحرف ہیں اور ہر قانون سے بغاوت پر آمادہ ہیں۔ وہ خاندان سے، دولت سے، سماجی نظام سے، غرض ہر چیز سے مایوس بھی ہیں اور بیزار بھی "

بزرگو دوستو! اکتوبر ۱۹۷۰ء جاپان کے مشہور شہر کیوٹو میں ایک نہایت عظیم الشان " مذہبی عالمی کانفرنس " منعقد ہوئی تھی اس میں امریکہ کے (WORLD COUNSIL OF CHURCHES) " ورلڈ کونسل آف چرچیز " کے سکریٹری جنرل جناب ڈاکٹر یوجین۔ کارسن بلیک نے اظہار خیال فرماتے ہوئے کہا " میرا یہ پختہ عقیدہ ہے کہ " مذہب " سائنسی ترقی کا مخالف نہیں لیکن یہ بات ہمیشہ یاد رکھنے کی ہے کہ " ترقی انسان کے لئے ہے اور انسان ترقی کے لیے نہیں " اس لیے مذہبی و روحانی اقدار کو کسی مرحلے اور کسی منزل میں کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا " ترقی " کوئی بھی ہو بہر حال کسی نظریہ اور کسی فکر کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اگر یہ روحانی مذہبی اقدار نہیں ہوں گے تو وہ اقدار ہوں گے جن کو موجودہ عہد کی " فکری تحریکوں " مثلاً کمیونزم، سوشلزم

سائنٹیزم ، اور نیشنلزم وغیرہ نے جنم دیا ہے لیکن اس صورت میں ترقی کا رُخ غلط ہوگا اور وہ
نسان وانسانیت کے لیے موجب ہلاکت ہوگی اور اگر اس کے برخلاف ترقی کی اساس رُوحانی
. مذہبی اقدار ہوئے تو اس سے انسان کو انسانیت دونوں کو فائدہ ہوگا اس لیے ضرورت اس
ات کی ہے کہ ایسے لوگوں کی ایک جماعت ترتیب دی جائے کہ جو سائنس وٹکنالوجی کی اعلیٰ تعلیم سے
راستہ ہونے کے باوجود زندگی میں مادّہ پرستانہ نقطۂ نظر نہ رکھتی ہو"، تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو
رسالہ البرہان دہلی ۱۹۷۱ء ۱۹۷۲ء بالفاظ دیگر موصوف نے تمام سنجیدہ حضرات کو بالعموم اور " داعیانِ
من وسلامتی " یعنی اسلام کے نام لیواؤں کو بالخصوص دعوتِ غور وفکر دی ہے کہ وہ سائنس اور ٹکنالوجی
اپناکر کہ جس پر آج مادّہ پرستوں اور ملحدوں کا قبضہ ہے دنیا کو امن وسلامتی کا راستہ دکھائیں۔ یہ
سلمہ حقیقت ہے کہ " امن " اپنے اصلی معنی اور ماہیت کے اعتبار سے صرف جسمانی تحفظ اور فقدانِ
جنگ کا نام نہیں ہے اگرچہ ہے یہ بھی بہت ضروری لیکن یہ " امن " کا محدود اور یکطرفہ مفہوم ہے۔
راصل " امن " کے معنی ہیں ایک فرد کا ایک طرف اپنے خالق کے ساتھ اور دوسری جانب اپنے
بنائے جنس کے ساتھ ایسا تعلق اور ربط جو منفعت بخش اور موجبِ فلاح ہو۔ اس دائرے میں
ہ تمام تعلقات آجاتے ہیں جو ایک فرد کے دوسرے فرد کے ساتھ ۔ یا ایک قوم کے دوسری قوم کے ساتھ
ہوں ۔ پھر امن کسی خاص قسم کا نہیں بلکہ جسمانی ، ذہنی ، اخلاقی وروحانی غرضیکہ زندگی کے ہر شعبہ پر
ماوی ہو۔ اسلام اسی وسیع مفہوم میں " امن وسلامتی " کی ضمانت دیتا ہے جو توحید ورسالت پر
یمان اور یوم آخرت پر یقین رکھنے ہی سے حاصل ہوتا ہے ۔ قرآن پاک میں دی ہوئی آیات کو سامنے
ھ کر نہایت سنجیدگی کے ساتھ۔ لیکن تعصب کو بالائے طاق رکھ کر غور کیجیے کہ تزکیۂ نفس ، ضبطِ نفس ،
فضائل ورذائلِ اخلاق ، وحدتِ انسانیت ، وحدتِ دین ، اور قوم ووطن نیز رنگ ونسل کے امتیازات ،
ساد فی الارض ، اصلاح ذات البین اور حسن معاشرت وغیرہ کے متعلق اسلام کی تعلیمات کیا ہیں؟
ور وہ کس طرح ایک انسان میں انابت الی اللہ پیدا کرکے اس کو دنیا کا بہترین شہری واعلیٰ انسان
بنا دیتا ہے۔

بلاشبہ بنی نوعِ انسان پر مختلف طبقاتِ انسانی نے جو کچھ احسانات کئے ہیں وہ سب شکریہ کے لائق ہیں لیکن سب سے نمایاں جن بزرگوں کا احسان ہے وہ انبیاءِ کرام، دانشور اور روشن دماغوں کی جماعت ہے۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے وقت میں اپنی اپنی قوموں کے سامنے اپنے زمانۂ حال کے مناسب اخلاقِ عالیہ اور صفاتِ کاملہ کا درس دیا۔ کسی نے صبر کسی نے ایثار، کسی نے قربانی، کسی نے جوشِ توحید، کسی نے تسلیم و رضا اور کسی نے زہد و قناعت کا۔ حضرت نوحؑ کی زندگی کفر کے خلاف غیظ و غضب کا دلولہ پیش کرتی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی حیات جوشِ توحید کا منظر دکھاتی ہے۔ حضرت موسیٰؑ کی زندگی جنگ و جہاد اور شاہانہ نظم و نسق اور اجتماعی قوانین و دستور کی مثال پیش کرتی ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کی لائف عفو خاکساری، عفو و درگزر اور قناعت کی تعلیم دیتی ہے۔ حضرت ایوبؑ کی حیات صبر و شکر کا نمونہ ہے۔ حضرت یوسفؑ کی زندگی قید و بند میں بھی دعوتِ حق اور جوشِ تبلیغ کا سبق ہے۔ حضرت داؤدؑ کی سیرت حمد و ستائش اور دعا و زاری کا صحیفہ ہے۔ لیکن جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ کو دیکھو تو اس میں سب کی زندگیاں اور سیرتیں سمٹ کر سما گئی ہیں۔ ان تمام بزرگوں نے اپنی اپنی قوموں کی ہدایت کے لیے جو روشن منارے قائم کئے تھے اور جو امتدادِ زمانہ سے غبار آلود ہو چکے تھے۔ آنحضورؐ نے انھیں کیسے جلا بخشی اور اپنی عملی زندگی کا پورا اگا نٹریک ہمارے ہاتھوں میں دے کر کس طرح رہنمائی فرمائی؟ ان کی عالمگیر اور دائمی تعلیم کیا ہے؟ اقوامِ عالم کو ان کا بھولا ہوا سبق کس طرح یاد دلایا؟ اور ان پر ان کے کیا کیا احسانات ہیں؟ یہ تمام باتیں نہایت اہم اور غور طلب ہیں لیکن چوں کہ زیرِ بحث موضوع سے خارج ہیں۔ ان پر انشاءاللہ کسی مناسب موقع پر عرض داشت پیش کروں گا۔ اس وقت تو عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جس طرح توریت و زبور و انجیل نیز ژند و اوستا اور دساتیر نے بھی آخرالزماں کی آمد آمد کی خوشخبری سنائی اسی طرح ہند کی مقدس کتابوں نے بھی غرضیکہ انھیں صرف پچھم والوں نے ہی نہیں پہچانا بلکہ پورب والوں نے بھی پہچانا اور بڑی آن بان کے ساتھ پہچانا۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان واجب التعظیم بزرگوں یعنی رشیوں

نیوں کی بات کو شان سے شائع کر دیا گیا جس کے معقول وجوہ ہیں جو ابھی عرض کروں گا فی الحال تو بھدوستٗ
ے مصلح اعظم حضرت بودھ کی زندگی کا ایک واقعہ ضمناً سن لیجئے اس واقعہ کو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا
بلد چہارم کے صلٓ پر اور شری رادھا کمد مکرجی نے اپنی بیش قیمت تصنیف " ہندو سویلیزیشن "
ے صفحات ۲۵۹ اور ۲۶۰ پر کچھ اس طرح درج کیا ہے :-

" وہ (حضرت بودھ) اپنی عمر کے ۷۹ ویں برس راجگریہہ میں تھے وہاں سے نالندہ آئے
ں کے بعد پاٹلی گرام جہاں راجہ اجات شترو نے ان کا شاہانہ استقبال کیا اور دعائیں لیں۔ ان
، یادگار میں گوتم گیٹ اور گوتم گھاٹ بنوائے کہ جہاں سے دریائے گنگا کو عبور کرکے مہاتما
تم بدھ ویسالی، پاوا ہوتے ہوئے کسینر پہونچے۔ پاوا میں چند الہار نے ان کی دعوت
تھی جس میں نرم و گرم کھانے تھے جس کی وجہ سے معدہ خراب ہو گیا اور پیچش شروع ہو گئی۔
یٹ کا درد نا قابلِ برداشت تھا۔ بہرحال کسینر پہونچ کر مہاتما گوتم بدھ نے شال کے درختوں
ے جھنڈ کے نیچے اپنا بستر بچھوا دیا۔ آنندہ کو حکم دیا کہ سرہانا اتر کو رکھے۔ مقامی ملّ
یلد کو آمد کی اطلاع کی اور معتقدین سے بلا کر کہا " مجھے تم سے کچھ کہنا نہیں ہے۔ دنیا فانی
ے۔ اپنے نجات پانے کی فکر کرو " اپنے محبوب معتقد انندہ کو غمزدہ دیکھ کر تسلّی دیتے ہوئے
ا " نندہ! میں پہلا بودھ نہیں ہوں جو اس زمین پر آیا اور نہ ہی میں آخری بودھ ہوں ـــ
یک وقت پر ایک دوسرے بودھ اس دنیا میں آئیں گے ...... وہ ایک ایسی مذہبی
مدگی کا آغاز کریں گے جو سراسر مکمل اور بے داغ ہوگی ...... وہ " میتریہ " کے نام
ے موسوم ہوں گے (یعنی رحمت للعالمین ہوں گے) " (بحوالہ اخبار قومی جنگ رامپور مورخہ
مارچ ۱۹۱۹ء)

آنحضورؐ کا رحمت للعالمین ہونا کچھ چھپی ڈھکی بات نہیں ہے۔ قرآن پاک کی آیت
ریفہ وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ مصدق ہے ان تمام پیشین گوئیوں
ے حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، جناب زرتشت، مہاتما گوتم بودھ اور دیگر رشیوں اور

ملبیوں سے اپنے اپنے وقت پر صادر ہوئیں۔ جس طرح اللہ تبارکؐ تعالیٰ رب العلمین یعنی تمام دنیا کا پالن ہار ہے۔ اسی طرح اس کا محبوب رسول بھی رحمت للعالمین یعنی تمام دُنیا کے لیے رحمت ہے۔ کیا یہ تاریخی واقعہ نظر انداز کرنے کے قابل ہے کہ اس وقت جب کہ ایک شقیِ ازل حضرتِ خُباب رضؓ کو دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹا کر ان کے سینے پر اپنا پیر جمائے ہوئے کھڑا ہے۔ انھوں نے عرض کی کہ "آپ پر اور ہم جاں نثارانِ اسلام پر کفار کی طرف سے کتنے ناقابلِ برداشت مظالم ہو رہے ہیں۔ دنیا کی کوئی تعذیب و اذیت ہونے کو باقی نہیں رہی پھر آپ ان ظالموں کے لیے بد دعا کیوں نہیں کرتے۔" اتنا سُننا تھا کہ آپ کا چہرۂ انور غصہ سے سرخ ہو گیا اور فرمایا کہ :-

"میں دُنیا کے لیے زحمت نہیں بلکہ رحمت بن کر آیا ہوں۔ بددعا کے لیے نہیں بلکہ دعا کے لیے پیدا ہوا ہوں تم سے پہلے (اے خُبابؓ) وہ لوگ گذرے ہیں جن کے سروں پر آرے چلائے جاتے تھے اور دو برابر کے ٹکڑوں میں چیر ڈالے جاتے تھے پھر بھی وہ اپنے فرائض کی آدائیگی سے باز نہیں رہے۔ اللہ تعالیٰ اپنا کام (میرے ذریعے سے) پورا کر کے رہے گا تا آن کہ ایک شتر سوار صنعاء سے حضر موت تک یکہ و تنہا سفر کرے گا اور اس راہ میں اسے خدا کے سوا کسی کا خوف نہ ہوگا۔" (بخاری)

بہر حال جہاتما گوتم بدھ تو آخری دور کے بزرگ ہیں ان سے بھی پہلے اور بہت پہلے ان رشیوں منیوں کی بشارتوں پر غور کیجیے جو آنحضورؐ کے متعلق دیدوں، اُپ نشدوں، برہمنوں اور پرانوں وغیرہ میں باوجود تحریف کرنے کے اب تک محفوظ ہیں۔ عوام ان سے ناواقف رہے تو وہ زبان کے قیود و شرائط کی وجہ سے اور خواص لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ (سورۂ بقرہ) کے مصداق رہے یعنی حق کو چھپاتے ہیں اگرچہ جانتے ہیں۔ جہاں تک زبان کا تعلق ہے ظاہر ہے کہ تمام مذہبی کتابیں سنسکرت زبان میں ہیں جب کہ عوام کی زبان پراکرت تھی۔ سنسکرت کے مشہور فاضل میکسمولر نے اپنے لیکچروں میں کہیں لکھا ہے کہ ہند [illegible]

حرفت میں پیش قدمی نہیں کی البتہ زبان کے آراستہ کرنے میں پیچھے نہیں رہے۔ زبان کے قواعد میں ایسا مبالغہ اور زائد از ضرورت تصنع کیا اور اس سے اس کو ایسا بوجھل بنایا کہ وہ غریب بیٹھ رہی اور اپنے ہی بوجھوں دب کر مر گئی۔ یہی وجہ ہے کہ برہمنوں کے سوائے اور کسی فرقہ کی بنائی ہوئی کتاب کم دکھائی دیتی ہے۔ ویاکرن (قواعد صرف ونحو) کے لیے بارہ برس مقرر ہیں۔ کام کاج والا آدمی اتنی بڑی مدت اپنی تھوڑی سی عمر میں کس طرح نکال سکتا ہے اس لیے زبان دانی کی مشکلات کو دیکھ کر عام لوگ معمولی شد بد حاصل کر کے اپنے کاروبار میں لگ جاتے تھے صرف برہمن ہی علم کے مالک تھے۔ رگوید کے آخری دسویں منڈل میں برہمن، چھتری، ویش اور شودروں کے مشاغل کا جائزہ لیا ہے۔ برہمنوں کے متعلق لکھا ہے:

अध्यापनमध्ययनं यजनं याजनं तथा ।
दानं प्रतिग्रहश्चैव ब्राह्मणानाम् कल्पयत् ॥

یعنی ودیا پڑھنا پڑھانا، یگیہ کرنا کرانا، دان لینا دینا، یہ چھ کام برہمنوں کے ہیں۔

منوجی بھی چاروں ورنوں کے قائل ہیں لیکن ورن کا تعلق وہ حسب سے مانتے ہیں نسب سے نہیں۔ اُن کا کہنا یہ ہے کہ آدمی میں جس ورن کے گُن (صفات) ہوں اس کو اسی ورن کا ماننا چاہیئے۔ لکھتے ہیں:

शूद्रो ब्राह्मणतामेति ब्राह्मणश्चैति शूद्रताम् ।
क्षत्रियाज्जातमेवन्तु विद्याद्वैश्यात्तथैव च ॥

یعنی شودر بھی برہمن بن سکتا ہے اور برہمن بھی شودر ہو سکتا ہے اسی طرح چھتری اور ویش بھی دوسرے ورن کو پراپت ہو سکتے ہیں لیکن افسوس ہے کہ سماج اُسکو عمل میں نہیں لا سکا اس لیے کہ اس پر سرمایہ داروں کا غلبہ تھا۔ مختصر یہ کہ تعلیم عام نہ تھی اور لکھنے کا فن بھی محدود تھا بقول یونانی مؤرخ میگستھنیز صرف علما جانتے تھے (ملاحظہ ہو ہسٹری آف لیٹریچر صفحہ ۳۰ مصنفہ پادری ٹیلر)

بزرگو و دوستو! زبان ایک طرح کی مشین ہے جو ایک شخص کے خیالات کو دوسرے تک پہنچاتی ہے جتنی ہلکی اور کم وزن ہوگی اتنی ہی زیادہ کارآمد ہوگی ہر کوئی شخص اس کو استعمال کرسکے گا۔ سیکڑوں پرزوں کی مشین کو کون استعمال کرسکے گا۔ اس نکتہ کو آریہ عالموں نے ملحوظ نہیں رکھا۔ انھوں نے زبان کو حتی المقدور مشکل اور مصنوعی بنایا جس سے سیکھنے والوں کو طرح طرح کی دشواریاں پیدا ہوگئیں۔ علماء کی یہ کوشش بیکار نہ تھی زبان کو آسان رکھنے سے ان کی قدر و منزلت اور آمدنی میں کمی آتی تھی اس لیے نسلاً بعد نسلٍ یہی کوشش کرتے چلے آئے کہ زیادہ سے زیادہ مغلق اور مصنوعی ہو جائے جیسا کہ لفظ سنسکرت کے معنی پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے یعنی خوب مصنوع، آراستہ و پیراستہ اور ترتیب دادہ مثال کے طور پر صرف سندھی یعنی مرکبات کے اصول پر غور کیجئے کتنی مشکل ہے اسی لیے "کادمبری" مصنفہ بان کوی سے مستفید ہونا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ کاش کہ ہر لفظ کو اس کے اصلی رُوپ میں لکھا جاتا تو پھر سنسکرت زبان اتنی مشکل نہیں رہتی جتنی کہ اب ہے۔ بہر صورت علم کے مالک برہمن تھے۔ راجہ لوگ اور کشتری و بنئے امرا غرباً بھی حتی الوسع واقفیت پیدا کر لیتے تھے لیکن عوام محروم تھے یہاں تک کہ رانیاں بھی پراکرت (روزمرہ کی زبان) میں بات چیت کرتی تھیں۔ رامائن میں مذکور ہے کہ جب ہنومان نے ڈھونڈتے ڈھونڈتے سیتا جی کو ایک درخت کے تلے کھڑے دیکھا تو ان سے پراکرت میں گفتگو شروع کی۔ مشہور ناٹک مرچھکٹیکا کے پہلے انک میں "سوتردھار" بطور معذرت کہتا ہے "سنئے میں فلاں شخص ہوں مجھے سنسکرت بولنا چاہیے مگر کام کی جلدی کے مارے اور موقع کی مناسبت سے یعنی عورت سے کہنا ہے اور وہ سنسکرت نہیں سمجھ سکے گی اس لیے پراکرت ہی میں کہتا ہوں" اسی کتاب کے انک ۳ میں ودیوشک برہمن کہتا ہے "عورت کا سنسکرت بولنا ویسا ہی مشکل ہے جیسا کہ مرد کا عورت کے باریک الحان کی نقل کرکے گیت گانا"

بہر حال سنسکرت زبان کو عام فہم ہونے سے روکنے کے لیے جہاں اس کے

رف ونحو کو مشکل سے مشکل تر بنایا گیا اور اس کے سیکھنے اور سکھانے میں امتیاز برتا گیا اسی
رح اس کے حروف کی وضع قطع میں تصنع برتا گیا۔ یہ بہت جگہ گھیرتے ہیں۔ ان کے لکھنے
ہ دیر لگتی ہے اور اگر اس کی ماترےمں (اعراب) کو اڑا دیا جائے تو پھر عبارت کا مطلب ہی
بط ہو جاتا ہے۔ البتہ تلفظ کے لحاظ سے حروف کی ترتیب عاقلانہ ہے لیکن ہزارہا سال
انی اور ہندوستان میں آباد آریہ قوم کے لیے یہ تعریف نہ کافی ہے سچ یہ ہے کہ آریوں نے
ہری علوم و فنون کی طرف توجہ کم کی ہے۔ حقیقتاً عربی و سنسکرت دونوں ایک ہی ماں۔
آرامی زبان کی دو سگی بہنیں ہیں۔ عربی حروف لکھنے کا جو طریقہ رفتہ رفتہ پیدا ہوا وہ سمجھنے
مجھنے آسان ہو گیا۔ اس کے الفاظ کو بلا اعراب کے روانی کے ساتھ پڑھا جا سکتا ہے۔ لکھنے
ں جگہ کم گھیرتے ہیں اور تیزی کے ساتھ لکھے جا سکتے ہیں۔ عربی و فارسی کے خط نسخ یا شکست
ے انداز پر اگر سنسکرت کے حروف کو لکھا جائے تو تحریر کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔
نقریہ کہ کچھ تو زبان کی مشکلات اور کچھ قومی تنگ نظری کی بنا پر سنسکرت زبان کو بہت نقصان
پہنچا لیکن آج صورتِ حال دوسری ہے یہ مانا کہ زبان کی تحریری مشکلات میں کوئی کمی نہیں ہوئی
ر اس کے ساتھ ساتھ قومی تنگ نظری کے شیطان نے اپنی شکست تسلیم کر لی ہے اس لیے
ں کے پڑھنے پڑھانے پر اب کوئی پابندی نہیں سیکولر بھارت میں اب عوام اس کو سیکھ کر فائدہ
ھا سکتے ہیں جس سے وہ ابتک محروم تھے۔ وہ اب مذہبی کتابوں کو پڑھ کر اور ان میں بکھرے
ے موتیوں کو چن کر ان سے یکجہتی و ہم آہنگی کی حسین مالا تیار کر سکتے ہیں اور بلا روک ٹوک
ن سکتے ہیں کہ جس کے تیار کرنے اور پہننے سے وہ اب تک قاصر تھے۔

بزرگو اور دوستو! آپ بھی اپنی مالا کے لیے ان مقدس کتابوں میں سے اپنی پسند کے
تی منتخب کر لیجیے۔ اپنی پسند کے موتیوں کے انتخاب کے لیے اس لیے توجہ دلانے کی
رورت محسوس ہوئی کہ آج ہمارے سناتن دھرمی بھائیوں کو جو موتی پسند ہیں وہ آریہ دھرم
ے متبعین کے لیے ناپسند ہیں۔ سناتن دھرمی بھائی ویدوں، پرانوں، اپ نشدوں نیز

تمام دیگر کتابوں رامائن وبہا سبھارت وغیرہ کو مقدس سمجھتے ہیں جبکہ آریہ بھائی صرف و
پر ایمان رکھتے ہیں حالانکہ ویدوں واُپ نشدوں کی طرح پرانوں کی بھی اہمیت کچھ کم نہیں۔
وید خود پرانوں کے مصدّق ہیں۔ رگوید میں یگیہ میں پڑھے جانے والے پران کا ذکر ہے
سوکت ۳۰ منتر ۶ میں آتاہے " پران یگیہ کے ذریعے ہمارے بزرگ رشی بنائے گئے
شتپتھ برہمن میں جو یجر وید کی پرانی اور مستند تفسیر ہے لکھا ہے کہ " یگیہ کے نویں د
پران پڑھے ،، کون سا پران پڑھے اس کی تشریح شانکھائن شروت سوتر ۱۶ میں کی گئی کہ
ڈالیو پران ،، پڑھے۔ غرضیکہ ہندو مذہب کے مستند سے مستند لٹریچر میں پرانوں کی فضیلت
کا ذکر ہے (ملاحظہ ہو اتھروید کانڈ ۱۵، سوکت ۶، منتر ۱۲، چھاندوگیہ اُپ نشد پرپاٹھک
کھنڈ ۱، ۲)۔ بایں ہمہ ہمارے اس زمانہ میں کچھ پنڈت لوگ پرانوں میں جناب محمد رسو
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت دیکھ کر بجائے اس کے کہ وہ اپنے رشیوں کی عظمت اور بز
کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ان کے کلام کی قدر کرتے اور رسولِ عربی کی فضیلت کے قائل ہو۔
سرے سے پرانوں ہی کی منکر ہو گئے۔ بہر صورت ویدوں پر سب کا اتفاق ہے اس
سب سے پہلے انھیں میں سے موتیوں کا انتخاب کیجئے۔ (باقی

ضروری گزارش

حضرات۔ ممبران ادارہ اور بُرہان کے خریداروں سے گذارش ہے کہ ادارہ سے
آپ حضرات کو یاددہانی کے خطوط ارسال کیے جارہے ہیں۔ ان پر فوری توجہ
فرمائیں۔ نیز خطوط ارسال کرتے وقت یا منی آرڈر کوپن پر اپنا پورا پتہ اور خریدار
نمبر کا لکھنا نہ بھولیں جو پتہ کی چٹ پر درج ہوتا ہے۔ تاکہ تعمیلِ ارشاد میں تاخیر
نہ ہو۔

(نیاز مند منیجر)

الترغیب والترہیب

مصنفہ حافظ زکی الدین عبد العظیم بن عبد القوی المنذری رح

از جناب مولوی محمد عبد اللہ صاحب دہلوی

(۲)

اہلِ علم کی طرف سے کتاب کی خدمات | اب سے چند صدی پہلے تک کسی کتاب کی مقبولیت کی علامت یہ تھی کہ اس پر زیادہ سے زیادہ شروح و حواشی ہوں اور تلخیصات ہوئی ہوں۔ درسی اور غیر درسی تمام کتابوں میں آپ دیکھیں گے کہ جو کتابیں ہمیشہ علماء و طلبہ کی توجہ کا مرکز رہی ہیں عموماً سب سے زیادہ شروح انہی پر لکھی گئی ہیں جس کی عمدہ مثال شیخ جمال الدین صاحب رح کی کتاب کافیہ اور شیخ شرف الدین البوصیری کا قصیدہ بردہ وغیرہ ہیں۔ کشف الظنون میں کئی کئی صفحات میں ان کی شروح و حواشی کی فہرست دی گئی ہے[۲]۔

الترغیب والترہیب اگرچہ کوئی دقیق فنی کتاب نہ تھی کہ جس کو سمجھنے کے لیے شروح و حواشی ناگزیر ہوں لیکن اس کے باوجود بہت سے حضرات نے اس پر کام کیا اور اس کے بھی متعدد شروح و

---

[۱] اس کا حوالہ صرف ایک جگہ الترغیب فی الجنۃ و نعیمہا کی حدیث ۱۲۸ میں ملتا ہے

---

[۲] کافیہ کے لیے دیکھیے کشف الظنون ج ۲ ص ۲۴۹ تا ص ۲۵۴، اور قصیدہ بردہ کے لیے دیکھیے کشف الظنون ج ۲ ص ۲۲۵ تا ص ۲۳۸۔

حواشی لکھے گئے۔ ہم یہاں اختصار کے ساتھ اس پر کئے ہوئے کاموں کا تعارف کراتے ہیں۔

(۱) تلخیصات :۔

(۱) اس کتاب کی ایک تلخیص شیخ الاسلام حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر العسقلانی المتوفی ۸۵۲ھ نے کی ہے جو اصل کتاب کے مقابلہ میں تقریباً ایک چوتھائی ہے۔ اس تلخیص میں حافظ ابن حجر نے ضعیف احادیث حذف کر دی ہیں اور صحیح احادیث میں جو ایک ہی مفہوم کی یا قریب قریب مضمون کی متعدد روایات تھیں ان میں سے صرف ایک دو روایتیں لے کر باقی حذف کر دی ہیں اور سند کے رجال پر مصنف نے جو کلام کیا تھا اسے صرف ایک دو جملوں میں ذکر کیا ہے اس طرح اس تلخیص میں اصل کتاب کی پانچ ہزار سات سو پچانوے احادیث میں سے کل آٹھ سو پچپن[۱] حدیثیں رہ گئیں۔

یہ کتاب منتظمین ادارہ احیاء المعارف (مالیگاؤں) اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی اور ان کے رفقاء کی کاوشوں سے بفضل اللہ تعالیٰ ۱۳۸۱ھ میں بنام "انتقاء الترغیب والترہیب" شائع ہو چکی ہے حضرت مولانا موصوف نے اس کے متعدد[۲] قلمی نسخوں کی مدد سے اور اصل کتاب الترغیب للمنذری سے مراجعت کر کے اس کا مکمل نسخہ تیار کیا اور مختصر تعلیقات کے ساتھ شائع کر کے اسے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔ نجزاھم اللہ خیراً۔

---

[۱] ادارہ احیاء المعارف کے شائع کردہ نسخے میں اس تلخیص کی آخری حدیث کا نمبر ۸۵۵ ہے یہاں اس تلخیص کی کل حدیثوں کی تعداد اسی پر اعتماد کرتے ہوئے لکھی گئی ہے۔

[۲] اس کتاب کی طباعت کے وقت حضرت مولانا اعظمی کے علم میں اس کتاب کے صرف تین نسخے تھے ایک بہرائچ کا دوسرا ندوۃ العلماء لکھنؤ کا اور تیسرا دار العلوم دیوبند کا اور یہ تینوں مولانا کے پیش نظر رہے ہیں ـــــ لیکن ایک چوتھا نسخہ جس کا بہت کم لوگوں کو علم ہے کاندھلہ (ضلع مظفر نگر یوپی) میں محترم مولانا صوفی افتخار الحسن صاحب کے یہاں ہے جو شوال ۱۲۳۷ھ میں لکھا گیا ہے۔ اس کا اکثر حصہ میاں محمد بخش کے قلم سے ہے اور چند اوراق محمد حسین، محمد خورشید اور عبد الحق صاحبان کے قلم سے ہیں۔ تعداد صفحات ۱۰۵

صاحب کشف الظنون نے حافظ منذری کی الترغیب کا تعارف کراتے ہوئے اس تلخیص کا ذکر کیا ہے [۱]

(۲) اس کا دوسرا انتخاب شیخ مصطفیٰ بن محمد عمارہ نے کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔ " میں نے اس کتاب کا مطالعہ خاص توجہ کے ساتھ ۱۳۴۹ھ سے شروع کیا:

واخرجت مختارات تنزید عن الفین [۲] — اور میں نے اس میں سے کچھ حدیثیں منتخب کیں جن کی تعداد دو ہزار سے اوپر ہے۔

شیخ مصطفیٰ بن محمد عمارۃ نے حاشیۂ ترغیب کا مقدمہ ذی قعدہ ۱۳۵۲ھ مطابق مارچ ۱۹۳۴ء میں لکھا ہے اور اس مقدمہ میں وہ لکھتے ہیں کہ " لما تطبع " ابھی تک اس انتخاب کے طبع ہونے کی نوبت نہیں آئی ہے —— حدیثوں کی تعداد کے پیش نظر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ انتخاب حافظ ابن حجر عسقلانیؒ کے مذکورہ انتخاب کے مقابلہ میں بہت ضخیم ہوگا۔

(۲) ضمیمے :-

علامہ شہاب الدین احمد بن ابی بکر بن اسماعیل بن سلیم بن قایماز بن عثمان بن عمر الکنانی البوصیری [۳]

---

[۱] کشف الظنون ج ۱ ص ۲۸۱ ، —— محترم مولانا محمد ایوب صاحب اعظمی استاذ حدیث جامعہ اسلامیہ ڈابھیل (گجرات) نے ۱۳۸۲ھ میں اس تلخیص کا ترجمہ کیا ہے۔ ترجمہ حامل متن ہے ترجمہ کے ساتھ مختصر تشریح بھی ہے۔ ابھی غیر مطبوعہ ہے (مراسلت مولانا موصوف)

[۲] مقدمۂ حاشیۂ ترغیب ج ۱ ص ۲ از شیخ مصطفیٰ بن محمد عمارۃ۔

[۳] یہ " بوصیری " صاحب قصیدہ بردہ کے علاوہ ہیں۔ صاحب قصیدہ بردہ کا نام ہے محمد بن سعید بن حماد شرف الدین ابو عبداللہ الدلاصی البوصیری المتوفی ۶۹۵ھ — کشف الظنون ج ۲ ص ۲۲۵ میں سن وفات ۶۹۴ھ لکھا ہے —— جو صحیح نہیں ہے۔

القاہری الشافعی نے پہلے مندرجہ ذیل دس کتابوں کی وہ تمام روایات ایک کتاب میں جمع کیں جو صحاح ستہ میں نہیں ہیں اور اس کا نام رکھا " اتحاف الخیرۃ بزوائد المسانید العشر علی الکتب الستۃ" [1]

وہ دس کتابیں جو اتحاف الخیرۃ میں جمع کی گئی ہیں یہ ہیں :-

(۱) مسند ابی داؤد الطیالسی	(۲) مسند مسدد رح
(۳) مسند الحمیدی رح	(۴) مسند العدنی رح
(۵) مسند اسحٰق بن راہویہ رح	(۶) مسند احمد بن منیع رح
(۷) مسند ابن ابی شیبۃ رح	(۸) مسند عبد بن حمید رح
(۹) مسند الحارث بن محمد بن ابی اسامۃ رح	(۱۰) مسند ابی یعلی الموصلی رح

یہ کتاب " اتحاف الخیرۃ " " مصابیح " کے طرز پر لکھی گئی ہے اور سو ابواب پر مشتمل ہے۔ کتاب کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الذی لاتنفد خزائنہ الخ پھر مصنف رح نے " اتحاف الخیرۃ " اور مسند الفردوس للدیلمی " سے انتخاب کرکے ایک اور مجموعہ تیار کیا۔ " تحفۃ الحبیب للحبیب بالزوائد فی الترغیب والترہیب " لیکن عمر نے وفا نہ کی اور اس کی تبییض و تہذیب کرنے سے پہلے ہی سفرِ آخرت پیش آ گیا۔ ان کے بعد ان کے صاحبزادے نے اُسے صاف کیا اور اس میں بہت کچھ کمی بیشی کر ڈالی اور بہت سی بے اصل حدیثیں بھی اس میں شامل کر دیں۔

شہاب الدین البوصیری محرم کے دوسرے عشرے میں سن سات سو یا سٹھ ہجری ۷۶۲ھ میں بوصیر میں پیدا ہوئے۔ وہیں قرآن مجید حفظ کیا اور تجوید کی مشق کی پھر اپنے والد کے ساتھ

---

[1] الرسالۃ المستطرفہ ص ۱۳۹ رص ۱۳۰ میں اس کا نام ذرا فرق سے " اتحاف السادۃ المھرۃ الخیرۃ بزوائد المسانید العشرۃ " بیان کیا ہے۔

قاہرہ منتقل ہوگئے اور النور الادمی سے فقہ اور البدر القدسی الحنفی سے علم نحو حاصل کیا۔ شیخ عزالدین بن جماعۃ کی مجالس درس میں شریک ہوئے اور علوم منقولہ و معقولہ میں خوب استفادہ کیا۔ ان کے علاوہ التقی بن الحاکم، التنوخی، البلقینی، العراقی اور العیثی سے بھی استفادہ کیا۔ حافظ عراقی کے صاحبزادے ولی عراقی کی صحبت بھی پائی اور بہت سے مشائخ حدیث سے استفادہ کیا۔ شیخ الاسلام حافظ ابن حجر عسقلانی کی طویل صحبت پائی اور آخر تک ان کے ساتھ رہے چند اور تصانیف یہ ہیں:۔

(۱) "مصباح الزجاجۃ فی زوائد سنن ابن ماجۃ علی باقی الکتب الخمسۃ" اس میں احادیث کی سندوں پر بھی کلام کیا ہے۔ یہ ایک جلد میں ہے۔ شذرات الذہب میں کتاب کے نام کے اخیر میں "الکتب الخمسۃ" کی جگہ "الکتب الستۃ" ہے لیکن راجح "الخمسۃ" ہی ہے۔ کشف الظنون میں بھی "الخمسۃ" ہی ہے۔

(۲) فوائد المنتقیٰ بزوائد البیہقی فی سننہ الکبریٰ علی الکتب الستۃ" یہ کتاب دو یا تین جلدوں میں ہے[۲]

(۳) "خصال تعمل قبل الموت فیمن یجری علیہ بعد الموت" یہ ایک مختصر سا رسالہ ہے۔

(۴) ایک رسالہ میں وہ تمام روایات جمع کی ہیں جن میں پچھنا لگوانے کے متعلق ہدایات ہیں۔

340 93

ان کے شاگرد بہت سے بڑے بڑے فضلاء ہیں جن میں سے سخاوی نے صرف ابن فہد کا نام لکھا ہے۔ زندگی بھر فن حدیث ہی میں اشتغال و انہماک رہا بروز اتوار

---

[۱] کشف الظنون ج ۲ ص ۔
[۲] علامہ سخاوی نے اسی طرح شک کے ساتھ بیان کیا ہے۔ (الضوء اللامع میں اسی)

دوپہر بوقت زوال ستائیس محرم سن آٹھ سو چالیس ہجری (۸۴۰ھ) میں قاہرہ میں وفات پائی [۱]

(۳) شروح :-

(۱) کتاب الترغیب والترہیب کی ایک شرح الامام العلامۃ برہان الدین ابو اسحٰق ابراہیم بن محمد بن محمود بن بدر الحلبی الدمشقی القبیباتی الشافعی المعروف بالناجی نے لکھی ہے۔ یہ ربیع الاوّل یا ربیع الثانی سن آٹھ سو دس ہجری (۸۱۰ھ) میں دمشق میں پیدا ہوئے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی، ابن ناصر الدین، الفخر عثمان بن الصلف وغیرہم سے علم حاصل کیا۔ اہل دنیا سے الگ تھلگ رہتے تھے۔ بہت مختصر اور اہل قناعت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ خضیری نے شیخ، عالم، فاضل، محدث، محرر، متقن، معتمد کے الفاظ کے ساتھ ان کا ذکر کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ ان کی زبان وقلم نے دین وعلم کی بہت خدمت کی ہے۔ علامہ سخاوی اور صاحب کشف الظنون نے ان کی شرح الترغیب کا ذکر کیا ہے [۲]

برہان ناجی کی وفات سن نو سو ہجری (۹۰۰ھ) میں دمشق میں ہوئی مورخ ابن العماد کے قول کے مطابق انھوں نے نوے سال سے زیادہ عمر پائی لیکن حافظ سخاوی کے حوالے سے اوپر جو ان کا سن ولادت نقل کیا گیا ہے اس کی رو سے ان کی پوری نوے سال ہوتی ہے ہمارا

---

[۱] الضوء اللامع ج ۱ ص۲۵۱ و ص۲۵۲، شذرات الذہب ج ۷ ص۲۳۳ ص۲۳۴، ذیل تذکرۃ الحفاظ للسیوطی ص۳۷۹ و ص۳۸۰، کشف الظنون ج ۱ ص۴۷ و ج ۲ ص۸، حسن المحاضرۃ ج ۱ ص۱۵۳، الرسالۃ المستطرفۃ ص۱۳۹،

[۲] کشف الظنون ج ۱ ص۴۰۱، الرسالۃ المستطرفۃ ص۱۴۸، شذرات الذہب ج ۷ ص۳۶۵ الضوء اللامع ج ۱ ص۱۶۶،

اندازہ ہے کہ ابن الملاکو ان کا سن ولادت نہیں معلوم ہو سکا ہے اور یا پھر یوں کہیے کہ نوے سال سے چند ماہ[۵۱] زائد مراد لئے جائیں واللہ تعالیٰ علم۔

یہ شیخ برہان الدین الناجی حافظ جلال الدین سیوطی المتوفی ۹۱۱ھ اور حافظ شمس الدین سخاوی المتوفی ۹۰۲ھ کے ہم عصر ہیں۔ علامہ سیوطی سے ان کی مراسلت بھی ہوئی ہے اور سیوطی کا ایک رسالہ " الدرۃ التاجیۃ علی اہ سئلۃ الناجیۃ " انہی کے ایک طویل سوالنامے کا مفصل جواب ہے جس کا نام بھی سیوطی نے انہی کے نام پر رکھا ہے۔ ہم نے برہان الناجی کے اس سوال اور سیوطی کے اس رسالہ کا مطالعہ کیا ہے۔ جواب کے دوران سیوطی نے برہان ناجی کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے کہیں کہیں ان پر تنقید بھی کی ہے۔ جیسا کہ رسالۂ مذکور کی اکیسویں حدیث کے تحت ہے اور رسالہ کا نام ہی خود ایسا ہے کہ تنقید کی سختی اس سے صاف جھلک رہی ہے ــــــ حافظ شمس الدین سخاوی اور یہ باہم متعارف تو تھے لیکن ملاقات نہیں ہوئی سخاوی نے الضوء اللامع میں ان کا تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے۔ وھو الآن من الاحیاء[۵۳] یعنی یہ اس وقت تک بقید حیات ہیں۔

(۲) ایک شرح فاضل فیومی کی ہے جس کا تذکرہ الرسالۃ المستطرفۃ میں کیا گیا ہے اس کا قلمی نسخہ جامع قرزوین (فاس) میں موجود ہے[۵۴]

۳۔ اس کی ایک شرح شیخ محمد حیات بن ابراہیم سندھی نے بھی لکھی ہے۔ آپ قوم "چاچڑ" سے تعلق رکھتے تھے۔ عادل پور ضلع سکھر (سندھ) کے باشندے تھے۔ پیدائش اپنے آبائی وطن

---

[۵۱] ہمیں ان کی وفات کا مہینہ نہیں معلوم ہو سکا ورنہ اس کا تعین ہو جاتا۔

[۵۲] اس رسالہ کا ذکر کشف الظنون ج ۱ ص ۴۹۳ ، میں بھی ہے۔ حافظ سیوطی کے فتاوی "الحاوی" میں شامل ہو کر یہ رسالہ مصر سے کئی بار شائع ہو چکا ہے (الحاوی ج ۲ ص ۲۰ تا ص ۴۴)

[۵۳] الضوء اللامع ج ۱ ص ۱۶۶ ، [۵۴] الرسالۃ المستطرفۃ صفحہ ۱۳۸ - ہمیں اس شرح کے متعلق اس سے زائد معلومات حاصل نہیں ہو سکیں۔ (مرتب)

میں ہوئی اور وہیں تعلیم و تربیت ہوئی۔ بعد میں حجازِ مقدس تشریف لے گئے، وہاں شیخ ابوالحسن کبیر سندھی، شیخ عبداللہ بن سالم بصری، شیخ ابوطاہر کورانی اور شیخ حسین عجیمی جیسے فضلاء سے علم حاصل کیا۔ شیخ ابوالحسن سندھی کی وفات کے بعد چوبیس[1] سال تک ان کی مسند پر حدیث شریف کا درس دیا۔

آپ کے تلامذہ میں شیخ عبدالقادر کوکبانی، شیخ محمد سویدی، شیخ ابوالحسن بن محمد صادق صغیر سندھی[2]، سید غلام علی آزاد بلگرامی اور مولانا فاخر الہ آبادی جیسے فضلاء شامل ہیں۔

آپ کی تصانیف میں (۱) الترغیب والترہیب کی شرح دو ضخیم جلدوں میں (۲۔۳) علامہ نووی اور ملا علی قاری کی کتاب الاربعین کی شرحیں۔ (۴) الایقاف علی اسباب الاختلاف۔ (۵) ایک سالہ

---

[1] ایک فاضل مضمون نگار نے شیخ محمد حیات سندھی کے حالات میں یہاں بجائے چوبیس کے چونتیس لکھا ہے۔ لیکن یہ بالکل غلط ہے اس لیے کہ شیخ ابوالحسن (کبیر) سندھی کی وفات ۱۱۳۸ھ میں ہوئی ہے اور شیخ محمد حیات کی وفات صفر ۱۱۶۳ھ میں ہے، اس لحاظ سے شیخ محمد حیات کو شیخ ابوالحسن کے بعد کل چوبیس سال دو ماہ ملے۔ لہذا نزھۃ الخواطر وغیرہ کا وہ بیان ہی درست ہے کہ جلس مجلس شیخہ محمد بن عبد الھادی السندھی بعد وفاتہ اربعا وعشرین سنۃ۔ (نزھۃ الخواطر ج ۶ ص ۱۰۲)۔

[2] یاد رکھنا چاہیے کہ "ابوالحسن سندھی" نام کے دو بزرگ ہیں اور دونوں ہی جلیل القدر محدث اور صاحب تصانیف ہیں، اول شیخ ابوالحسن نورالدین محمد بن عبدالہادی السندھی المتوفی ۱۱۳۸ھ صحاح ستہ اور مسند احمد پر جو حواشی ہیں وہ انہی کے ہیں اور یہ شیخ محمد حیات کے استاد ہیں۔ دوسرے شیخ ابوالحسن بن محمد صادق السندھی المتوفی ۱۱۸۷ھ جامع الاصول کی شرح انہی کی لکھی ہوئی ہے اور ابوالحسن صغیر کے نام سے مشہور ہیں تاکہ مذکورہ بالا شیخ ابوالحسن کبیر سے امتیاز ہو جائے۔
(نزھۃ الخواطر ج ۶ ص ۱۰۲ و ج ۶ ص ۵، مقدمہ لامع الدراری ص ۴۴ و ص ۴۴ (طبع ثالث ثانیہ)، ماتمس الیہ الحاجۃ ص ۵۳)

قبروں سے متعلق غلط رسم و رواج کی تردید میں (۹) ایک رسالہ احادیث نبویہ پر عمل کرنے کی اہمیت اور طریق مسنون کی حفاظت کے سلسلے میں لکھا جس کا نام ہے " تحفۃ الانام فی العمل بحدیث النبی علیہ السلام " اور متعدد رسائل مختلف موضوعات پر اور لکھی ہیں۔

شیخ عبدالقادر کوکبانی لکھتے ہیں کہ میں ایک طویل مدت آپ کی خدمت میں رہا ہوں لیکن میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ آپ نے خلافِ سنت کوئی کام کیا ہو۔

آپ نے بدھ کے دن چھبیس[۲۶] صفر سن گیارہ سو تریسٹھ ہجری (۱۱۶۳ھ) میں وفات پائی اور جنۃ البقیع میں دفن کئے گئے [۱]

(۴) اس کی ایک شرح "فتح القریب بشرح الترغیب والترہیب" کا تذکرہ مشہور مفسر واعظ شیخ اسماعیل حقی المتوفی ۱۱۳۷ھ نے اپنی تفسیر روح البیان میں سورہ توبہ کے آخر میں[۲] بطور حوالہ کیا ہے۔ لیکن نہیں کہا جا سکتا کہ یہ مذکورہ شروح ہی میں سے کسی شرح کا نام ہے یا کوئی اور شرح ہے۔ واللہ اعلم۔

(۴) حواشی:

اس کتاب پر ہماری معلومات میں صرف ایک حاشیہ شیخ مصطفی بن محمد بن عمارہ نے لکھا ہے جو بنام " الفتح الجدید فی شرح جواہر احادیث الترغیب والترہیب " مصر سے کتاب کے ساتھ کئی بار شائع ہو چکا ہے یہ حاشیہ بہت مبسوط ہے کہیں کہیں تو کئی کئی صفحات صرف حاشیہ کے ہیں۔ اس میں محشی نے اکثر ابواب میں آیاتِ قرآنی بھی جمع کرنے کا اہتمام کیا ہے اور باب کے آخیر میں عموماً فقہ الباب کے عنوان سے پورے باب کا خلاصہ بیان کرتے ہیں موقع بموقع

---

[۱] فہرس الفہارس ج ۱ ص ۳۶۴، سبحۃ المرجان ص ۹۵ و ص ۹۶، ابجد العلوم ص ۸۴۹، الرسالۃ المستطرفۃ ص ۱۴۸، نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۳۰۳ ، [۲] تفسیر روح البیان ج ۳ ص ۵۴۸ (المطبعۃ العثمانیۃ المطبوعۃ فی استنبول ۱۳۳۰ھ)

علماء کی رائیں بھی لکھتے ہیں صوفیاء کے اقوال اور شعراء کے کلام سے بھی مدد لیتے ہیں کہیں کہیں جدید مسائل پر بھی اظہار خیال کیا ہے ۔ حلِ لغات کا خاص طور پر اہتمام کیا ہے بحیثیت مجموعی اس حاشیہ کا انداز وعظ و تذکیر کا ہے اور کتاب کے موضوع کے لحاظ سے یہ ہی مناسب بھی ہے ۔ لیکن حدیثی تحقیقات کے لحاظ سے اس کا دامن بالکل خالی ہے اس حاشیہ کی ضخامت تقریباً اصل کتاب کے برابر ہے، اس حاشیہ کی تکمیل بروز دو شنبہ ۱۴ محرم الحرام ۱۳۵۹ھ کو ہوئی ۔

(۵) ترجمے :-

اس کتاب کے ترجمے کے سلسلے میں متعدد کوششیں ہوتی ہیں جن میں سے اکثر ادھوری رہیں لیکن بعض پوری بھی ہوئی ہیں ۔ پھر ان میں سے بعض تراجم تو کتابی شکل میں شائع ہوئے اور بعض صرف ماہانہ رسائل ہی میں بالاقساط شائع ہوئے اور نایاب ہو گئے ۔ ہم اختصار کے ساتھ ان کا تعارف کراتے ہیں ۔

۱۔ الترغیب والترہیب کا ایک ترجمہ "تبشیر و تنذیر" ہے جو مولوی مرزا محمد بیگ صاحب کے قلم سے ہے یہ ترجمہ مترجم کے بھائی مرزا محمد بیگ صاحب مدیر رسالہ کاشف العلوم نے مطبع النوری دہلی سے ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۹۰۸ء میں شائع کیا ۔ یہ ترجمہ بامحاورہ ہے تشریحی فوائد بالکل نہیں ہیں ۔ ایک کالم میں اصل کتاب کا بعینہ متن ہے اور دوسرے کالم میں ترجمہ ہے ۔ سائز بڑا (۳۰×۲۰/۸) ہماری نظر سے اس کے ابتدائی تین حصے گذرے ہیں جن میں کتاب الصلوٰۃ کے کچھ حصے تک کا ترجمہ آگیا ہے ۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ اور بعض وسیع المطالعہ احباب نے اس کی تائید بھی کی کہ یہ ترجمہ کتاب کے کچھ ہی حصے کا ہے پورا نہیں ہے ۔

۲۔ الترغیب والترہیب کا دوسرا ترجمہ ماہنامہ "الہادی" میں بالاقساط کئی سال تک شائع ہوا ہے یہ ماہنامہ دہلی سے محمد عثمان خاں صاحب مالک کتب خانہ اشرفیہ دہلی کے زیر ادارت تقسیم ہند سے پہلے نکلتا تھا جس کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد حضرت

مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات کو عام کرنا بھی تھا اور مدیر صاحب بھی حضرت تھانویؒ کے منتسبین میں سے تھے۔

یہ ترجمہ متعدد حضرات کا کیا ہوا ہے۔ الہادی کی جمادی الاولیٰ ۱۳۴۳ھ سے محرم ۱۳۵۶ھ تک کے رسائل ہماری نظر سے گزرے ہیں۔ اس میں آغاز کتاب سے کتاب النکاح کے ختم تک کا ترجمہ آگیا ہے۔

مترجم اوّل:۔ کتاب کے شروع سے کتاب الصدقات کے ختم تک کا ترجمہ مولانا محمد اسحٰق بن عبد اللہ میرٹھی نے کیا ہے " جو" الہادی " کے جمادی الاولیٰ ۱۳۴۳ھ سے صفر ۱۳۴۸ھ تک کے شماروں میں شائع ہوا اور اتنے حصے کا نام ہے " التادیب والتہذیب " مترجم نے اس ترجمہ کے متعلق لکھا ہے کہ " اس میں بعض روایات جو زیادہ ضعیف تھیں حذف بھی کر دی گئی ہیں[۱]"۔ مترجم نے اس میں تشریحی نوٹ بھی کہیں کہیں دیئے ہیں اور جہاں ضرورت محسوس ہوئی ہے۔ قوسین میں چند الفاظ کا اضافہ کرکے عبارت کی وضاحت کردی گئی ہے۔

مترجم دوم: یہاں سے آگے اس ترجمے کا نام " الانوار المحمدیہ " رکھا گیا ہے اور ہر بڑا عنوان الگ الگ ناموں سے کتابی شکل کے ٹائیٹل کے ساتھ " الہادی " میں شائع ہوا ہے۔ مثلاً انوار الصوم، انوار الحج، انوار الجہاد وغیرہ۔ کتاب الصوم سے یہ ترجمہ حضرت مولانا ظفر احمد صاحب[۲] تھانوی نے شروع کیا ہے۔ جو " الہادی " کے ماہ رمضان ۱۳۴۷ھ سے شعبان ۱۳۵۰ھ تک کے شماروں میں بالاقساط شائع ہوا۔ مولانا موصوف نے یہ ترجمہ انوار الدعاء کے آخر تک کیا ہے۔ ترجمہ بامحاورہ ہے اور سابقہ ترجمہ کی بہ نسبت اس میں تشریحات بھی زیادہ ہیں۔

مترجم سوم:۔ اس کے بعد کتاب البیوع سے بنام " انوار البیوع " مولانا محمد صابر صاحب

---

[۱] خلاصۂ عبارت، ماہنامہ الہادی بابت ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۳ھ ص ۲

[۲] مقیم حال ٹنڈو اللہ یار، سندھ (پاکستان)

امرو ہوی کے قلم سے ہے۔ جو مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خلیفہ ہیں۔ ان کا ترجمہ جو ہماری نظر سے گزرا ہے وہ کتاب البیوع اور کتاب النکاح کا ہے جو "الہادی" بابت ماہ شعبان ۱۳۵۸ھ سے محرم ۱۳۶۰ھ تک کے شماروں میں شائع ہوا ہے۔ یہ ترجمہ بھی تقریباً بامحاورہ ہی ہے تشریحی نوٹ بھی ہیں اور بعض بعض جگہ خاصے طویل نوٹ ہیں۔ مولانا محمد صابر صاحب آجکل کراچی (پاکستان) میں مقیم ہیں۔

۳۔ "بشیر و نذیر" یہ ترجمہ حامل متن نہیں ہے اور نہ پوری کتاب کا ترجمہ ہے بلکہ کتاب کا اختصار کر کے ترجمہ کیا گیا ہے۔ ترجمہ کی زبان جنوبی ہند کی اردو زبان ہے۔ اس لئے کہ مترجم نے دراصل یہ ترجمہ جنوبی ہند کی مسلم طالبات کے لیے کیا ہے اس میں صرف صحیح اور حسن روایات لی گئی ہیں۔ مترجم لکھتے ہیں۔

"اور ان احادیث کا ترجمہ نہیں کیا گیا ہے جن کے ضعیف ہونے کا بیان حافظ منذری نے کردیا ہے" (ص ۴)

اس کے مترجم مولانا محمد عبدالمجید صاحب پنگنوریؒ۔ آپ قصبہ پنگنور (آندھرا) میں پیدا ہوئے۔ ناظرہ قرآن مجید اپنے قریبی مقام پلم نیر میں پڑھا ابتدائی تعلیم جنوبی ہند کے مشہور مدرسہ "باقیات الصالحات" (ویلور) میں پائی۔ تقریباً دو سال یہاں پڑھنے کے بعد شہر بلہاری کے مدرسہ میں ملا عبدالقادر سے حدیث و تفسیر کی کتابیں پڑھیں، علوم ظاہری کی تکمیل کرنے کے بعد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پہنچے اور اکتساب فیض کیا حتیٰ کہ اس میں کمال پیدا کیا اور بعض تذکرہ نویسوں کے بیان کے مطابق شیخ سے خرقۂ خلافت[۱] حاصل کیا۔ اور اپنے وطن لوٹ کر دینی و علمی خدمات میں مصروف ہو گئے کئی دینی مدارس میں اہم خدمات انجام دیں تعلیم نسواں کی طرف خاص توجہ کی اور یہ ترجمہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

---

[۱] جنوبی ہند کے بعض اہل علم حضرات سے اس سلسلے میں مراسلت کی گئی تو انھوں نے بتایا
بقیہ حاشیہ صفحہ ...

مدرسہ نسواں وانمباڑی (ضلع نارتھ آرکاٹ۔ صوبہ مدراس) جو اس وقت پورے ہندوستان میں اپنی نوعیت کا واحد مدرسہ ہے ——— (خدا اس کی حفاظت فرمائے)

یہ شروع میں بچیوں کا ایک چھوٹا سا مکتب تھا مولانا عبدالمجید صاحب مرحوم اور ان کے رفقاء و معاونین ہی کی کوششوں کے نتیجہ میں ترقی کرکے اس قابل ہو گیا کہ اس میں عربی و فارسی اور ترجمہ قرآن مجید تک لڑکیوں کو پڑھایا جانے لگا، مدرسہ نسواں کی نگرانی آپ نے تیس سال تک کی اور بہت سی فاضلات تیار کیں۔

تقریباً چونسٹھ سال کی عمر میں سن انیس سو سینتیس عیسوی (۱۹۳۷ء) میں وفات پائی[1]

یہ کتاب چھوٹے سائز (۲۰×۳۰/۱۶) پر کل ۳۲۰ صفحات پر مکتبہ زہرۂ ملت وانمباڑی سے شعبان ۱۳۸۲ھ میں شائع ہوئی ہے۔

(۴) اس کتاب کے بنگلہ زبان میں ترجمہ کی کوشش ہمارے فاضل دوست مولانا عزیزالحق بدناپوری (مغربی بنگال) نے کی ہے اور شروع کے کچھ حصّہ کا ترجمہ ہو بھی چکا ہے۔ مگر معلوم ہوا ہے کہ ترجمہ شدہ اوراق کہیں گم ہو گئے ہیں۔

حاشیہ بقیہ گزشتہ صفحہ سے

کہ ان کا فضل و تقویٰ تو سب کے نزدیک مسلّم ہے لیکن خلافت پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچی تذکرۃ الرشید ج ۲ ص۱۵۳ تا ص۱۹۰ میں خلفاء کی فہرست میں بھی آپ کا نام نہیں ہے اور حضرت گنگوہیؒ کے بعض اہلِ علم اعزہ نے بھی اس کو تسلیم نہیں کیا۔ اگرچہ یہ تسلیم نہ کرنا بھی اسی تذکرۃ الرشید کی فہرستِ خلفاء کی بنیاد پر ہے اور وہ فہرست خود مصنف کے نزدیک نامکمل ہے ضرورت ہے کہ جنوب کے کوئی بزرگ اس سلسلے میں صحیح معلومات سے نوازیں۔ (مرتب)

[1] یہ حالات محترم مولانا عبدالجمیل صاحب خطیب مدیر خطیب بنگلور اس مضمون سے ذرا حذف و اضافہ کے ساتھ ماخوذ ہیں جو کتاب کے شروع میں دیا گیا ہے۔ یہ کتاب دارالعلوم دیوبند کے کتب خانہ میں نظر سے گذری تھی۔

اس لیے فی الحال سلسلہ رُکا ہوا ہے تاہم ان کا ارادہ تکمیل کرنے کا ہے [۱]۔

اہم گزارش:۔ ناچیز مؤلف اہلِ علم حضرات کی خدمت میں عرض کرتا ہے کہ اگر کسی صاحب کی کتاب الترغیب والترہیب سے متعلق کوئی خاص تحقیق ہو یا اس کے متعلق کوئی مفید مشورہ دے سکتے ہیں یا اور کسی قسم کا علمی تعاون کر سکتے ہوں تو یہ ناچیز تہ دل سے قدر داں اور شکر گزار ہوگا۔

---

[۱] مولانا موصوف نے دارالعلوم دیوبند سے ۱۹۶۲ء میں تعلیم سے فراغت پائی، یہ ترجمہ ۱۹۶۷ء میں شروع کیا تھا۔

علامہ اقبال اور تالہ زمان

(۲)

شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم اے ایل ایل بی ۔ سابق رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی (اتر پردیش)

سلسلۂ بحث کا آغاز علامہ اقبال کے مکتوب گرامی مورخہ ۷ مارچ ۱۹۲۸ء سے ہوا تھا۔ جس میں علامہ نے سید سلیمان ندوی مرحوم و مغفور سے دریافت کیا تھا:۔

"شمس بازغہ یا صدرا میں جہاں زمان کی حقیقت کے متعلق بہت سے اقوال نقل کیے ہیں، ان میں ایک قول یہ ہے کہ زمان خدا ہے۔ بخاری میں ایک حدیث بھی اسی مضمون کی ہے لا تسبوا الدھر الخ کیا حکمائے اسلام میں سے کسی نے یہ مذہب اختیار کیا ہے؟ اگر ایسا ہو تو یہ بحث کہاں ملیگی؟"(۱)

مگر سید صاحب بڑی خوبصورتی سے اس استفسار کے جواب کو گول کر گئے اور اس طرح اُس بے پناہ عقیدت کو جو اُن کے ساتھ علامہ کو آخر دم تک قائم رہی(۲) متزلزل ہونے سے بچالیا۔

قدیم ترین حوالہ | بہرحال "تالہ زمان" کا قدیم ترین حوالہ جس کے متعلق علامہ نے پوچھا تھا۔

"کیا حکمائے اسلام میں سے کسی نے یہ مذہب (تالہ زمان) اختیار کیا ہے؟"

اسلامی فکر کی تاریخ میں چوتھی صدی ہجری کے اندر ملتا ہے اور اس کا قائل تیسری صدی ہجری سے تعلق رکھتا ہے۔ اس بات کی طرف سابق میں اجمالی طور پر اشارہ کیا جاچکا ہے۔

---

(۱) بالنامہ صفحہ ۱۵۶

(۲) علامہ اقبال نے خود سید سلیمان ندوی کو لکھا تھا:۔ علوم اسلامیہ کی جوئے شیر کا فرہاد آج ہندوستان میں سوائے سلیمان ندوی کے اور کون ہے (معارف اکتوبر ۱۹۵۴ء صفحہ ۲۶۴)

سطور ذیل میں اسی اجمال کی موعودہ تفصیل پیش کی جا رہی ہے:۔

"تالہ زمان" Apotheosis of Time کا قدیم ترین حوالہ ابن الندیم (المتوفی ۳۸۵ھ) کی "کتاب الفہرست" میں ملتا ہے اور اس حوالہ کی رو سے اس عقیدہ کا قائل محمد بن الحسین زیدان ہے جو فرقہ باطنیہ کے بینہ بانی عبداللہ بن المیمون القداح کا پیشرو تھا۔ عبداللہ بن میمون القداح کا ظہور ۲۷۶ھ میں ہوا تھا جیسا کہ ابو الفضائل یمانی نے لکھا ہے:

"اس تحریک کا آغاز.... کوفہ میں عبداللہ بن میمون القداح کے ظاہر ہونے پر تھا.... اس کا ظہور ۲۷۶ھ میں ہوا تھا"۔(۱)

اس لئے محمد بن الحسین زیدان کا زمانہ اس سے پہلے ہی ہوگا کیونکہ مقدم الذکر موخر الذکر کا دست راست تھا اور اس کے مرنے پر تحریک کی سربراہی اسے ہی تفویض ہوئی تھی چنانچہ امام اسفرائنی نے "التبصیر فی الدین" کے اندر فرقہ باطنیہ کے آغاز کار کے بارے میں لکھا ہے۔

"ان (نام نہاد مگر خارج از اسلام) فرقوں میں سترھواں فرقہ باطنیہ کا تھا.... ان لوگوں کا فتنہ (عباسی خلیفہ) مامون الرشید کے زمانہ میں شروع ہوا اور اس کے بعد بھی قائم رہا۔ ان لوگوں کا فتنہ ایک گروہ کی سازش و تدبیر سے شروع ہوا جس میں عبداللہ بن میمون القداح جو حضرت امام جعفر صادقؑ کا آزاد کردہ غلام تھا، محمد بن الحسین المعروف بہ زیدان اور ایک اور جماعت شریک تھی جو چہار بچہ کہلاتے تھے اور جو زیدان اور میمون بن دیصان کے ساتھ تھے.. اس میں سے پہلا شخص جو تحریک کا داعی تھا وہ محمد بن الحسین الملقب بہ زیدان تھا"۔(۲)

---

(۱) کشف اسرار الباطنیہ و اخبار القرامطہ لابی الفضائل الحمادی الیمانی صفحہ ۱۹۶-۱۹۷

"اصل ہذہ الدعوۃ... ظہور عبداللہ بن میمون القداح فی الکوفۃ.... وکان ظہورہ فی سنۃ ست وسبعین ومائتین فی التاریخ للہجرۃ النبویۃ"

(۲) "الفرقۃ السابعۃ عشر منہم الباطنیۃ.... و فتنۃ ہؤلاء ظہرت ایام المامون و ...
بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ

اسی طرح ابن الندیم فرقہ باطنیہ (جسے وہ مذہب اسماعیلیہ کہتا ہے) کے شروع ہونے کے بارے میں لکھتا ہے :-

"بنو قداح (عبداللہ بن میمون القداح کی اولاد و احفاد) سے پہلے بھی کچھ لوگ مجوسی مذہب اور ایرانی (ساسانی) سلطنت کا تعصب رکھتے تھے اور (اسلام و عرب حکومت کی بیخ کنی کرکے) ان کے دوبارہ بحال کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے جن لوگوں نے عبداللہ (بن میمون القداح) کی اس معاملہ میں معاونت کی ان میں سے ایک شخص محمد بن الحسین الملقب بزیدان کے نام سے مشہور تھا۔ وہ نواحی کرخ کا رہنے والا اور احمد بن عبدالعزیز بن ابی دلف کے کاتبوں میں سے تھا۔ اس نے اس تحریک کی ابتدا کی اور اس کو کامیاب بنانے کے لیے عبداللہ بن میمون القداح کی مدد کی اور مال و دولت سے اس کی امداد کی ..... پھر سلطانی پیش گاہ میں انتقال کرگیا اور اب یہ کاروبار (تحریک باطنیت) عبداللہ بن میمون القداح کی تولیت میں آیا۔" (۱)

بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ - لبعده وانما ظهرت فتنتهم عن تدبیر جماعة وهم عبدالله بن میمون القداح وكان مولى جعفر بن محمد الصادق ومحمد بن الحسین المعروف بزیدان وجماعة كانوا يدعون (الجهاربجه) الذين كانوا مع الملقب بزیدان و مع میمون بن دیصان ...... واول من قام بها محمد بن الحسین الملقب بزیدان ..."
تبصیر فی الدین للاسفرائنی صفحہ ۱۲۳

(۱) وقد كان قبل بنی القداح قريب ممن يتعصب للمجوس ودولتها ويجتهد لردها ... وكان ممن وازر عبدالله على امره رجل يعرف بمحمد بن الحسين ويلقب بزيدان من ناحية الكرخ من كتاب احمد بن عبد العزيز بن ابی دلف .... فرطا هذه الدعوة وظاهر عليها ابن القداح واسعفه بالمال ..... ثم مات على باب السلطان فتسلم الامر ابن القداح" كتاب الفهرست لابن الندیم صفحہ ۲۶۴)

محمد بن الحسین زیدان احمد بن عبدالعزیز بن ابی دلف کا کاتب تھا، جس کا زمانہ تیسری صدی ہجری کا ثلث اوّل ہے۔ اس لئے غالباً محمد بن الحسین زیدان کی انقلابی و دعوتی سرگرمیوں کا زمانہ بھی یہی ہوگا اور اُس کی فکری کاوشوں کا زمانہ اس سے کچھ پہلے ہوگا۔

اسلام دشمنی اور شعوبیت کے علاوہ محمد بن الحسین زیدان کی مثبت فکری کاوش "قدماء خمسہ" کا اثبات تھی، چنانچہ ابن الندیم اُس کے تذکرے میں لکھتا ہے:۔

"اور یہ شخص ماہر فلسفی، علم نجوم کا حاذق، شعوبی، سلطنت اسلام سے سخت بغض و دشمنی رکھنے والا تھا۔ اس کا دین، نفس، عقل، زمان، مکان اور ہیولیٰ کا ثابت کرتا تھا" (۱)

اس طرح "تاءِ زمان" کے تصور کا قدیم ترین وقت جس کے لیے تاریخ و تراجم کی کتابوں میں حوالہ ملتا ہے، تیسری صدی ہجری کا ثلث اوّل ہے۔

دوسرا قائل | اور یہی ابوبکر محمد بن زکریا الرازی کے بلوغ و ظہور کا زمانہ ہے جو "قدماء خمسہ" کا دوسرا قائل بلکہ اس مذہب کا مجدّد تھا۔ اس نے ۲۲۵ھ میں علی بن ابن الطبری سے، جب وہ رے آیا تھا، طب پڑھی تھی(۲) اور کیونکہ اُس نے حسب تصریح ابن ابی اصیبعہ پیرانہ سالی میں طب کی تعلیم حاصل کی تھی(۳)، لہٰذا ۲۲۵ھ میں وہ کافی سن رسیدہ رہا ہوگا۔

---

(۱) "وکان ہذا الرجل متفلسفا حاذقا بعلم النجوم شعوبیا شدید الغیظ من دولۃ الاسلام وکان یدین باثبات النفس والعقل والزمان والمکان والھیولیٰ"۔ (الفہرست صفحہ ۲۶۷)

(۲) ابن القفطی نے تاریخ الحکماء میں علی بن ابن الطبری کے تذکرے (صفحہ ۲۳۱) میں لکھا ہے:۔

"وجرت لطبارستان فتنۃ خرج لاجلھا الی الرے فقرأ علیہ محمد بن زکریا الرازی"

اور طبرستان کا یہ فتنہ تاریخ طبری کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۲۲۴ و ۲۲۵ھ میں واقع ہوا تھا۔

(۳) ابن ابی اصیبعہ نے رازی کے بارے میں اس کے تذکرہ کے اندر لکھا ہے:۔

"واما صناعۃ الطب فانما تعلمہا وقد کبر" (عیون الانباء فی طبقات الاطباء الجزء الاول صفحہ ۳۰۹)

بہرحال رازی بھی "قدماءِ خمسہ" کا قائل تھا۔ اس کی قدیم ترین شہادت،
یحان البیرونی نے "کتاب الہند" میں دی ہے جو غالباً اس نے پانچویں صدی ہجری کے ربع اول
ں لکھی تھی۔ اس بات کی دوسری شہادت حکیم ناصر خسرو نے اپنی کتاب "زاد المسافرین" میں دی ہے۔
ماءِ خمسہ" کا مذہب علم کلام کی کتابوں میں "حرنانیت" کہلاتا ہے۔ چنانچہ میر سید شریف نے
شرح المواقف" میں ماتن (قاضی عضد الدین الایجی) کے قول :۔

" واثبت الحرنانیون من المجوس قدماء خمسۃ اثنان منھا الباری

حیات وھما الباری والنفس وثلثۃ لاحیۃ ولا فاعلۃ ھی الھیولیٰ

والفضاء والدھر "(۱)

کی شرح کے اندر لکھا ہے:

" قال الامام الرازی کان ھذا المذھب مستوراً فیما بین المذاھب

فمال الیہ ابن زکریا الطبیب الرازی واظہرہ وعمل فیہ کتاباً سمّٰی بالقول

فی القدماء الخمسۃ "

(امام رازی نے فرمایا ہے کہ یہ مذہب (حرنانیت) دیگر مذاہب کے درمیان

مندرس اور پوشیدہ ہو چکا تھا۔ مگر ابن زکریا رازی مشہور طبیب کا اس کی جانب میلان

ہو گیا۔ لہٰذا اس نے اُسے ظاہر کیا اور اس کے متعلق "القول فی القدماء الخمسہ"

کے نام سے ایک کتاب لکھی)

غرض رازی اور محمد بن الحسین ترنذان دونوں ہی "قدماءِ خمسہ" کے مذہب کے قائل تھے۔
ونوں ہمعصر تھے، اگرچہ یہ نہیں معلوم کہ ان میں بڑا کون تھا۔ ویسے غالباً زنذان کی وفات

---

(۱) مجوس میں سے فرقۂ حرنانیہ نے پانچ قدیموں کو ثابت کیا ہے: ان میں سے دو عالم اور حی ہیں
دوہ باری تعالیٰ اور نفس کل ہیں اور تین نہ حی ہیں اور نہ عالم اور وہ ہیولیٰ، فضائے مطلق اور دہر ہیں۔

رازی سے پہلے ہوئی تھی(۱) لیکن حتمی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ "قدمائے خمسہ" کے عقیدے میں ان دونوں کا باہمی تعلق کیا تھا، آیا محمد بن الحسین زیدان نے یہ عقیدہ محمد بن زکریا الرازی سے اخذ کیا تھا یا رازی نے زیدان سے یا پھر دونوں نے کسی اور قدیم مشترک مآخذ سے۔

رازی اور حرانیت جو بھی صورت حال رہی ہو حسب تصریح امام فخرالدین رازی (بحوالہ "شرح المواقف")، ابوبکر زکریا رازی نے "قدمائے خمسہ کے اثبات" کے موضوع پر ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام انھوں نے "القول فی القدماء الخمسہ" بتایا ہے۔ مگر رازی کی کتابوں کی فہرست میں اس نام کی کسی کتاب کا ذکر نہیں ہے۔ محمد بن زکریا الرازی کی تصانیف کی متعدد فہرستیں ہیں۔ ان میں سے قدیم ترین وہ ہے جو ابن الندیم نے "کتاب الفہرست" میں دی ہے اور جس کے مستند ہونے کے متعلق وہ کہتا ہے:-

"منقول من فہرستہ"(۲)

اور جس کے جامع ہونے کے متعلق وہ آخر میں لکھتا ہے:-

"ثم ما وجد من فہرست الرازی" (۳)

غالباً اسی فہرست کو بعد میں ابن القفطی نے "اخبار العلماء باخبار الحکماء" میں اور ابن ابی اصیبعہ نے "عیون الانباء فی طبقات الاطباء" میں نقل کر دیا ہے۔ تینوں فہرستیں بڑی

---

(۱) محمد بن الحسین زیدان غالباً ۲۷۶ھ سے پہلے مر چکا تھا کیونکہ عبداللہ بن میمون القداح کا ظہور اسی سن میں ہوا تھا اور حسب تصریح ابن الندیم زیدان کے مرنے پر عبداللہ بن میمون القداح کو تحریک کی سربراہی تفویض ہوئی تھی۔ دوسری جانب تحقیقات جدیدہ کی رو سے ابن زکریا الرازی کا سال وفات ۳۱۳ھ ہے۔

(۲) فہرست ابن الندیم صفحہ ۴۱۶

(۳) ایضاً صفحہ ۴۲۰۔

طویل ہیں، مگر کسی میں امام فخرالدین رازی کی بتائی ہوئی "القول فی القدماء الخمسہ" نہیں ہے۔ ویسے رازی (محمد بن زکریا) نے ان "قدماء خمسہ" میں سے ہر ایک پر مستقل کتابیں لکھی ہیں :-

اثبات باری تعالیٰ : کتاب فی ان للعالم خالقاً حکیما

اثبات نفس : کتاب فی النفس الصغیر،

کتاب فی النفس الکبیر۔

اثبات مکان وزمان : کتاب فی المدۃ وھی الزمان و فی الخلاء والملاء وھما المکان،

کتاب علۃ جذب حجر المغناطیس للحدید وفیہ کلام کثیر فی الخلاء۔

اثبات ہیولیٰ : کتاب کبیر فی الھیولیٰ ،

کتاب فی الھیولیٰ المطلقۃ،

کتاب فی الرد علی المسمعی المتکلم فی ردہ علی اصحاب الھیولیٰ ،

کتاب فی اتمام مانقض بہ القائلین بالھیولیٰ (۱)

مگر ان تصانیف کے عنوانوں سے یہ کسی طرح ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ (سوائے باری تعالیٰ کے) ان کے "تالہ"، یا قدیم ہونے کا قائل تھا۔ یہ بات حکیم ناصر خسرو نے اپنی کتاب "زاد المسافرین" میں صاف کردی ہے۔ وہ لکھتا ہے :-

"محمد بن زکریا پنج قدیم ثابت کردہ است یکے ہیولیٰ و دیگر زمان و سہ دیگر مکان و چہارم نفس و پنجم باری" (۲)

کچھ اسی قسم کی بات ابوریحان البیرونی نے رازی کے بارے میں "کتاب الھند" کے اندر لکھی ہے (۳) جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

---

(۱) عیون الانباء فی طبقات الاطباء الجزء الاول صفحہ ۳۱۵ و مابعد۔

(۲) زاد المسافرین صفحہ ۷۳

(۳) کتاب الھند صفحہ ۱۴

رازی کے قدماء خمسہ کے ماخذ | مورخین عموماً ابوبکر محمد بن زکریا الرازی کے خیالات کی تصویب نہیں کرتے، چنانچہ قاضی صاعد اندلسی نے لکھا ہے:۔

"ان الرازی لم یوغل فی العلم الالٰہی ولا فہم غرضہ الاقصیٰ فاضطرب لذلک رأیہ وتقلد آراء سخیفۃ وانتحل مذاہب خبیثۃ وذمّ اقواما لم یفہم منہم ولا اہتدی سبیلہم "(۱)

رازی نے نہ تو علم الالٰہیات کا اچھی طرح مطالعہ کیا اور نہ اُس کی غرض و غایت ہی کو سمجھا اسی وجہ سے اس باب میں اس کی رایوں میں اضطراب ہے۔ اس نے سخیف رایوں کی تقلید کی اور خبیث مذاہب کی پیروی کی نیز ایسی اقوام کی مذمت کی جن کی افکار وہ نہ سمجھ سکا اور نہ اس کی طرف اُسے توفیق ہوئی۔

بالفاظ دیگر وہ اسلام بیزار فکری تحریکوں یا غیر اسلامی فکری نظاموں سے متاثر تھا اور اپنے فکری بدعات و منفردات کے لیے انھیں کو ماخذ بنائے ہوئے تھا۔ یہ ماخذ تین بتائے جاتے ہیں:۔

(الف) ابوریحان البیرونی نے لکھا ہے کہ رازی نے یہ مذہب (اثبات قدماء خمسہ بالخصوص "قدم زمان") اوائل حکمائے یونان سے اخذ کیا تھا، چنانچہ وہ "کتاب الھند" میں لکھتا ہے:۔

"باب سی و دوم مدّت و زمان مطلق نیز عالم کی تخلیق اور فنا کے بارے میں:۔
محمد بن زکریا الرازی نے اوائل حکمائے یونان سے پانچ اشیاء کے قدیم ہونے کی حکایت کی ہے، وہ باری سبحانہ، نفس کلی، ہیولیٰ، مکان مطلق اور زمان مطلق ہیں اور اس نے اسی ماخذ پر اپنے مخصوص مذہب کی بنیاد رکھی ہے"(۲)

---

(۱) طبقات الامم صفحہ ۵۲

(۲) "الباب فی ذکر المدۃ والزمان بالاطلاق وخلق العالم و فنائہ: قد حکی محمد بن زکریا الرازی عن اوائل الیونانیین قدمۃ خمسۃ اشیاء منہا الباری سبحانہ ثم النفس الکلیۃ ثم الہیولیٰ ثم المکان ثم الزمان المطلقان وبنی ہو علی ذلک مذہبہ الذی تاصل عندہ" (کتاب الھند ص ۱۶۳)

اُس کے بعد اُس نے زمان اور مدت میں تدقیق کی ہے کہ ان میں سے ایک پر ہو سکتا ہے[1] مگر دوسرے پر نہیں۔ لیکن اس کی تفصیل ہمیں موضوع زیر بحث سے دور لے جائے گی۔ مگر یونانی فلسفہ کی موجودہ تواریخ کے اندر "قبل سقراطی دور" (pre-Socratic period) میں کسی مفکر کے بارے میں یہ نہیں ملتا (الا قدیم یونانیوں کی دیو مالا کے) کہ وہ "تالہ" کا قائل تھا۔ خدا جانے حکمار اسلام کو یہ حکایت کہاں سے ملی۔ متاخرین میں ملا محمود جونپوری "تالہ زمان" (زمانہ کے قدیم اور واجب الوجود ہونے کے عقیدے) کو اوائل حکمار یونان (قبل نفیج الحکمۃ") ہی کی طرف منسوب کرتے ہیں[2]۔

(ب) ناصر خسرو نے لکھا ہے کہ اس باب میں رازی کا استاد ابو العباس ایرانشہری تھا رازی نے اسی کا اتباع کیا ہے:۔

---

(۱) "فرق بین الزمان وبین المدۃ بوقوع العدد علی احدہما دون الآخر" کتاب الھند صفحہ ۱۶۳ یہ تدقیق پڑھنے کے بعد برگساں (اور اس کی تبعیت میں علامہ اقبال) کی تدقیق کا خیال جاتا ہے جو انھوں نے پیمائشی زمان (Serial time) اور "زمان خالص" (Duree Reele) میں کی ہے۔

(۲) چنانچہ ملا محمود نے "شمس البازغہ" (صفحہ ۱۶۵) میں زمانہ کے باب میں مرجوح مذاہب کو اوائل حکمائے یونان (قبل سقراطی دور کے مفکرین) کی اپج بتایا ہے اور لکھا ہے:

"کانت لہم فی الزمان قبل نفیج الحکمۃ ظنون تفریط وافراط فالمفرطون فیہ منہم من نفاہ راسا ..... واما المفرطون فمنہم من جعلہ واجباً لامتناع العدم علیہ لذاتہ" شمس بازغہ صفحہ ۱۶۵

"نفیج حکمت" (حکمت و فلسفہ کی پختگی) ارسطو کے زمانہ میں ہوئی تھی۔

"قول دوم اندر زمان۔ از حکما آں گروہ کہ گفتند ہیولیٰ و مکان قدیمان اند و مر زمان را جوہر نہادند ...... و حکیم ایران الشہری گفتہ است کہ زمان و دہر و مدت نامہائے است کہ معنی آں از یک جواہر است۔ و زمان دلیل علم خدائے است چناں کہ مکان دلیل قدرت خدای است و حرکت دلیل فعل خدای است و جسم دلیل قوتِ خدائی است و ہر یک ازیں چہار بے نہایت و قدیم است ..... و قومے کہ محمد زکریا گفت کہ بر اثر ایران الشہری رفتہ است ہمیں است کہ گوید زمان جوہر گزرندہ است "(۲)

اس کے بعد اُس نے ابوبکر زکریا رازی کے قول کی سخافت کی مزید توضیح

"بیان سبب کہ این سخن محمد زکریا دارد (۳)

کے عنوان سے کی ہے۔

اِس کتاب میں حکیم ناصر خسرو رازی کی تو مذمت کرتا ہے۔ مگر اس کے استاد حکیم ابوالعباس ایران الشہری کی بڑی مدح سرائی کرتا ہے۔ اگرچہ دونوں کو "اصحاب الہیولیٰ" (Naturalists) میں شمار کرتا ہے اور کہتا ہے:۔

"اصحاب ہیولیٰ چوں ایران الشہری و محمد زکریائے رازی و غیر از ایشاں گفتند کہ ہیولیٰ جوہرے قدیم است "(۴)

---

(۱) "حکیم ایران الشہری کے حالات نہیں ملتے۔ البیرونی نے صرف اتنا لکھا ہے کہ اس نے ۲۵۹ھ میں ایک سورج گہن کا مشاہدہ کیا تھا جس میں سورج کا اندرونی حصہ تو گہنا گیا تھا۔ مگر کناروں کا حلقہ روشن رہا تھا۔ چناں چہ وہ "قانون مسعودی" میں لکھتا ہے:

"کسوف الشمس غداہ یوم الثلاثاء التاسع والعشرین من شہر رمضان سنۃ تسع وخمسین ومائتین للھجرۃ ..... وشاہدہ ابو العباس الایرانشہری وہو من مدققی المحصلین وذکر ان جرم القمر توسط جرم الشمس فاستدار النور حولہ من القطعۃ الباقیۃ من الشمس غیر منکسف "(القانون المسعودی الجزء الثانی صفحہ ۶۳۲)

(۲) زاد المسافرین از حکیم ناصر خسرو صفحہ ۱۱۔ (۳) ایضاً صفحہ ۱۱۶ (۴) ایضاً صفحہ ۷۳

مگر وہ ایرانشہری کی فکری کاوش کی تعریف کرتا ہے کہ:-

"حکیم ایرانشہری کر معنیہائے فلسفی را بالفاظ دینی عبارت کردہ است اندر کتاب جلیل وکتاب اثیر و جزآن - مردم را بردین حق وشناخت، توحید بعث کردہ است۔"(۱)

اور رازی کی بڑی شدت سے برائی کرتا ہے کہ اس نے الفاظ و مفاہیم کو مسخ کر دیا ہے:-

"پس از وچون محمد زکریا کہ مرقولہائے ایرانشہری را بالفاظ زشت ملحدانہ باز گفتہ است و معنیہائے استاد و مقدم خویش را اندریں معانی بعبارتہائے موحش و مستنکر گزاردہ است۔"(۲)

آگے چل کر لکھتا ہے:-

"درزشت کردن محمد زکریا مرایں قول نیکورانہ چنان است کہ گفت است قدیم پنج است کہ ہمیشہ بودند و ہمیشہ باشند:-
یکے خدائی دو دیگر نفسی سہ دیگر ہیولی چہارم مکان پنجم زمان - و زشت گوئے ازاں باشد کہ مرخالق را با مخلوق اندر یک جنس شمرد - تعالی اللہ عما یقول الظالمون علواً کبیرا۔"(۳)

(ج) آخری تصریح امام فخر الدین رازی کی ہے جو محمد بن زکریا الرازی کے مذہب کو قدیم "حرنانیت" کی تجدید و احیا بتاتے ہیں۔ حرنانیہ غالباً صابئہ حران کا نام ہے چنانچہ ابن الندیم فرقۂ مغتسلہ کے بارے میں لکھتا ہے۔

"ھؤلاء القوم کثیرون بنواحی البطائح وھم صابۃ البطائح"(۴)
(یہ لوگ نواحی بطائح میں بکثرت آباد ہیں اور یہی 'صابہ البطائح' ہیں)

---

(۱) زاد المسافرین ص ۹۸ ‏ ‏ ‏ ‏ (۲) ایضاً صفحہ ۹۸
(۳) ایضاً ص ۹۸ ‏ ‏ ‏ ‏ (۴) کتاب الفہرست صفحہ ۴۷۷

اور آگے چل کر ان "صابئۃ البطائح" کی مزید تحقیق کرتا ہے :۔

"حکایۃ اخری فی امر صابئۃ البطائح ۔ ھؤلاء القوم علی مذھب النبط القدیم یعظمون النجوم ولھم امثلۃ واصنام وھم عامۃ الصابئۃ المعروفین بالحرنانیین "(۱)

(حکایت دیگر درباب صابئۃ البطائح : یہ لوگ قدیم نبطیوں کے مذہب کے پیرو ہیں۔کواکب کی تعظیم کرتے ہیں ۔ ان کے یہاں تمثال و اصنام ہوتے ہیں۔ یہی لوگ عام صابئی ہیں جو حرنانیوں کے نام سے معروف ہیں)

اس قیاس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ فرقہ باطنیہ کا پہلا علمبردار محمد بن الحسین زیدان قدمارخمہ کے اثبات کا دین رکھتا تھا جو امام رازی کے قول کے مطابق عین "حرنانیت" ہے اور امام عبدالقاہر بغدادی نے "کتاب الفرق بین الفرق" میں باطنیت کے اہم ماخذوں میں سے ایک اہم ماخذ "حرانی صابئیت" کو بتایا ہے اور اس کے ثبوت میں دلائل دئے ہیں۔ ان میں سب سے اہم دلیل یہ ہے کہ حمدان قرمط جو اگرچہ محمد بن الحسین زیدان اور عبداللہ بن میمون القداح سے متاخر تھا، لیکن اس تحریک کا اہم ترین ستون ہے، جس کی اسلام بیزاری و مسلم آزادی کی رونگٹے کھڑے کر دینے والی داستانوں سے تاریخ کے صفحات معمور ہیں، یہ حمدان قرمط حران ہی کا باشندہ تھا ۔ چنانچہ امام عبدالقاہر بغدادی نے لکھا ہے :۔

"ومنھم من نسب الباطنیۃ الی الصابئین الذین ھم بحران واستدل علی ذلک بان حمدان قرمط داعیۃ الباطنیۃ بعد میمون بن دیصان کان من الصابئۃ الحرانیۃ "(۲)

---

(۱) کتاب الفہرست صفحہ ۴۴۲

(۲) الفرق بین الفرق للامام عبدالقاہر البغدادی صفحہ ۲۷۲

(اور بعض لوگ باطنی مذہب کو صابئین کی طرف منسوب کرتے ہیں جو حران میں رہتے ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ حمدان قرمط جو میمون بن دیصان کے بعد اس تحریک کا داعیٔ اعظم تھا ما یہ حران ہی میں سے تھا۔)

تالہ زمان کے غیر اسلامی مآخذ | یہ ہیں "اثبات قدر ما خمسہ" بالخصوص "تالہ زمان" کے مآخذ ثلثہ، اور تینوں قطعاً غیر اسلامی ہیں۔ خود عہد اسلام میں ان کے قدیم ترین قائلین کے متعلق سنجیدہ اہل الرائے کو الحاد و فکری بیراہ روی کا شکوہ ہے۔ زیدان کو تو ابن الندیم نے کھلا ہوا دشمن بتایا ہے، جس کی زندگی کا مقصد وحید ہی اسلام کی بیخ کنی اور استیصال تھا، چنانچہ وہ اس کے بارے میں لکھتا ہے:۔

"یہ شخص بڑا فلسفی اور علم نجوم کا حاذق تھا نیز کٹر شعوبی بھی تھا جسے اسلامی دولت سے انتہائی بغض و عناد تھا"(۱)

رہا رازی تو اُس کے سوء عقائد کے بارے میں قاضی صاعد کی رائے اوپر مذکور ہو چکی ہے۔

لہذا اسلام کی بنیادی تعلیم یا بعد کی اسلامی فکر میں اس کی تلاش بے سود ہے۔ البتہ عہد ماقبل اسلام کی ذہنی افکار میں اس کا مآخذ بآسانی دریافت ہو سکتا ہے۔ یہ مآخذ خصوصیت سے آریائی اقوام کی تفکیر میں ملتا ہے۔ اگرچہ کسی طرح اُن سے متاثر ہو کر عرب جاہلیت میں بھی اس عقیدے (تالہ زمان) نے اپنے معتقدین پیدا کر لئے تھے۔

عہد قدیم میں آرین قوم کے تین اہم گہوارے تھے: ایران، یونان اور ہندوستان اور "تالہ زمان" کا تصور تینوں کے یہاں ملتا ہے اور اُن میں بھی خصوصیت سے مجوسی ایران میں۔ چنانچہ مارٹن ہوگ دمسقیوں کے حوالے سے ارسطو کے شاگرد ایوڈیموس سے نقل کرتا ہے:

---

(۱) وکان ہذا الرجل متفلسفاً حاذقاً بعلم النجوم شعوبیاً شدید البغض من دولۃ الاسلام۔
کتاب الفہرست لابن الندیم صفحہ ۲۶۱

"سب سے پہلا یونانی مصنف جو اس بات کا حوالہ دیتا ہے دمسقیوس ہے۔ وہ اپنی کتاب مبادی اولیہ (صفحہ ۳۸۴) میں لکھتا ہے۔

کہ مجوسی اور تمام دوسری آریائی قومیں، جیسا کہ ایوڈیموس لکھتا ہے، بعض مکان کو اور بعض زمان کو علّت کلیہ (علت اولی) سمجھتی تھیں جس سے اچھے اور نیک دیوتا نیز شریر ارواح پیدا ہوئیں۔" (۱)

زمانہ پرستی ایران میں | یوں تو قسام ازل نے اصنام خیالی کے اختراع و تراش کی صلاحیت سبھی آریائی اقوام کی طباعی میں ودیعت فرمائی تھی، مگر "تالہ زمان" کا عقیدہ خصوصیت سے ایران میں پروان چڑھا۔ چنانچہ مارٹن ہوگ نے آریائی اقوام میں سے مجوسیوں کی اس باب میں خصوصیت سے تصریح کی ہے۔ اس سے زیادہ واضح صراحت کرسٹن سین نے "ایران بعہد ساسانیان" میں کی ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔

"ایک نہایت قدیم ایرانی عقیدے کے مطابق جس کے کچھ دھندلے سے آثار گاتھاؤں میں باقی رہ گئے ہیں، خدائے خیر اور خدائے شر توام بھائی تھے جو زمان نامحدود (زُروان یا زروان) کے بیٹے تھے۔" (۲)

دوسری جگہ وہ اس کی تفصیل میں لکھتا ہے:۔

"اوستا کے باب گاتھا (یسنا ۳۰-۳۰) میں روح خیر اور روح شر کے متعلق

---

(1) "The first Greek writer who alludes to it is Damascius. In his book, On Primitive Principle (12th p. 384 ed Kopp) he says. "The Magi and the whole Aryan nations consider, as Eudemos writes, some Space, and others Time as the universal cause out of which the good God as well as the evil spirits were separated." (Martin Haug: Essays on the Sacred Language, Writings and Religion of the Parsis, P. 12).

(۲) ایران بعہد ساسانیان از کرسٹن سین صفحہ ۳۶

لکھا ہے کہ وہ دو ابتدائی روحیں ہیں جن کا نام تو آمان اعلیٰ ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ زرتشت نے ایک قدیم تر اصل کو جو ان دونوں روحوں کا باپ ہے، تسلیم کیا ہے۔ ارسطو کے ایک شاگرد ایوڈیموس کی ایک روایت کے مطابق ہخامنشیوں کے زمانہ میں اس خدائے اولین کی نوعیت کے بارے میں بہت اختلاف تھے۔ بعض اس کو مکان (تھواش بزبان اوستائی) سمجھتے تھے اور بعض اس کو زمان۔ (زروان بزبان اوستائی و زُروان یا زَروان بزبان پہلوی) تصور کرتے تھے۔ بالآخر دوسرا عقیدہ غالب آیا اور اس زروانی عقیدہ کو متھرا پرستوں نے بھی اختیار کرلیا تھا(۱)

زروانیت (زمانہ پرستی) کو یہ قبولِ عام نصیب ہوا کہ ایک مستقل مذہب کی حیثیت کے علاوہ اُسے نہ صرف "متھرا پرستوں نے بلکہ دوسرے بدعتی مذاہب بالخصوص شیطان پرستوں (انگرہینو یا اہرمن کے ماننے والوں) نے بھی اختیار کرلیا۔(۲)

مگر چوتھی صدی قبل مسیح کے آخر میں ہخامنشی سلطنت (شاہنامہ کے کیانی خاندان کی حکومت) سکندر کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوگئی اور پورے ملک میں طوائف الملوکی کا دور دورا شروع ہوا جو تیسری صدی مسیحی تک جاری رہا۔

تیسری صدی مسیحی میں ساسانی خاندان نے ایران میں ایک منظم سلطنت قائم کی۔ انہوں نے قومی اتحاد و یک جہتی اور ملکی استحکام کے پیش نظر "مزدائیت" (متعارف مجوسیت) کو سرکاری اور قومی مذہب بنایا۔ لہٰذا فطرتاً دیگر مذاہب ماند پڑ گئے۔

---

(۱) ایران بعہد ساسانیان از کرسٹن سین صفحہ ۱۹۵-۱۹۹

(۲) ایران بعہد ساسانیان صفحہ ۱۹۵-۱۹۶

تبصرے

مکاتیب گیلانی: مرتبہ مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی۔ تقطیع خورد ضخامت چارسو صفحات۔ کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد درج نہیں۔ پتہ: خانقاہ رحمانیہ مونگیر (بہار)

مولانا سید مناظر احسن گیلانی مشہور عالم، اسلامیات کے محقق اور بلند پایہ مصنف تھے۔ بہت سی چھوٹی بڑی تصنیفات اور بیسیوں مقالات و مضامین کے علاوہ مولانا کے خطوط بھی علمی، ادبی، یا دینی واخلاقی رموز ونکات پر مشتمل ہوتے تھے اس لیے ضرورت تھی کہ ان خطوط کو بھی جمع کر کے شائع کیا جائے لیکن ان کا برصغیر ہند وپاک کے دور دراز گوشوں سے فراہم کرلینا جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ فاضل مرتب نے کوہ کنی کا حق ادا کر دیا، آپ نے خطوط کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع کرلیا ہے جو کئی جلدوں میں سما سکیں گے یہ سلسلہ کی پہلی جلد ہے۔ اور ستاسی خطوط پر مشتمل ہے۔ چند اعزا واقربا کے نام خطوط کے علاوہ جو زیادہ تر نجی اور ذاتی احوال وتاثرات کے ترجمان ہیں۔ اکثر وبیشتر خطوط میں غم جانان اور غم روزگار کے سلسلہ میں ایک خاص انداز سے جو باتیں کہی ہیں بڑی موثر ہیں۔ مولانا کو اپنے ذ ھب کی تفسیر قرآن کا بڑا ذوق تھا۔ وہ ان خطوط میں بھی نمایاں ہے۔ جو لوگ ان سے واقف ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اس قدر علم وفضل کے باوجود وہ عام بات چیت اور مراسلت میں کسی شخص یا کسی امر کے متعلق اپنی رائے کے اظہار میں بعض اوقات اعتدال وتوازن کی حد سے متجاوز ہوجاتے

تھے۔ مولانا کی اس افتادِ طبع اور مزاجی خصوصیت کے نمونے اس مجموعہ میں بھی موجود ہیں۔ لیکن جو بات بھی کہتے تھے۔ کمالِ خلوص اور جذبے سے کہتے تھے اور اس میں بھی ایک تیکھا پن ہوتا تھا۔ اس لیے سامعین یا مخاطبین بُرا ماننے کے بجائے اس پر قہقہہ لگا دیتے تھے۔ ان خطوط سے مولانا کے ذاتی اخلاق و شمائل اور رجحانات و میلانات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی نے ان خطوط کو بڑے سلیقہ اور محنت سے مرتب کیا ہے۔ مولانا عبدالباری صاحب ندوی کے خطوط کو مستثنیٰ کرکے جن پر موصوف نے خود بہت اچھے اور معلومات افزا نوٹ لکھے ہیں۔ باقی سب خطوط میں جن اشخاص و افراد اور مقامات یا کتب و مجلات و رسائل کے نام آئے ہیں۔ ان سب پر مولانا رحمانی نے مختصر مگر جامع اور مفید نوٹ لکھے ہیں۔ جن کے باعث کتاب کی افادیت دو چند ہوگئی ہے۔ کتاب کے شروع میں مولانا عبدالباری صاحب ندوی نے اپنے جدید اندازِ نگارش میں ایک طویل مقدمہ بھی لکھا ہے جس میں قاعدہ کے مطابق خطوط کی خصوصیات اور ان کی اہمیت سے تو کوئی تعرض بالکل نہیں کیا گیا ہے البتہ دیرینہ اور طویل رفاقت و معیت کے باعث مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے بعض طبعی خصائص پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس سلسلہ میں مولانا مرحوم کی نسبت بعض ایسے فقرے بھی مقدمہ نگار کے قلم سے ٹپک پڑے ہیں جو راقم الحروف کی طرح مولانا کے دوسرے ارادتمندوں کے لیے سخت ناگواری کا باعث ہوں گے۔ عقل اور محبت بھی تو دو چیزیں انسانیت کے جوہر ذاتی ہیں۔ جب یہ نہیں ہیں تو پھر رہ کیا گیا۔ مقدمہ نگار نے مولانا کو ان دونوں صفات سے عاری یعنی صفر۔ قرار دیا ہے (ص ۵۳۔ ۵۵) حالانکہ یہ دونوں بیانات صرف مبالغہ آمیز نہیں۔ بلکہ خلاف واقعہ اور اصلیت سے دور ہیں اور اس کے لیے شواہد و دلائل موجود ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ مقدمہ نگار نے محبت ایسی شے لطیف سے

مولانا کی اہلیہ کو بھی خالی قرار دیا ہے۔ تو گویا ندوی صاحب کے نزدیک محبت وہی ہے جو دکھا کے کی جائے اور جوش نے جو یہ کہا ہے وہ غلط کہا ہے۔

ظاہری صاحب سلامت اور ہے
جو رہے دل میں وہ الفت اور ہے

بہر حال مجموعہ مکاتیب بہت دلچسپ اور مفید ہے۔ امید ہے اربابِ ذوق اس کی قدر کریں گے۔

اختلاف الائمہ :۔ از شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہ العالی۔
تقطیع خورد۔ ضخامت ۴۸ صفحات۔ کتابت و طباعت بہتر۔ قیمت ۵۰/۱
پتہ : کتب خانہ اشاعت العلوم۔ محلہ مفتی۔ سہارنپور

یہ اگرچہ ایک مختصر رسالہ اور وہ بھی ناتمام ہے۔ لیکن نہایت بصیرت افروز اور اہم ہے، کثرتِ مطالعہ و درس اور پھر کمالاتِ روحانی و باطنی کے باعث قرآن و حدیث کے علوم و فنون اور شریعت کے اسرار و غوامض حضرت موصوف کے رگ و ریشہ میں اس طرح رچ بس گئے ہیں کہ اچانک بے تکلف جو تقریر فرماتے یا کچھ لکھتے یا املا کراتے ہیں وہ بھی علم دین کا گنجینۂ اسرار و معانی ہوتا ہے۔ چنانچہ اس رسالے کا حال بھی یہی ہے۔ اسے قلم برداشتہ لکھا گیا ہے اور موضوع ہے ائمہ فقہا کا اختلاف اور اس کے اسباب و وجوہ۔ اگرچہ اس موضوع پر حضرت شاہ ولی اللہ۔ اور دوسرے حضرات نے بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن اس رسالہ کی کی بات ہی کچھ اور ہے، معلومات اور اسرار و حکم کا ایک سمندر ہے جو حسن و تعبیر و تفہیم کی تند و تیز ہواؤں سے پرشور ہوگیا اور صفحہ قرطاس پر مچل پڑا ہے اس کی خوبی کا اندازہ پڑھے بغیر ہو ہی نہیں سکتا۔ علماء اور طلباء کو اس کا مطالعہ خاص طور پر کرنا چاہیے۔

یۃ الایمان (عربی) از: مولانا عبدالوحید الرحمانی۔ تقطیع خورد۔ صفحات ۲
ت جلی اور روشن ۔ پتہ :۔ مکتبہ جامعہ سلفیہ پوسٹ بکس ۱۹ بنارس (یو۔پی)
مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ کا رسالہ تقویۃ الایمان ایک نہایت اہم اور بہت
ور رسالہ ہے۔ حضرت شہیدؒ نے یہ رسالہ ان بدعات اور مشرکانہ رسوم وطرق
د میں لکھا تھا۔ جن میں اس زمانہ کے مسلمان بری طرح مبتلا تھے۔ چنانچہ
قرآن و حدیث کی روشنی میں کلام کرکے یہ واضح کیا گیا ہے کہ اسلام میں
دہ توحید کے کیا معنی ہیں، اور مسلمان بدقسمتی سے اپنی جہالت و نادانی کے
ث اصل توحید سے کس قدر دور جا پڑے ہیں۔ اصل رسالہ اردو میں تھا۔
ں کا عربی ترجمہ ہے جو سہل اور سلیس، اور رواں دواں ہے۔ شروع
مولانا مقتدیٰ حسن الاعظمی کے قلم سے ایک مقدمہ ہے جس میں حضرت
ہیدؒ کے سوانح حیات اور اس زمانہ کے مسلمانوں کے معاشرتی حالات
کرہ ہے۔ عربی ترجمہ سے یہ فائدہ ہوگا کہ عرب بھی اس متاع ہند
سے مستفید ہو سکیں گے۔

یا :۔ { اسلام سے پہلے / اسلام کے بعد } از مولانا عبدالسلام قدوائی
تقطیع خورد۔ ضخامت ۱۲۸ صفحات۔ کتابت وطباعت
۔ قیمت : ۲/۷۵۔ پتہ :۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵
یہ کتاب اگرچہ بقامت بہتر ہے۔ لیکن بقیمت بہتر ہونے میں شبہ نہیں۔ جیسا کہ نام
ظاہر ہے۔ کتاب کے پہلے حصہ میں مستند حوالوں کی روشنی میں یہ بتایا
۔ اسلام سے قبل دنیا کے سماجی، اخلاقی، معاشی اور مذہبی حالات
تھے۔ اور اسلام کے بعد ان میں اچانک کیا تبدیلی پیدا ہوئی۔ اور

دُنیا کیسے کیا ہوگئی ۔ ظاہر ہے یہ ایک پیش پا افتادہ اور فرسودہ مضمون ہے ۔ جس پر سیکنڑوں ہزاروں کتابوں میں گفتگو کی گئی ہے ۔ لیکن اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ زبان بہت شگفتہ ، عبارت قلَّ و دلَّ ۔ حشو و زوائد سے پاک ۔ اور حوالے مستند! اس اعتبار سے یہ کتاب اس لائق ہے کہ عوام بھی اسے دلچسپی سے پڑھ سکتے ہیں اور اسے اسکولوں اور کالجوں کے نصابِ دینیات و اسلامیات میں بھی شامل کرسکتے ہیں۔

کیا یہ کہنا ٹھیک ہے کہ زیادہ بچّے ہوں تو مستقبل میں آمدنی بھی زیادہ ہوگی ؟

اکثر کہا جاتا ہے کہ ہر بچّہ اپنے ساتھ دو ہاتھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ آدمی کھاتا پیتا تو ساری عمر ہے لیکن خوراک پیدا کرنے کا کام زندگی کے کچھ حصّے میں ہی کر سکتا ہے۔

نئے طریقوں سے ہم پیداوار بڑھا سکتے ہیں لیکن ان طریقوں کے استعمال کے لئے بہتر تعلیم اور مہارت کی ضرورت ہے۔

ایک تعلیم یافتہ شخص زندگی میں بالآخر زیادہ کامیاب رہتا ہے۔

اگر آپ کے زیادہ بچّے ہوں گے تو آپ کو اُنھیں اچھی تعلیم اور بہتر خوراک دینے میں دقت پیش آئے گی۔

محدود تعداد میں پڑھے لکھے اور صحت مند بچے زیادہ تعداد میں اَن پڑھ اور کمزور بچوں کی نسبت زیادہ کما سکیں گے۔

No. D. [illegible] JANUARY

Phone : 262815

سالانہ قیمت دس روپے

فی پرچہ ایک روپیہ

حکیم مولوی محمد ظفر احمد پرنٹر و پبلشر نے یونین پرنٹنگ پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر برہان سے شائع کیا

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتب

سعید احمد اکبر آبادی

برہان دہلی

جلد ۷۰	ماہ محرم ۱۳۹۳ھ مطابق فروری ۱۹۷۳ء	شمارہ ۲

نظرات

ابھی حال میں اتر پردیش اُردو اکاڈمی نے تریسٹھ ہزار روپیہ کے انعامات اُردو زبان کے مصنفوں اور ان کی معینہ تصنیفات پر تقسیم کیے ہیں، اس کا یہ فائدہ تو ضرور ہوگا کہ اُردو کے اہلِ قلم اور ادیب جو مجموعی طور پر ہندوستان کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے بالمقابل غریب اور قلیل المعاش ہیں ان کی حوصلہ افزائی ہوگی، لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اُردو اکاڈمی نے انتخاب اور اس کے لیے ایک خاص رقم کا تعین کس اصول پر کیا ہے: انعام کی رقم دو ہزار سے پانچ سو اور ساڑھے چار سو تک ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اہلِ نظر کی نگاہ میں دو ادیب ایک ہی مرتبۂ و مقام کے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ایک کو اعلیٰ انعام ہے اور دوسرے کو ادنیٰ، اسی طرح جن کتابوں پر انعام دیا گیا ہے ان میں بعض کتابیں ان کتابوں سے کم درجہ کی ہیں جن کا اس فہرست میں کہیں نام بھی نہیں ہے، اُردو اکاڈمی کی یہی بے ضابطگیاں ہیں جن پر بعض اخبارات (انگریزی اور اُردو) میں سخت احتجاج کیا گیا ہے اور بعض ادیبوں نے تو انعام کی رقم کو اپنی توہین سمجھ کر اس کے قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

علاوہ ازیں اکاڈمی انعام کے امیدواروں سے ایک فارم بھر کراتی ہے جس

امیدوار کو اقرار کرنا پڑتا ہے کہ اس کو کسی ادارہ کی طرف سے اس کتاب پر کوئی انعام نہیں ملا ہے اور فارم کو پُر کرنے کے ساتھ آٹھ کاپیاں بھی اپنی کتاب کی اکاڈمی کو بھیجنی ہوتی ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ طریقہ بھی سخت نامناسب اور نادرست ہے، کیونکہ جو اونچے درجے کے ادیب اور شاعر ہیں اور ساتھ ہی خوددار بھی وہ اس بات کو اپنے فن کی توہین سمجھتے ہیں کہ انعام کے امیدواروں کی صف میں جاکر کھڑے ہوں اور اس کے لیے وہ باقاعدہ درخواست پیش کریں پھر ایک مصنف کو اپنی کتاب کے آٹھ نسخے بیک وقت مفت دے دینا بھی ہر وقت آسان نہیں ہوتا، اس بنا پر اگر اکاڈمی کا مقصد سچ مچ اُردو کی خدمت کرنا اور اس کے ادیبوں اور شاعروں کی ہمت بڑھانا ہے تو اس کو انعامات کے لیے اپنے ہاں کے قواعد وضوابط پر فراخ حوصلگی سے نظرثانی کرنی چاہیئے۔

افسوس ہے گزشتہ مہینہ مسلمانوں کی بعض نمایاں شخصیتیں ہم سے جدا ہوگئیں۔ سیّد عبدالرحمٰن صاحب تھنگل آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر تھے۔ سابق صدر مسلم لیگ محمد اسماعیل صاحب مرحوم نے اس جماعت کا جو وقار اور مرتبہ جنوبی ہند میں قائم کردیا تھا۔ سیّد عبدالرحمٰن صاحب تھنگل نے نہ صرف اسے قائم رکھا۔ بلکہ بعض حیثیتوں سے اس میں اضافہ کیا وہ نہایت سوجھ بوجھ اور فہم وتدبّر کے سیاست دان تھے۔ حکومت اور دوسری سیاسی پارٹیاں بھی ان کی لیاقت و قابلیت اور بلند کردار کی معترف تہیں ان کی دینداری کا ثبوت اس سے بڑھکر اور کیا ہوسکتاہے کہ ان کی وفات حج سے فراغت کے بعد ہوئی اور ان کا جسدِ خاکی سرزمین قدس کی امانت بن گیا، یہ وہ موت ہے جس پر زندگی کو بھی رشک آتا ہے: اللہ تعالیٰ ان کے مدارج ومراتب بلند فرمائے۔

مولانا عبداللطیف نعمانی ایک مشہور عالم اور صاحب درس وتدریس بزرگ تھے ایک مدت سے مئو۔ ضلع اعظم گڑھ کے مدرسہ مفتاح العلوم میں شیخ الحدیث کے عہدہ پر فائز تھے۔

اگرچہ سیاست کا میدان بھی ان کے تگ و تاز سے محروم نہیں رہا، لیکن ان کا عمر بھر کا مشغلہ درس و تدریس تھا۔ علوم دینیہ کے علاوہ منطق اور فلسفہ میں بھی ان کو بڑا کمال تھا۔ سینکڑوں طلباء ان کے فیضِ تعلیم و تربیت سے مستفیض ہوئے۔

عبد القیوم صاحب انصاری بہار کے مشہور نیشنلسٹ اور قومی کارکن تھے۔ انھوں نے قید و بند کے مصائب بھی برداشت کئے اور تحریکِ پاکستان کے زمانہ میں اپنوں کے ہدف ملامت بھی بنے۔ لیکن ان کے پائے استقلال میں کوئی لغزش نہیں آئی۔ وہ بہار گورنمنٹ میں وزیر تھے لیکن ان کا طور طریق بالکل عوامی تھا۔ ان کی زندگی ارباب حاجت کی مدد کے لیے وقف تھی۔ چنانچہ ان کی وفات بھی خدمت کرتے ہوئے ہی واقع ہوئی۔ سیاسیات میں غایت درجہ انہماک کے باوجود نماز روزہ کے پابند اور بڑے خلیق اور متواضع تھے۔

غلام احمد صاحب فرقت اُردو زبان کے بڑے اچھے نثر نگار اور شاعر تھے۔ انہوں نے طنز نگاری کا ایک دلکش اسلوب پیدا کیا تھا۔ جس میں قومی اور وطنی معاملات و مسائل پر بہت دلچسپ اور معنی خیز تبصرہ کر جاتے تھے۔ اس اعتبار سے اگر ان کو اردو نثر کا اکبر الٰہ آبادی کہا جائے تو بجا ہے۔ ان کے نگارشات کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی موت بڑی حسرت ناک ہوئی۔ ریل میں سفر کر رہے تھے کہ دل کا دورہ ہوا اور وہیں ختم ہو گئے، اللہ تعالیٰ ان سب مرحومین کو مغفرت و بخشش کی نعمتوں سے نوازے۔

علی گڈھ مُسلم یونیورسٹی

(۸)

یونیورسٹی کی تحریک

از:- سعید احمد اکبرآبادی

یونیورسٹی کی تحریک:-

جیساکہ شروع میں ہی عرض کیا جا چکا ہے۔ سرسید کا اصل ارادہ اور عزم یونیورسٹی قائم کرنے کا ہی تھا۔ لیکن اس کی صورت پیدا نہ ہو سکی تو فوری طور پر کالج پر قناعت کرلی، عربی کا مشہور مقولہ ہے؛ مالا یدرک کلہ، لا یترک کلہ‘۔ لیکن یونیورسٹی کا خیال ان کے دماغ سے کبھی نہیں نکلا۔ چنانچہ ان کے جانشین نواب محسن الملک کے عہد میں بھی اس کا چرچا ہوتا رہا۔ نواب وقار الملک کے عہد میں یونیورسٹی کی باقاعدہ تحریک بڑے جوش و خروش اور ولولہ و امنگ سے شروع ہوگئی،

ہماری موجودہ نسل تو اس بات کا اندازہ کرہی نہیں سکتی کہ اس ایک یونیورسٹی کے قیام کی خاطر ان کے بزرگوں نے کیا کیا خونِ جگر پیا اور اس راہ میں انھوں نے کیسے کیسے پاپڑ بیلے اور ہفتخوان طے کیے ہیں۔ اس داستان کا حرف حرف آج کل کے مسلمانوں کے لیے سرمایۂ عبرت و موعظت ہے۔

گاہے گاہے باز خواں این قصۂ پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را

اس راہ میں سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ یونیورسٹی گورنمنٹ کی منظوری اور اس کے چارٹر کے بغیر قائم نہیں ہو سکتی تھی اور گورنمنٹ کو "مسلم یونیورسٹی" نام سے بھی وحشت ہوتی اور وہ اسے خطرناک سمجھتی تھی، لیکن علی گڑھ کالج سے وابستہ مسلمانوں کو اس پر اصرار تھا کہ یونیورسٹی ہوگی تو مسلم یونیورسٹی ہوگی۔ ورنہ یوں ہونے کو تو ملک میں اور بھی بہت سی یونیورسٹیاں ہیں، حکومت کی طرف سے بار بار انکار ہوتا تھا اور مسلمانوں کی طرف سے اصرار! آخر ایک طویل کشمکش کے بعد جب بنیادی طور پر نام کا مرحلہ طے ہوگیا۔ تو اب یونیورسٹی کے قیام کے لیے دو چیزیں ضروری تھیں۔ ایک تیس لاکھ روپیہ کے فنڈ کی فراہمی اور دوسری وہ شرائط جو اس سلسلہ میں حکومت اور مسلمانوں کے درمیان طے ہوں۔

یونیورسٹی فنڈ کی فراہمی | پہلا مرحلہ فنڈ کی فراہمی کا تھا۔ ظاہر ہے اس زمانہ میں مسلمانوں کی عام اقتصادی حالت کے پیش نظر اتنی بڑی رقم جو آج دو کروڑ سے کم نہیں ہے اس کا فراہم کرلینا اور وہ بھی دو تین برس کے اندر اندر! جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا، لیکن مسلمانوں نے اللہ کا نام لیکر کمر ہمت باندھ لی اور فیصلہ کرلیا کہ یہ کام بہر حال کرنا ہی ہے۔ اور وہ بھی کس طرح؟ ایک ہم ہیں کہ دریوزہ گری کو اپنا شعار بنالیا ہے۔ اور بات بات پر بھیک کا دامن پھیلاتے شرم نہیں آتی۔ اور ایک ہمارے یہ بزرگ تھے جن کے نزدیک اپنے قومی و ملی کام کے لیے غیروں سے روپیہ مانگنا سخت ننگ و عار تھا۔ چنانچہ سر آغا خاں جنھوں نے مسلم یونیورسٹی کے قیام میں بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ اپنی خود نوشت سوانح عمری (MEMOIRS OF AGAKHAN) میں لکھتے ہیں :۔

"میں نے سرسید اور محسن الملک سے جوانی کے جوش میں کہا کہ ہم کیوں نہ مسٹر راک فیلر یا مسٹر کارنیگی کی طرح کے امریکی مخیر حضرات سے مل کر اس کے لیے امداد طلب کریں، لیکن میرے نئے دوست (سرسید اور محسن الملک) سن رسیدہ اور دور اندیش تھے۔ اس لیے انہوں نے کہا:۔ "یہ خود ہماری ذمہ داری ہے، ہندوستان کے چھیاسٹ

کروڑ مسلمان اس کام کو بخوبی کر سکتے ہیں، اگر ہم بیرونی امداد حاصل کریں گے تو ہمیشہ کے لیے ہماری عزت خاک میں مل جائے گی، میں نے ان کے اس معقول خیال سے اتفاق کیا۔

سر آغا کی جدوجہد | اس عظیم فنڈ کی فراہمی کا سہرا زیادہ تر سر آغا خاں کے سر ہے۔ قدرت کو جب کوئی چیز منظور ہوتی ہے تو غیب سے اس کے اسباب بھی ایسے ہی پیدا ہو جاتے ہیں ــ سر آغا خاں ایک بیس بائیس سال کا نوجوان اسماعیلی فرقہ کا پیشوا۔ نہایت دولتمند اور بڑے عیش وعشرت اور آرام کی زندگی کا عادی! ان تمام باتوں کے باوجود ۱۸۹۶ء میں جب پہلی مرتبہ شمالی ہند کا سفر کیا اور علی گڑھ بھی آیا تو سرسید اور محسن الملک کے خلوص عمل اور ان کے قومی و ملی درد سے بیحد متاثر ہوا۔ اور علی گڑھ کالج سے متعلق خود بخود اس کے دل میں یہ جذبہ پیدا ہوا کہ اس کی توسیع وترقی کے لیے جدوجہد کرنی چاہیئے۔ چنانچہ اس جذبہ اور تاثر کا ہی نتیجہ وہ گفتگو تھی جو ابھی اوپر گذری۔ لیکن اس وقت سر آغا خاں کو اپنے دل کی حسرت نکالنے کا موقع نہیں ملا اور بات آئی گئی ہوگئی، اس واقعہ کے ٹھیک بیس برس بعد یعنی ۱۹۱۰ء میں جب مسلم یونیورسٹی تحریک زور شور اور جوش وخروش سے شروع ہوئی تو سر آغا خاں نے اس تحریک کو کامیابی سے ہم کنار کرنے کی جدوجہد کے لیے اپنے آپ کو ہمہ تن وقف کر دیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے جس تگ ودو اور سعی وجہد کا مظاہرہ کیا ہے ہمارے آج کل کے زعمائے قوم کو اس سے سبق لینا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں پہلا مرحلہ فنڈ کی فراہمی کا تھا۔ سر آغا خاں نے اس مرحلہ کے طے کرنے میں کیا رول ادا کیا ہے؟ اسے خود ان کی زبان سے سنیے، لکھتے ہیں۔

> "بنگال اور پنجاب کے مسلمانوں میں ابھی خاصی سیاسی بیداری پیدا ہو چلی تھی، لیکن نہیں اپنا کافی وقت، اپنی توانائی اور دلچسپی سب کچھ علی گڑھ پر مرکوز کئے ہوئے تھا، ہمارا مقصد علی گڑھ کالج کو ایک عظیم مسلم یونیورسٹی میں تبدیل کرنا تھا۔ لیکن ہماری اس تحریک کو ان طاقتور برطانوی عناصر کی مخالفت کا بھی سامنا کرنا پڑا جن کی دلیل یہ تھی کہ مسلمانوں کی الگ یونیورسٹی کا قیام مضر ہوگا۔ اس سے

فرقہ پرستی کو فروغ پانے کا موقع ملے گا۔ میں نے اپنی تمام تقریروں، مضامین اور مالی امداد کے لیے اپیلوں میں اس خیال کی سخت تردید کی ...۔[4]

بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی کی تحریک کو نہایت زور شور اور پوری قوت و انہماک سے شروع کرنے والے سر آغا خاں ہی تھے:

چنانچہ مولوی طفیل احمد صاحب منگلوری لکھتے ہیں:۔

"۱۹۱۰ء میں ہز ہائی نس سر آغا خاں نے نواب وقار الملک کی سکرٹیری شپ کے زمانہ میں یہ تجویز کیا کہ آئندہ سال ملکِ معظم ہندوستان آنے والے ہیں۔ اس وقت تک سرمایہ فراہم کرکے اس (یونیورسٹی) کا چارٹر ملکِ معظم سے حاصل کیا جائے۔ ہز ہائنس سر آغا خاں نے اس تحریک کو بڑے زور سے اٹھایا[1]۔

(مسلمانوں کا روشن مستقبل)

خیال کیجئے! ۱۹۱۰ء میں یہ منصوبہ بن رہا ہے اور ۱۹۱۲ء کے شروع میں دربار منعقد ہونے والا ہے۔ اور اس ایک ڈیڑھ برس کے اندر ہی اندر گورنمنٹ کے مطالبے کے مطابق تیس[30] لاکھ جمع کر لینا ہے۔ بہ ظاہر یہ بڑی انہونی سی بات تھی لیکن انسانی جہد و عمل کی تاریخ میں جنونِ شوق نے اس قسم کے ہزاروں معرکے سر کیے ہیں۔ اب پھر یہ ایک موقع تھا کہ وہ اپنی بے پناہ قوتِ عمل کا مظاہرہ کرے، سر آغا خان نے یہ مہم کیسے سرانجام دی؟ خود ان کی زبان سے سنیئے: لکھتے ہیں:۔

"دوسروں کو اپنا ہم خیال بنانے اور سرمایہ فراہم کرنے کا کام جوئے شیر لانے

---

[1] جیسا کہ سر آغا خاں نے خود لکھا ہے، ڈیوک آف کناٹ جس نے ۱۹۱۲ء میں دہلی دربار کے موقع پر لارڈ کچنر کی سرداری میں چالیس ہزار فوج سے سلامی لی تھی اور جو برطانیہ کا نمائندہ اور ملکِ معظم کا بھائی تھا، وہ سر آغا خاں کا بچپن کا دوست تھا۔

سے کم نہیں تھا، میں نے پورے ہندوستان کی خاک چھانی اور عظیم مسلم لیڈروں نوابوں اور امیروں، راجاؤں اور کسانوں کے سامنے دست طلب بڑھایا۔ خود میں نے ایک لاکھ روپیہ کا عطیہ دیا، یہ رقم اس زمانہ میں بہت بڑی تھی میں ہفتوں سفر میں رہتا، اور ٹرینوں میں ہی کھاتا پیتا اور سوتا، جس جگہ بھی ٹرین رکتی میں پلیٹ فارم پر جمع ہونے والے مسلمانوں کو خطاب کرتا۔ ہر مناسب موقع پر علی گڑھ کے کاز کا تذکرہ کرتا اس پورے سفر میں میرے اعزازی سکریٹری اور دوست تھے مولانا شوکت علی مرحوم تھے، ان کی لگن اور جان توڑ کوششوں کے بغیر میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا"

یونیورسٹی سے سر آغا خاں کی توقعات | اب ذرا یہ بھی معلوم کرتے چلئے کہ آخر وہ کونسا جذبہ اور کیا مقصد تھا جس کے باعث سر آغا خاں ایسی شخصیت نے در در کی خاک چھانی۔ دل۔ دماغ اور جسم کی تمام توانائیاں بازی پر لگادیں، اور عیش وعشرت، راحت وسکون سب تج دیا۔

موصوف لکھتے ہیں:۔

"میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مسلم یونیورسٹی کے علاوہ اور کہاں یہ بات ممکن تھی کہ ہم اپنی دنیا اور اپنے زمانہ کی کل معلومات حاصل کرنے کے لیے لائبریریوں کے ساتھ ہر قسم کے سامان سے آراستہ لیبارٹریاں قائم کرتے، جسے ہم اسلامی عقائد اور تہذیب کا تحقیقی مرکز بناتے اور جہاں ہم اپنے مذہب کے اصولوں، اس کی آفاقیت اور حقیقی جدیدیت، اس کی بنیادی شائستگی اور رواداری کے جذبہ پر عمل کرتے ہوئے، دیگر عقائد کا احترام کر سکتے"

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:۔

"مسلمانوں کو اپنی یونیورسٹی کی ضرورت کے سلسلہ میں ایک میری دلیل یہ بھی تھی کہ یہ یونیورسٹی اسلام کے روحانی اتحاد کو فروغ دینے کا ایک مفید ذریعہ

ذریعہ ہوگی۔ [1]

آپ سمجھے "رُوحانی اتحاد سے سر آغا خاں کی مراد کیا تھی"! اس سے مقصد یہ تھا کہ مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کا ایک ایسا مرکزی ادارہ ہوگا جہاں شیعہ سنی، اسماعیلی، دیوبندی، بریلوی، اہلحدیث، اہلِ قرآن غرض کہ ہر فرقہ اور ہر مکتبِ خیال کے نوجوان مسلمان یہاں ایک ساتھ تعلیم پائیں گے، ایک ساتھ رہیں گے اور اکٹھے بیٹھیں گے تو ان میں باہم میل ملاپ اور اتحاد پیدا ہوگا اور بے شبہ یہ اتحاد اسلام کی ایک بڑی طاقت ہوگا اور مسلمان بحیثیت ایک قوم کے فرقہ بندی کی اس لعنت سے نجات پاجائیں گے جس میں وہ بری طرح مبتلا ہیں اور جس نے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے ارشاد؛ دیکھو گروہ بندی کا شکار مت ہوجانا۔ ورنہ تمھاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ (فَتَذْھَبَ رِیْحُکُمْ) کے مطابق آج ان کو بے وقعت اور سبک بنا دیا ہے ظاہر ہے اس یونیورسٹی سے اسلام کے رُوحانی اتحاد کا یہ مقصدِ عظیم اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جب کہ یونیورسٹی صحیح معنی میں اسلامی تہذیب و ثقافت کا ایک مرکزی ادارہ ہو۔ ورنہ مختلف فرقوں اور مسلکوں کے مسلمان طلبا سیکولر قسم کی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں ایک ساتھ تعلیم پاتے ہی ہیں اس سے یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ سر آغا خاں نے جو بات کہی ہے وہ ایک نہایت اعلیٰ اور بلند نصب العین کی حامل ہے اور اس سے اسلام کی سربلندی سے متعلق موصوف کے جذبۂ بیقرار پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

کمیٹی تکمیل محمڈن یونیورسٹی | اس میں شک نہیں کہ سر آغا خاں نے یونیورسٹی کے قیام کے سلسلے میں بہت اہم رول ادا کیا ہے، لیکن اس سے یہ دھوکا نہ ہونا چاہیے کہ یہ سب کچھ کیا کرایا ایک شخص کا ہی تھا۔ بلکہ یہ تحریک باقاعدہ اور منظم طریقہ پر شروع ہوئی اور سر آغا خان

---

[1] سر آغا خاں کی خودنوشت سوانح حیات اس وقت میرے پیش نظر نہیں ہے اوپر جو اقتباسات ہیں وہ ہمارا ڈائجسٹ کے مسلم یونیورسٹی نمبر سے لیے گئے ہیں۔

کو اس تحریک سے وابستہ کرلینا یہ بھی درحقیقت نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک کا ایک بڑا کارنامہ اور ان کی مردم شناسی کی دلیل ہے۔ ۱۹۱۰ء کے اواخر میں جب کہ سر آغا خاں فرانس میں تھے، نواب وقار الملک نے یونیورسٹی کی تجویز و تحریک سے متعلق ان کو ایک نہایت موثر خط لکھا، سر آغا خاں اس خط سے بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے لکھا کر "جی ہاں! اب وقت آگیا ہے کہ یونیورسٹی کی تحریک بڑی قوت اور زور شور سے شروع کی جائے، اس سلسلہ میں انھوں نے تحریر کیا: میں ۲۰ر دسمبر کو ہندوستان پہونچ جاؤں گا۔ اور اس تحریک کے لیے کام کروں گا۔

اس خط نے سب کے دلوں میں ایک نئی امنگ اور ولولہ پیدا کر دیا۔ چنانچہ اسی سال ماہ دسمبر ناگپور میں ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس ہوا تو اس میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں (جن کا تفصیلی تذکرہ آئندہ اپنے موقع پر آئے گا) ایک نہایت پُرزور تقریر کے ساتھ یونیورسٹی کے قیام کی تجویز پیش کی اور وہ باتفاق آرا منظور ہو گئی لہ

سر آغا خاں اس اجلاس میں شرکت کی غرض سے ناگپور پہونچ گئے تھے۔ لیکن اچانک طبیعت کی ناسازی کے باعث اجلاس میں شریک نہ ہو سکے۔ لیکن کانفرنس کے نام ایک پیغام بھیجا جس کو صاحبزادہ موصوف نے پڑھ کر سنایا۔ اس میں انہوں نے کہا تھا۔

"آئندہ سال ملک معظم تاجپوشی کے لیے ہندوستان آنے والے ہیں۔ لہذا اس موقع سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کو یونیورسٹی قائم کرنی چاہیے، مزید براں انھوں نے کہا: اس مقصد کے لیے تیس لاکھ روپیہ کی ضرورت ہوگی، جن میں سے ایک لاکھ میں دوں گا۔"

اس تجویز کو عملی شکل دینے کے لیے ۱۰ر جنوری ۱۹۱۱ء کو علی گڑھ میں نواب وقار الملک کی کوٹھی

لہ سر آغا خان کے بیان کے مطابق اس اجلاس کی صدارت مسٹر یوسف علی (غالباً عبداللہ یوسف علی انگریزی کے مشہور مترجم القرآن؟) نے کی تھی اور انھوں نے یونیورسٹی سے متعلق "جامعہ" مقاصد کی وضاحت بڑے اچھے انداز میں کی تھی۔

ہوا اور ان کے زیر صدارت ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں یہ طے پایا کہ ایک مستقل کمیٹی اس غرض کے لیے "کمیٹی تکمیل محمڈن یونیورسٹی" کے نام سے قائم کی جائے۔ سر آغا خاں اس کمیٹی کے صدر، متعدد با اثر اور ممتاز اصحاب نائب صدر، نواب وقار الملک سکریٹری اور نواب مزمل اللہ خاں، حاجی محمد موسیٰ خاں، مولانا شوکت علی اور شیخ محمد عبداللہ جوائنٹ سکریٹری منتخب ہوئے، علاوہ ازیں وقار حیات کے مصنف کے بیان کے مطابق ملک کی تمام مشہور و سربرآوردہ انجمنوں اور تعلیم گاہوں کے عہدہ دار اور مجلس انتظامی کے ارکان، نیز تمام اسلامی اخبارات و رسائل کے اڈیٹر، کونسلوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں اور میونسپل بورڈوں کے ممبر اور وکلا، اور بیرسٹر تمام مسلمان زمیندار، تاجر، اور علمار مشائخ یہ سب اس کمیٹی کے ممبر بنائے گئے۔ محمڈن کالج کے رجسٹرار خزانچی ہوئے، اور سرمایہ جمع کرنے کے لیے بنک آف بنگال کو منتخب کیا گیا، نیز ایک مینجنگ کمیٹی کا تقرر عمل میں آیا، اور ساتھ ہی یہ بھی قرار پایا کہ ہر صوبہ میں ایک صوبجاتی کمیٹی مقرر کی جائے جو علی گڑھ کی مرکزی کمیٹی کے ماتحت کام کرے، علاوہ ازیں ایک چھوٹی سی کمیٹی اس مقصد کے لیے ترتیب دی گئی کہ وہ فنڈ کی فراہمی کی غرض سے ملک میں متعدد وفد بھیجے گی اور ان کو ترتیب دے گی۔

جب یہ سب کچھ ہو گیا تو مجلس کی قرارداد کے مطابق صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے اس سلسلہ میں ایک پمفلٹ شائع کیا اور نواب وقار الملک نے ملک کے نام ایک نہایت پرزور اور اثر آفرین اپیل مختلف زبانوں میں شائع کی، یہ اپیل جنوری ۱۹۱۱ء کے آخر میں شائع ہوئی تھی، خدا ساز بات تھی کہ برس کے ختم ہونے سے پہلے پہلے یعنی دس گیارہ مہینہ کی مدت میں مسلمانوں نے تیس لاکھ روپیہ کی رقم خطیر جمع کر کے رکھ دی۔ پھر کسی کہنے والے نے کیا غلط کہا ہے کہ مسلمان اپنی فطرت کے اعتبار سے ایک شیر ہے، جب تک پڑا سو رہا ہے ایک مکھی بھی اس کے بدن پر بیٹھ سکتی ہے لیکن جہاں بیدار ہو گیا پورے جنگل کا بادشاہ وہی ہے۔[1]

---

[1] نہیں ہے نا امید اقبالؔ اپنی کشت ویراں سے ؏ ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

شرائط پر حکومت اور مسلمانوں کی شدید کشمکش | فنڈ جمع کرنا تو مسلمانوں کا اپنا کام تھا وہ جھٹ پٹ انھوں نے کر دکھایا، اب اس کے بعد سب سے زیادہ شدید اور صبر آزما مرحلہ گورنمنٹ اور مسلمانوں کے درمیان ان شرائط کا تصفیہ تھا جن کی بنیاد پر گورنمنٹ مسلم یونیورسٹی کے وجود کو آئینی اور قانونی شکل دینے پر رضامند ہوسکتی تھی، مسلمانوں نے کس عزم و ہمت اور جرأت و جسارت سے اس وادی ہفتخوان کو طے کیا اور وہ کس طرح اس جادۂ امید و بیم سے گذرے ہیں وہ ان کے اس عہد کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ اس لیے اسے کسی قدر تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت ہے: ؎ لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

کانسٹی ٹیوشن کمیٹی | جب گورنمنٹ سے گفت و شنید کرنے اور مجوزہ یونیورسٹی کے لیے دستور مرتب کرنے کا معاملہ سامنے آیا تو اس مقصد کے لیے ۲۸ فروری ۱۹۱۱ء کو ایک کمیٹی کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کے نام سے قائم کردی گئی، اس کمیٹی کے صدر سر راجہ محمود آباد اور سکریٹری ڈاکٹر سید علی بلگرامی منتخب ہوئے، اس کمیٹی نے یونیورسٹی دستور کے خاص خاص عنوانات کا مسودہ ایکٹ (ACT) اور اسٹیچوٹ (STATUTES) کی شکل میں مرتب کردیا تو اب ایک وفد مسٹر بٹلر جو حکومت ہند کے ممبر تعلیمات تھے، ان سے گفتگو کرنے کے لیے ترتیب دیا گیا۔ ڈاکٹر سید علی بلگرامی کا اس وقت انتقال ہوچکا تھا اور ان کی جگہ ڈاکٹر ضیاء الدین (جو بعد میں سر ہوئے) دستوری کمیٹی کے سکریٹری مقرر ہوگئے تھے۔ اس لیے اس وفد میں راجہ صاحب محمود آباد۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں اور نواب وقار الملک کے علاوہ ڈاکٹر ضیاء الدین بھی شامل تھے۔ یہ وفد ۱۶ مئی ۱۹۱۱ء کو شملہ میں ممبر تعلیمات مسٹر بٹلر سے ملا۔ لیکن وقار حیات کے بیان کے مطابق یہ گفتگو صیغۂ راز میں تھی۔ ~~لہ~~

لہ یہ "صیغۂ راز" کا فقرہ اشتباہ انگیز ہے اس لیے اس کی وضاحت ضروری ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہندوستان کے تمام مسلمانوں کی نظریں اس وقت علی گڑھ پر لگی ہوئی تھیں۔ علاوہ ازیں یہ وہ زمانہ تھا جب کہ مسلمانان باقی صفحہ ۸۹ پر

اس گفتگو میں بہر حال یہ طے ہوا کہ یونیورسٹی کے دستور کا جو مسودہ اس وقت ممبر تعلیمات کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ اس پر نظر ثانی کی جائے گی۔ اور اس کے بعد ممبر تعلیمات سے پھر گفتگو ہوگی، نواب وقار الملک مسلمانوں کے ہر دلعزیز لیڈر تھے اور انہیں معلوم تھا کہ مسلمانوں کو یونیورسٹی کے معاملہ سے کس درجہ گہری اور عمیق دلچسپی ہے اور اس لئے گورنمنٹ کے ساتھ گفت وشنید کا معاملہ کس منزل میں ہے؟ اس سے باخبر رہنے کے لیے وہ کتنے بے چین اور بے قرار ہیں اس بنا پر اس سلسلہ میں جو مرحلہ بھی پیش آتا تھا نواب صاحب مسلمانوں کو بر وقت اس سے مطلع کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے، چنانچہ اس موقع پر بھی انہوں نے اخبارات میں اپنا ایک بیان شائع کیا جس میں انھوں نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ مایوس نہ ہوں۔ گفتگو جاری ہے۔ اصل مسودہ میں کچھ ردو بدل کیا جائے گا اور اس پر ایک تاریخ معینہ پر آئندہ میٹنگ میں گفتگو ہوگی۔

مسٹر بٹلر کا ایک خط | مسٹر بٹلر نے ۳۱ر جولائی کو راجہ صاحب محمود آباد (صدر مسلم یونیورسٹی دستور کمیٹی) کے نام خط لکھا جس کے اہم مشتملات امور ذیل ہیں :-

---

بقیہ ص۸۵ سے

قومی و ملی افکار کے ساتھ حریت فکر اور آزادی رائے کے جذبات بھی پیدا ہو چلے تھے اور دوسری طرف حکومت سے اپنے مطالبات منوا لینا اور اپنے منشا کے مطابق مسلم یونیورسٹی کی اس سے منظوری لے لینا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس بنا پر بہتر اور مناسب یہی تھا کہ جب تک گفتگو کسی خاص مرحلہ تک نہ پہونچ جائے اس کو پبلک سے مخفی رکھا جائے۔ ورنہ اندیشہ تھا کہ درمیانِ گفتگو میں کسی ایک بات سے متاثر ہو کر مسلمانوں نے کوئی ایجی ٹیشن شروع کر دیا تو کیا کرایا سب ملیامیٹ ہو جائے گا۔ بہر حال یہ مقصد تھا اس گفتگو کو پردہ راز میں رکھنے کا اور جیسا کہ اس زمانے میں بعض عجلت پسند و حریت طلب حضرات نے مشہور کر دیا تھا۔ اس خفیہ گفتگو کا مقصد ہرگز یہ نہیں تھا کہ یہ وفد حکومت کے ساتھ شرائط کا معاملہ ملا ہی بالا طے کر لینا چاہتا تھا۔

(۱) آپ اور آپ کے ساتھیوں نے مسلم یونیورسٹی کے مقاصد اور اس کے اغراض کے متعلق بڑی خوبی سے گزشتہ شملہ کی ملاقات میں جو کچھ مجھ سے کہا اس سے یہ بات صاف عیاں ہے کہ آپ کے نزدیک یونیورسٹی کے اغراض و مقاصد وہی ہوں گے جو محمڈن کالج کے ہیں، یعنی ایک ایسی یونیورسٹی جس پہ ایک طرف برٹش گورنمنٹ کو کامل اعتماد ہو اور دوسری جانب ہندوستان کے مسلمانوں کو اس پر پورا بھروسہ ہو۔

(۲) میں نے شملہ کی ملاقات میں آپ سے کہا تھا کہ یونیورسٹی کے قیام کے لئے برطانیہ کے وزیرِ ہند کی منظوری ضروری ہے اب میں آپ کو مسرت کے ساتھ اطلاع دیتا ہوں کہ حکومتِ ہند اور برٹش گورنمنٹ کے وزیرِ ہند آپ کی یونیورسٹی کا قیام منظور فرمالیں گے۔

(۳) مگر شرط یہ ہے کہ (۱) آپ یہ دکھا سکیں کہ آپ کے پاس اس مقصد کے لیے سرمایہ بہت کافی ہے اور (۲) دوسرے یہ کہ مجوزہ یونیورسٹی کا دستور (CONSTITUTION) تمام وکمال گورنمنٹ ہند اور حضور ملکِ معظم کے وزیرِ ہند کے لیے قابلِ منظوری ہے۔

(۴) اگر صاحب وزیرِ ہند اور گورنمنٹ آف انڈیا دونوں نے یونیورسٹی کے قیام کی منظوری دیدی تو امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں بل پیش کرنا ضروری ہوگا۔ اس کے لیے گورنمنٹ آف انڈیا بخوشی آپ کی کیٹی کے وفد کے مشورہ سے قانون کا مسودہ طے کرے گی۔

مسٹر بٹلر نے اس مکتوب میں وزیرِ ہند اور گورنمنٹ آف انڈیا کے اپنے مکمل اطمینان اور اعتماد کی جو بات کہی ہے اس سے مسلمانوں کو مایوسی ہوئی۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ یونیورسٹی گورنمنٹ کی مداخلت سے آزاد نہ ہوگی، اس بنا پر ایک مرتبہ نواب وقار الملک نے لکھا تھا۔ قوم کو ضرورت سے زیادہ توقع دلانا خلافِ مصلحت ہے۔ یونیورسٹی دینا نہ دینا بالکل گورنمنٹ کے اختیار میں ہے۔ اور جب تک گورنمنٹ اس کے متعلق منظوری اور ہمارے اختیارات کی تشریح نہ ہو جائے، اس وقت تک پبلک کے سامنے کچھ کہنا بہت ہی قبل از وقت ہوگا۔

مجوزہ دستور کے خاص اہم نکات | بہر حال اب جب کہ دستور کمیٹی اور حکومت میں گفت و شنید کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا مسلمانوں کو زیادہ دنوں تک اصل صورت حال سے بے خبر رکھنا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ نواب صاحب نے ایک طویل بیان شائع کیا جس میں انھوں نے تفصیل سے بتایا کہ ایک مسلم یونیورسٹی کا قیام مسلمانوں کے لیے کیوں ضروری ہے، اس یونیورسٹی کے اغراض و مقاصد کیا ہوں گے۔ اس سلسلہ میں سرسید اور ان کے ساتھیوں کے عزائم کیا تھے۔ لیکن یونیورسٹی کے قیام کی راہ میں کیا کیا مشکلات اور دشواریاں ہیں اور یونیورسٹی کمیٹی کے اصحاب کس طرح ان دشواریوں سے عہدہ برآ ہونے کی جان توڑ کوشش کر رہے ہیں۔ اس طویل بیان میں جو یونیورسٹی کے لئے ایک نہایت اہم تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ نواب صاحب نے یونیورسٹی کے مجوزہ دستور کے جو اہم خد و خال سپرد قلم کئے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں۔

مذہبی تعلیم و تربیت | نواب صاحب لکھتے ہیں:

سب سے بڑا خیال جو مسلمان پبلک کو ہے (اور جو در حقیقت مسلمانوں کے لیے اور اسلامی یونیورسٹی کے لیے جان سخن ہے) وہ ہماری مذہبی تعلیم و تربیت ہے اور اس مسودہ (دستور یونیورسٹی) کے ناظرین دیکھیں گے کہ اس کی نسبت مسودہ میں ہر جگہ کافی حفاظت کی گئی ہے،

یونیورسٹی کا انتظام تمامتر مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو گا | آگے چل کر دفعہ ۵ کے ماتحت رقمطراز ہیں:۔

"اعلیٰ حکمران جماعت جس طرح اب تک کالج میں صرف مسلمانوں سے مرکب ہے، اسی طرح آیندہ بھی یہ اعلیٰ حکمرانی صرف مسلمان ٹرسٹیوں کے ہاتھ میں رہنے کے واسطے مسودہ میں تجویز کی گئی ہے اور جس قدر اس وقت مسلمان ٹرسٹی کالج میں ہیں وہ سب کے سب بہ طور کورٹ آف ٹرسٹیز کے یونیورسٹی کی اعلیٰ حکمران جماعت متصور ہوں گے۔"

اس کے بعد دفعہ ۶ کے ماتحت مزید لکھتے ہیں:۔

"جس طرح اس وقت ٹرسٹیوں کا سنڈیکیٹ صرف مسلمان ٹرسٹیوں سے مرکب ہے،

اسی طرح آیندہ یونیورسٹی میں بھی وہ جماعت از نام کونسل "کورٹ آف ٹرسٹیز" کے ماتحت، بہ طور کارپرداز جماعت کے صرف ٹرسٹیز یعنی مسلمان ممبروں سے مرکب ہو گی؛

وائس چانسلر کے لیے مسلمان ہونا ضروری ہے | بیان کی دفعہ ۸ کے ماتحت تحریر فرماتے ہیں۔

"وائس چانسلر کی نسبت ناظرین دیکھیں گے کہ وہ کورٹ کے ممبروں میں سے کوئی شخص ہوگا اور کورٹ ہی اس کو منتخب کرے گا۔ اس لیے اس کا ہمیشہ مسلمان ہونا لازمی ہے۔

علوم اسلامیہ کی تعلیم | اس کے بعد دفعہ ۹ کے تحت میں تحریر کرتے ہیں:۔

"ہمارے قدیم مشرقی علوم کی جماعت الگ تجویز کی گئی ہے۔ جس میں لازمی طور پر ایک کافی تعداد علما کی شریک ہو گی۔ اور اگر خدا کے فضل و کرم سے مسلمانوں کو یہ یونیورسٹی مل گئی تو لوگ دیکھینگے کہ پھر ایک دفعہ نئے سرے سے ہمارے قدیم علوم زندہ ہوتے ہیں، بڑے بڑے نامی عالم حدیث، تفسیر، فقہ، ادب، اور مختلف علوم و فنون کے یونیورسٹی کے احاطہ میں دکھائی دیں گے اور ان کے فیضِ صحبت سے ہمارے نوجوان طلبا مستفیض ہوں گے۔

ان چیزوں کا ذکر کرکے نواب صاحب فرماتے ہیں۔

"اگر یہ تجویزیں گورنمنٹ سے منظور ہو جائیں تو اس سے زیادہ معتدل کارروائی اور کوئی ہو نہیں سکتی۔"

اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ یونیورسٹی کمیٹی اور عام مسلمانوں کے نزدیک یونیورسٹی کے اہم اور بنیادی مقاصد کیا تھے؟

گورنمنٹ اور مسلمانوں میں شدید کشمکش | اس کے بعد یونیورسٹی کے دستور کے معاملہ میں گورنمنٹ اور مسلمانوں کے درمیان ایک شدید کشمکش کی تاریخ شروع ہو جاتی ہے۔ بار بار ممبر تعلیمات مسٹر بٹلر سے یونیورسٹی کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کے وفد کی ملاقات ہوتی ہے جس میں موصوف مجوزہ دستور کی بعض دفعات سے اختلاف کرتے ہیں اور ان کو حکومت کے لیے ناقابلِ قبول قرار دیتے ہوئے ان پر نظرثانی کرنے کی فرمائش کرتے ہیں ادھر بار بار کمیٹی کا جلسہ ہوتا ہے اور

بعض دفعات میں ترمیم و تنسیخ کی جاتی ہے۔ لیکن جہاں تک یونیورسٹی کے بنیادی مقاصد کا ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے جس طریق کار کا تعلق ہے ان میں کمیٹی کسی مصالحت کے لیے آمادہ نہیں ہوتی اور وہ ان پرسختی سے جمی ہوئی ہے، ملک میں یہ خبریں عام ہوتی ہیں تو مسلمانوں پر امید و بیم کی کشمکش کا عالم طاری ہو جاتا ہے،

اختلاف کے بنیادی وجوہ | اس سلسلہ میں گورنمنٹ (جس کی نمائندگی سکریٹری آف اسٹیٹ کر رہے تھے) اور یونیورسٹی کمیٹی کے درمیان اختلاف کی بنیادی وجوہ امور ذیل تھے :-

(۱) گورنمنٹ کو اس پر اصرار تھا کہ یونیورسٹی کا نام "علی گڑھ یونیورسٹی" ہو گا نہ کہ "مسلم یونیورسٹی"

(۲) گورنمنٹ کو اصرار تھا کہ یونیورسٹی کا چانسلر وائسرائے باجلاس کونسل ہو گا۔ اور اس کے اختیارات نہایت وسیع ہوں گے،

(۳) گورنمنٹ کو سخت اصرار تھا کہ یونیورسٹی ایک مقامی اور رہائشی (RESIDENTIAL) یونیورسٹی ہو گی نہ کہ الحاقی۔

ان امورسہ گانہ پر جب اختلاف بہت شدید ہوا اور اس سلسلہ میں سکریٹری آف اسٹیٹ کی طرف سے ایک اعلان بھی ہو گیا تو مسلمانوں میں غم و غصہ اور مایوسی و ناکامی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ یہاں تک کہ نواب وقار ملک نے انتہائی تاثر کے عالم میں ایک بیان پھر شائع کیا اور اس میں بعض دوسرے معاملات اور کالج کے اغراض و مقاصد پر گفتگو کرنے کے بعد انہوں نے صاف لکھا :-

"چونکہ گورنمنٹ کی طرف سے ہم کو یونیورسٹی کے ملنے میں دقت پیش آئی ہے لہٰذا میری یہ رائے ہے کہ اب ہم کو اپنی تعلیم کا پروگرام بدل دینا چاہیے" یعنی اب تک جو یہ خیال تھا کہ علی گڑھ کالج ترقی کر کے "آل انڈیا مسلم یونیورسٹی"

بن جائیگا اور اس یونیورسٹی کے ذریعہ ہم اپنی ہر قسم کی قومی تعلیمات کا انتظام کر سکیں گے۔ اس کی جگہ اب ہم کو یہ کرنا چاہئے کہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں کے واسطے اپنی ایک علیحدہ جامعہ اسلامیہ خود قائم کریں" اور جو سرمایہ مسلم یونیورسٹی کے واسطے جمع ہوا اور ہو رہا ہے وہ اسی جامعہ اسلامیہ کے سپرد کیا جائے۔"

نواب صاحب اس وقت بہت ضعیف و کمزور ہو جانے کے باعث خانہ نشین ہو چکے تھے اس لیے ان پر عالم یاس و حرمان کا غلبہ مستبعد نہیں ہے۔ لیکن یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی نے ہمت نہیں ہاری۔ اس نے ڈٹ کر گورنمنٹ کا سامنا کیا۔ اور اپنی جدوجہد کی رفتار میں کمی کا دخل نہیں ہونے دیا۔ وہ باہم جلسے اور گورنمنٹ سے بات چیت کرتی رہی۔

بس کی گانٹھ آخر مجبور ہو کر گورنمنٹ کو اپنی ہٹ اور ضد سے باز آنا پڑا، اس نے یہ تسلیم کر لیا کہ یونیورسٹی کا نام "مسلم یونیورسٹی" ہوگا۔ اور یہ بھی مان لیا کہ یونیورسٹی کا چانسلر وائسرائے یا جلاس کونسل نہیں ہوگا بلکہ یونیورسٹی کورٹ کا خود اپنا منتخب ہوگا۔ لیکن الحاق کے معاملہ میں کوئی مصالحت نہیں ہو سکی۔ گورنمنٹ اور یونیورسٹی کمیٹی دونوں اپنے اپنے موقف پر سختی سے جمے رہے، الحاق AFFILIATING UNIVERSITY کا مطلب یہ تھا کہ مسلم یونیورسٹی ایک مقامی یونیورسٹی نہیں ہوگی بلکہ ایک ایسی یونیورسٹی ہوگی جو علی گڑھ سے باہر اسلامیہ کالجوں کو بھی اپنے نظام تعلیم و امتحان کے ساتھ وابستہ کر سکے گی کمیٹی کے ارکان کے نزدیک یونیورسٹی کا الحاقی ہونا اسی لیے ضروری تھا کہ اس راہ سے وہ ملک بھر کے تمام مسلمانوں کے لیے اپنے نصب العین کے مطابق اعلیٰ تعلیم کا بندوبست کر سکتی اور یونیورسٹی کا دائرۂ عمل وسیع تر کر سکتی تھی۔ اس بنا پر کمیٹی کو اصرار تھا کہ ہم یونیورسٹی لیں گے تو الحاقی لیں گے۔ ورنہ غیر الحاقی یونیورسٹی سے بہتر تو یہی ہے کہ یونیورسٹی

ہیں نہیں۔

الحاق گورنمنٹ کی نظر میں | اس کے بالمقابل گورنمنٹ کو الحاق کے انکار پر جو شدید اصرار تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ ملک میں ہندوؤں نے بھی بنارس میں ایک ہندو یونیورسٹی قائم کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا اور اس کے لیے گورنمنٹ سے بات چیت کا سلسلہ جاری تھا۔ مسلمانوں کی طرح ہندوؤں کا بھی مطالبہ تھا کہ ان کی یونیورسٹی الحاقی ہو۔ اب گورنمنٹ نے خیال کیا کہ اگر مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کی الگ الگ یونیورسٹیوں کو الحاقی تسلیم کرلیا گیا تو اس کا نتیجہ بجز اس کے کچھ اور نہ ہوگا کہ پورا ملک دو کیمپوں میں تقسیم ہو جائے گا۔ ایک ہندو کیمپ اور ایک مسلم کیمپ اور یہ صورت حال قومی یکجہتی اور ملک کی سالمیت کے لیے خطرناک ہوگی۔

(جاری)

درستگیٔ اغلاط

برہان ماہ جنوری ۷۳ء

(۱) صفحہ ۳۸ سطر ۴ - علامہ ابن حجر عسقلانی کا سنِ وفات ۵۲ھ غلط طبع ہوگیا صحیح سنِ وفات ۸۵۲ھ ہے

(۲) صفحہ ۲۴ سطر ۱۴ پر نکل کیا گیا غلط ہے۔ صحیح نقل کیا گیا ہے۔ قارئین۔ درست فرمالیں۔

(مینجر)

رسولؐ شاہد و مشہود

(۶)

(از جناب قاری بشیرالدین صاحب پنڈت۔ایم۔اے)

مہابھاشیہ پاتنجلی کی رُو سے وید بلحاظ تقسیم چار ہیں اور تعداد کے لحاظ سے ۱۱۳۱، جن میں سے اس وقت صرف دس گیارہ دستیاب ہیں۔ رگوید، یجروید اور سام وید کو "تریہ وِدّیا" (علوم ثلاثہ) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور اتھروویدکو "برہم وید" (علم الٰہی) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اس میں رگوید کی طرح رچائیں (محامد) سام وید جیسا موزوں کلام اور یجروید کی مانند عبادات کا ذکر ہے گویا ن اقسام کے وید منتروں کا یہ ایک وید مجموعہ ہے۔ اس کے علاوہ مہلک امراض سے شفاء، معنا ور جنگ میں فتح ونصرت کے نسخے، بہشت (سورگ) اور دوزخ (نرک) کے تفصیلی بیانات پر مشتمل منتر بھی موجود ہیں۔ ان چاروں ویدوں کے زمانۂ نزول یا تدوین میں سخت اختلاف ہے۔

سوامی دیانند جی ایک عرب ۳۱ کروڑ برس بتاتے ہیں تو مہاتما تلک جی صرف ۴ ہزار سال (ARYAE HOME IN THE VEDAS) زمانہ تالیف کے علاوہ ان کے رشیوں، جائے نزول اور عداد کے متعلق بھی بیسیوں رائیں ہیں (تفصیل کے لیے دیکھو 1-HINDU CIVILIZATION
BY RADHA KUMUD MUKERJI
2- POLITICAL HISTORY OF ANCIENT INDIA BY HEM
CHANDDA RAYA CHAUDHRY

بابل اور مصر کے مدفون آثارِ قدیمہ کے متعلق جو تحقیقات کی گئی ہے اس سے یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ بائبل کا ماخذ الواح بابل ہیں اور ڈاکٹر پیران ناتھ پروفیسر ہندو یونیورسٹی بنارس نے ثابت

انڈیا کے جولائی و اگست ۱۹۳۵ء کے شمارہ میں وید، بابل اور مصر کے تعلقات پر روشنی ڈالی ہے انھوں نے بتایا کہ رگوید میں بابل اور مصر کے بادشاہوں اور جنگوں کا ذکر ہے اور رگوید کا ۱/۵ حصہ بابل کے صحائف سے نقل کیا گیا ہے۔ ان تمام دلائل وشواہد کے باوجود یہ کہنا مشکل بلکہ غلط ہے کہ اتھرو وید صحیفۂ ابراہیم کی ہو بہو نقل ہے۔ اسی اتھرو وید کے بیسویں باب میں کچھ "سوکت" "کنتاپ سوکت" کہلاتے ہیں ان کو بڑے بڑے طویل یگیوں اور قربانیوں کے موقع پر، اپجاری بڑے اہتمام سے پڑھا کرتے تھے اور ان منتروں کو ہر سال دوہرایا جاتا تھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہندو بھائیوں کو ان کے یاد رکھنے کی تاکید کی گئی تھی (ایتریہ برہمن ۶: ۳۲)۔ یہ تاکید کیوں تھی؟ اس کا راز سمجھنے کے لیے انبیاء کرام کے اس "عہد میثاق" کی اس آیۃ شریفہ کو پیش نظر رکھیے جس میں ان سے لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ کا وعدہ کرایا گیا تھا۔ جس کو ہر نبی نے پورا کیا۔

عزیز و دوستو! کنتاپ کے دو معنی ہیں (۱) گناہوں اور دکھوں کو دور کرنے والا (۲) دوسرے معنی ہیں پیٹ کی پوشیدہ گلٹیاں یعنی راز۔ یہ راز دراصل سرزمین مکّہ سے متعلق ہے اس لیے کہ الہامی کتب کی رو سے سرزمین مکّہ کو امّ القریٰ یا ناف زمین بتایا گیا ہے کیوں کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں خدائے واحد کی پرستش کا پہلا گھر تعمیر ہوا اور بنی نوع انسان کے لیے روحانی غذا کا مرکز قرار پائی۔ قرآن پاک مؤیّد ہے اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ (۳: ۹۵) اس طرح قرآن شریف میں مکّہ کے دو نام ہیں (۱) مکّہ بمعنی بطن یا پیٹ۔ (۲) اور بکّہ بمعنی پستان۔ جس طرح بچّہ کی پرورش دو جگہ سے ہوتی ہے رحم مادر میں پیٹ سے غذا ملتی ہے اور پیدائش کے بعد ماں کے پستان سے دودھ کی شکل میں اسی طرح نسلِ انسانی کی پرورش کنتاپ (پیٹ کی گلٹیوں یعنی بکّہ) سے شروع ہوئی اور جب انسان کا فرزند مکمل ہو گیا اور پیٹ سے نکل کر وسیع دنیا میں آ گیا تو یہی پیٹ کی گلٹیاں چھاتی میں جا کر دودھ بن گئیں۔ اس طرح انسان کی پرورش کا سامان مکّہ یا ماں کی چھاتیوں میں ہے۔

اتھرو وید کا یہ کنتاپ سوکت ایک وقت تک لوگوں کے لیے ایک معمہ یا پہیلی بنا رہا۔

پنڈت راجارام صاحب پروفیسر ڈی۔ اے۔ وی کالج لاہور، پنڈت کھیم کرن الہ آبادی، ڈاکٹر این۔ دتّ، مورس بلوم فیلڈ، پروفیسر گرفتھ، پروفیسر میکسملر، ڈاکٹر واہنی وغیرہ نے سمجھنے کی کوشش کی ہے لیکن تقابلی مطالعۂ ادیان کو نظر انداز کرتے ہوئے یکطرفہ۔ اس لیے حل نہیں کر سکے ورنہ بعثتِ رسول اکرمؐ کے بعد یہ کنتاپ معمہ یا پہیلی نہیں ہے بلکہ یہ خفیہ گلشیان نسلِ انسانی کی پرورش اور ربوبیت کے لیے شیریں دودھ بن چکی ہیں مگر اس شخص کے لیے جو اپنی حقیقی ماں کو پہچانتا اور اس کی چھاتیوں کی طرف دوڑتا ہے۔ قرآنِ پاک کی روشنی میں۔ کنتاپ سوکت کے منتروں کے معنی صاف صاف دکھائی دیتے ہیں۔ اتھروید کانڈ ۲۰، سوکت ۱۲۷ کے چودہ منتر چار الگ الگ مضامین پر مشتمل ہیں:۔

۱۔ नराशंस نَراشَنسَ یعنی بہت تعریف کیا گیا۔ بالفاظ دیگر لفظ محمدؐ کا مترادف

۲۔ रेभः : ریبھَ یعنی حمد کا نیوالا (احمدؐ)

۳۔ परिक्षित: پریکشت یعنی سب طرف شہرت والا۔

۴ कारुम، کاروم یعنی حمد گا نیوالا (احمدؐ)

اس طرح یہ چاروں ایک ہی محترم شخصیت کے صفاتی نام ہیں۔ اب آپ انھیں توجہ کے ساتھ سماعت فرمائیں:۔

(۱) نراشنسہ (محمدؐ)

इदं जना उपश्रुत नराशंसं स्तविष्यते
षष्टिं सहस्रा नवतिं च कौरम आ रुशमेषु दद्महे ॥१॥

ترجمہ از مورس بلوم فیلڈ:۔ "LISTEN, YE FOLKS, TO THIS (SONG) IN PRAISE OF A HERO SHALL BE SUNG! SIXTY THOUSAND AND NINETY (COWS) DID WE GET, (WHEN WE WERE) WITH KAURAMA AMONG THE RUSHAMAS"

ترجمہ از پروفیسر گرفتھ :- "LISTN TOTHIS, YE MEN, ALAUD OF GLORIORIOUS BOUNTY SHALL BE SUNG THOUSANDS SIXTY AND NINTY WE, O KAURAMI AMONG THE RUSHMAS, HAVE RECEIVED."

ترجمہ از پروفیسر پنڈت راجہ رام

" یہ سنو اے لوگو! ایک قابلِ تعریف تعریف کیا جائیگا۔ اے کورم ہم نے بدشمنوں کے بیچ میں ساٹھ ہزار اور نوّے لئے ہیں" (بحوالہ المیثاق النبیین ص۵)

ترجمہ از پنڈت کھیم کرن الہ آبادی :-

" اے لوگو! یہ احترام سے سنو۔ لوگوں میں تعریف والا انسان تعریف کیا جائے گا۔ اے زمین پر خوش خرامی کرنے والے بادشاہ ساٹھ ہزار اور نوّے دشمنوں کو اکھاڑ پھینکنے والے بہادروں میں ہم پاتے ہیں"

حضرات! آپ کے سامنے چار ترجمے پیش کیے گیے ان تمام ترجموں میں یہ باتیں مبہم ہیں :-

(ا) کس کی تعریف کی جائے گی؟ (ب) ساٹھ ہزار اور نوّے کیا چیز ہیں؟

(ج) اس بات کو لوگ ادب سے کیوں سنیں؟ (د) روشم اور کورم سے کیا مراد ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

ہندوستان کی تاریخ ان امور پر کوئی روشنی نہیں ڈالتی۔ البتہ عرب کی تاریخ کی روشنی میں ان امور کا جواب کھلا ہوا اور واضح ہے یعنی " اے لوگو یہ (بشارت) احترام سے سنو! نراشنس (یعنی محمدؐ) تعریف کیا جائے گا اور ساٹھ ہزار اور نوّے دشمنوں میں اس کورم (مہاجر یا داعی امن) کو ہم لیتے ہیں یعنی محافظ ہیں"

لفظی ترجمہ :-

اِدَم : یہ	اُپ شرت ۔ احترام سے سنو
جناہ : اے لوگو	نراشنسہ ۔ محمدؐ

استوشنتے ۔ تعریف کیا جائیگا	کوَرَم ۔ مہاجر اور داعی امن
ششٹم تہسر ۔ ساٹھ ہزار	رشمیشو ۔ دشمنوں میں
نوَیتم ۔ نوّے	اَدَدمہے ۔ ہم لیتے ہیں، بچاتے ہیں
چہ ۔ اور	

نوٹ :۔ اوّل الذکر تینوں ترجموں میں روشم اور کورم کو "اِسم عَلَم" مانا گیا ہے ۔ پروفیسر گرفتھ نے سائیکلو پیڈیا ببلیکا میں کوَرَم (قرم) بمعنی سردار اور روشم کو شمالی عرب کے باشندے مانا ہے ۔ بیشک بنو قریم عربی میں بمعنی سردار اور قبیلہ کا نام بھی ہے ۔ لیکن منتر کا ترجمہ شق (ب) اور جیم کو مبہم بنا دیتا ہے ۔ اس لیے ترجمہ کے لیے عربی تاریخ کی روشنی میں کوَرَم بمعنی مہاجر یا داعی امن اور روشم کو بمعنی دشمن سمجھا جائے تو ساٹھ ہزار نوّے کی تعداد کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے کیونکہ آنحضورؐ کی بعثت کے وقت مکہ معظمہ کی اتنی ہی آبادی تھی ۔ (ملاحظہ ہو تاریخ مثل الکامل ابن اثیر ص٥٥)

فائدہ :۔ لفظ نراشنس یعنی جسکی تعریف خدا و خلق دونوں کریں بعینہ اسم محمدؐ کا ترجمہ ہے ۔

नरेषु प्राशंसं यस्य सः मनुष्येषु प्रशंसनीय ॥

گویا کہ وہ خدا و خلق دونوں کی حمد کا مصداق ہے کلام پاک اس کا مؤید ہے ۔ اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ ۔ یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ؀

منتر کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ یہ ایک نہایت اہم پیشینگوئی ہے ۔ اس کو نہایت ادب احترام سے سنو ۔ معمہ یا پہیلی سمجھ کر ٹال نہ دو ۔ وہ کثرت سے تعریف کیا گیا ہے اور کیا جائیگا ۔ تمام انبیاء نے آپ کی تعریف کی ۔ بشارتیں سنائیں ۔ پہچان بتائی اور دنیا کی تمام مسجدوں کے محراب و منبر اور مناروں سے آپ کی بڑائی کے گیت گائے گئے ۔ گائے جا رہے ہیں اور گائے جائیں گے ۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں "قرآن" کے عنوان سے اقرار کیا گیا ۔

THE MOST SUCCESSFUL OF ALL THE PROPHETS AND RELIGIONS PERSONALITIES

یعنی محمدؐ دنیا کے تمام انبیاء اور مذہبی شخصیتوں میں کامیاب ترین انسان ہے"

(۳) وید منتر میں جائے بعثت اور لفظ محمدؐ کی تعریف کے بعد تیسری نشانی یہ بتائی گئی کہ وہ ہجرت کریں گے یا داخی امن ہوں گے۔ تاریخ کی کسوٹی پر ان نشانیوں کو پرکھئے اور انصاف سے بتلایئے کہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ وہ کونسی بزرگ ہستی ہے جو ان کا مصداق ہو۔

(۴) اسی طرح چوتھی نشانی حمد کے مستحق شہزادۂ امن کے لیے یہ ہے کہ دشمنوں کی کثرت میں اس کی حفاظت کی جائے گی یعنی دشمنوں کی کثرت پر خدا کی معیت و رفاقت اسے ہمیشہ غالب رکھے گی۔ وہ دشمنوں میں تن تنہا ہوگا۔ لیکن اُسے کوئی مار نہیں سکے گا۔ گھمسان کی لڑائیوں میں وہ صفِ اوّل میں ہوگا۔ اور ہر خوفناک موقع پر وہ موجود ہوگا لیکن اس کا کوئی بال بیکا نہیں کرسکتا۔ اسی طرح کی واضح نشانیاں دوسرے منتر میں ملاحظہ فرمائیں۔ منتر ہے:-

एष ऋषये मामहे शतं निष्कान् दश स्रजः ।
त्रीणि शतान्यर्वतां सहस्रा दश गोनाम् ॥३॥

"THIS ONE PRESENTED THE SEER WITH A HUNDRED JEWELS TEN CHAPLETS, THREE HUNDRED STEEDS AND TEN THOUSAND CATTLES." — موریس بلوم فیلڈ کا ترجمہ :-

"A HUNDRED CHAINS OF GOLD, TEN WREATHS, UPON THE RISHI HE BESTOWED. AND THRICE-A-HUNDRED METTLED STEEDS, TEN TIMES-A-HUNDRED COWS HE GAVE." — پروفیسر گرفتھ کا ترجمہ :-

پنڈت کیمیم کرن صاحب کا ترجمہ :- "اس نے اس ہوشیار آدمی کو سو دینار اور دس تسبیحیں، تین سو گھوڑے، دس ہزار گائیں دیں"

پنڈت راجارام صاحب کا ترجمہ:۔ اس نے مامح رشی کو سو دینار، دس مالائیں، تین سو گھوڑے اور دس ہزار گائیں دیں "

مذکورۂ بالا تراجم میں ایک ایسے رشی کا ذکر ہے جس کا نام "مامح" ہے اور اس کو ایشور نے سو طلائی دینار، دس ہار، تین سو گھوڑے اور دس ہزار گائیں عطا فرمائیں۔ ظاہر ہے کہ "مامح" نام کا کوئی رشی ہندوستان میں نہیں ہوا اور نہ دنیا میں اس نام کا کوئی پیغمبر گذرا، البتہ لفظی تحقیق کی بنا پر اس لفظ کا اصل "مح" ہے بمعنی عزت دیا گیا، تعریف کیا گیا یا بزرگی دینا، خوش ہونا یا نہایت اعلیٰ ہونا (بحوالہ سنسکرت انگریزی لغت از مونیر ولیم)۔ یہ وہی لفظ ہے جو آتما سے مہاتما، رشی سے مہرشی بناکر عزت و بزرگی کو ظاہر کرتا ہے۔ سنسکرت میں عربی لفظ "محمد" کا آسان اور قریبی تلفظ "مامح" ہو سکتا ہے جو معنی کے لحاظ سے "محمد" کا مترادف ہے۔ اس قسم کے مترادفات کی مثالیں ہر زبان میں تلاش کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً برآمدہ کی جگہ انگریزی میں برانڈہ، جبل الطارق کی جگہ جبرالٹر یا محمود غزنوی کی جگہ ہندی میں مامود گجنوی وغیرہ وغیرہ۔

اتنا سمجھ لینے کے بعد منتر کا صحیح ترجمہ کیجئے:۔

منتر کے الفاظ کا ترجمہ:۔

ایش ۔ اس خدا نے	تریني ۔ تین
رشئے ۔ رشی	شتانی ۔ سو
مامحے (مامح)۔ محمد کو	عَروَتام ۔ عربی گھوڑے
شتم ۔ سو	سہسر ۔ ہزار
نشکان ۔ طلائی سکے	دش ۔ دس
دش ۔ دس	گوتام ۔ گایاں (دیں)
سرجہ ۔ ہار	

صحیح ترجمہ:۔ اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہؐ کو سو طلائی دینار، دس ہار، تین سو عربی گھوڑے

اور دس ہزار گائیں عنایت فرمائیں۔

نشانِ محمدی کا اظہار منتر میں :- (۱) سو طلائی دینار یا سو سابقون الاولون کا عطیہ : یہ سو طلائی دینار وہ صحابہ کرام ہیں جو مکہ معظمہ کی پُر فتن زندگی میں حضورؐ کو ملے جو ہر طرح کی مصیبتوں اور دکھوں میں پڑ کر خالص کندن ثابت ہوئے۔ دشمنوں کے نت نئے ستم سے تنگ آکر ہر محبوب شے سے جدائی گوارا کی لیکن اسلام کو اپنے سینہ سے لگائے رکھا۔ مومنین کے متعلق قرآن شریف میں بتایا گیا ہے :" وَنَبْلُوكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً (۳۱ : ۳۵) یعنی کھرا کھوٹا الگ کرنے کے لیے ہم تمہیں دکھ اور سکھ سے آزماتے ہیں۔ اس آیت میں لفظ فتنہ کے معنی ہیں۔ سونے کو آگ میں ڈالنا تاکہ کھرا کھوٹے سے الگ ہو جائے۔ لہٰذا حبش کو ہجرت کرنے والے خالص سونے کے سو پارے تھے جو ہر امتحان میں پورے اُترے۔

یجر وید کی تفسیر شت پتھ برہمن کے کانڈ ۱۲، پرپاٹھک ۹، برہمن ۱، اور کنڈکا ۴ میں لکھا ہے کہ :-

" سونا انسان کی روحانی طاقت سے استعارہ ہے "

جو روحانی طاقت دنیا کی تمام مخالفتوں اور آزمائشوں پر غالب آتی ہے۔ وہ" طلائی دینار " کہلاتی ہے۔ پس وہ سو جانباز و جاں نثار صحابہ جو اپنی روحانی طاقت سے دنیا کے ہر عذاب پر غالب آئے اور معیارِ صداقت پر پورے اُترے وہی آنحضورؐ کو سب سے پہلے عطا کئے گئے یعنی مہاجرین حبش جن کی تعداد سو تھی۔

(۲) منتر میں دوسری چیز جو آنحضورؐ کو اللہ تعالیٰ نے عطا کی وہ دس منتخب پھولوں کا ہار ہے۔ ان پھولوں کو زندگی ہی میں اوجِ اقبال پر فائز المرام ہونے کی خوشخبری دیدی گئی۔ یہ پھول ہیں جنت کے گلدستے یعنی عشرہ مبشرہ۔ سرجہ لفظ سہرا اور سردار کے معنوں میں بھی آتا ہے (رگوید منڈل ۱۰، سوکت ۸۴ منتر ۲)

(۳) اصحاب بدر :- منتر میں تیسرا عطیہ تین سو گھوڑے دیئے جانے کا ہے اور گھوڑے

بھی عربی کیونکہ سنسکرت لفظ "عروہ" عربی اور اشٹروں (غیر آریوں) کی سواری کے لیے مخصوص ہے۔ عروہ کے معنی از روئے لغت تیز رو کے ہیں (رگ وید ۵، ۷۴، ۱۴۰)۔ پس تین سو گھوڑوں سے مراد وہ اصحاب رسول ہیں جو جنگ بدر میں آپ کے ساتھ تھے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ سیکڑوں پر جو کسر ہوتی ہے وہ اکثر نظر انداز کر دی جاتی ہے۔

(۴) دس ہزار قدوسیوں کا عطیہ:۔ یہ وہ نفوس قدسیہ ہیں جو فتح مکہ کے وقت آنحضورؐ کے ساتھ تھے۔ ان کو وید میں "گائیں" کہا گیا ہے۔ گائے کو مختلف معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے مثلاً

(ا) سنسکرت لفظ گوُ کا مادّہ "گم" ہے جس کے معنی جنگ کے لیے جانا یا نکلنا چنانچہ گائے کو گوُ اس لیے کہتے تھے کہ آریوں کی جنگ کے اندر دشمن کی گایوں کو جیتنا ہی مقصود ہوتا تھا یہی وجہ ہے کہ بیل کو فتح کی نشانی سمجھا جاتا ہے (گائے اور بیل کے لیے بالعموم ایک ہی لفظ گوُ استعمال ہوتا ہے) (بحوالہ رگوید منڈل ۱، سوکت ۳۳، منتر ۶)

(ب) گوُ کے دوسرے معنی ہیں "نہایت تعریف والا، بہت مبارک، دشمنوں کو اکھاڑ پھینکنے والا نہایت مضبوط مددگار بیل کی طرح طاقتور (ملاحظہ ہو شت پتھ برہمن کانڈ ۵، پرپاٹھک ۲، برہمن ۴، کنڈکا ۱۳)۔

(ج) گائے کو رعب وجلال کا مظہر مانا گیا ہے (رگوید منڈل ۵، سوکت ۷۰، منتر ۳)

(د) گائے اتحاد و اتفاق کی علامت ہے (رگوید منڈل ۱، سوکت ۱۱۲، منتر ۳)

(ہ) گائے کو انسان سے تشبیہ دی جاتی ہے (شت پتھ برہمن کانڈ ۱۲، پرپاٹھک ۹، برہمن ۱، کنڈکا ۷)

مذکورۂ بالا گائے کی یہ تمام متضاد خصوصیات آنحضورؐ کو عطا کردہ قدوسی جماعت میں پائی جاتی ہیں، وہ گائے کی طرح رحم و محبت کا مجسمہ ہیں۔ بارعب و خوفناک ہیں، باہمی اتحاد و اتفاق کا مجسمہ ہیں۔ یہ متضاد صفات ایک ہی گروہ میں کیوں کر جمع ہو سکتی ہیں۔ اس معمہ کو قرآن پاک نے یوں حل فرمایا ہے۔

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ ...... رُحَمَاءُ (سورۂ فتح) یعنی محمد رسول اللہ

ہیں اور جو ان کے ساتھ ہیں وہ منکروں کے مقابلہ پر قوی۔ آپس میں ایک دوسرے سے پیار و محبت کرنے والے ہیں۔ تو انھیں عبادت کرتے ہوئے دیکھتا ہے وہ اپنے رب کا فضل اور رضا چاہتے ہیں۔

صحابۂ کرامؓ کی یہ صفات ویدوں کے علاوہ توریت انجیل اور ژنداوستا وغیرہ میں بھی موجود ہیں لیکن جس ترتیب کے ساتھ اس منتر میں ہیں وہ بے مثال ہیں ساتھ ہی ساتھ جس ترتیب سے اللہ تبارک تعالیٰ نے اپنے پیارے حبیب جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ انعامات عطا فرمائے اسی ترتیب کے ساتھ اس وید منتر میں بطور پیشنگوئی موجود ہیں۔ سب سے پہلے سابقون الاولون ملے پھر عشرۂ مبشرہ کی گنتی پوری ہوئی اس کے بعد جنگ بدر اور دس ہزار نفوس قدسیہ کا ذکر ہے جو فتح مکّہ کے وقت آنحضورؐ کے ساتھ تھے۔ یہ ترتیب دنیا کے کسی رسول، پیغمبر، نبی، رشی، منی میں یکجا نہیں دکھائی جا سکتی پھر بھی ان پر ایمان نہ لانا حق و صداقت کو جھٹلانا ہے۔ اللہ تعالیٰ راہ ہدایت دکھائے اور اس پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

عزیز دوستو اور بزرگو! اتھروید کے کنتاپ سوکت ۱۲۷ کے صرف دو منتروں میں آنحضورؐ سے متعلق ۹ نشانیاں پیش کی گئی ہیں۔ بقیہ منتروں میں بھی متعدد خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جنھیں انشاء اللہ مناسب موقع پر تفصیل کے ساتھ پیش کیا جائے گا ان کا خلاصہ یہ ہے:-

منتر ۲: وہ سانڈنی سوار ہے۔ آسمان کی چوٹی پر پہونچا ہے۔ یعنی ہجرت و معراج کا بیان ہے۔

منتر ۴: آنحضور کے صحابۂ کرامؓ کی خصوصیات کو بیان کیا گیا ہے۔

منتر ۵: تمدن کی روح اور حکمت کی جان یعنی قرآن مجید فرقانِ حمید کے آنحضورؐ مبلغ ہیں۔

منتر ۶: رسول کریمؐ دونوں عالم کے بادشاہ، افضل البشر اور ہادی کل ہیں۔

منتر ۷، ۸: وہ داعی امن ہیں۔ اپنے قبلہ کو دار الحرم اور اپنے شہر کو دار السلام (امن کا گھر) بنا دینے والے ہیں۔

منتر ۹، ۱۰: آپ کے زیر سایہ کل قوم نے ذلّت کے گڑھے سے نکل کر آسمانِ ترقی پر قدم رکھا

منتر ۱۱: یٰاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ. قُمْ فَاَنْذِرْ کی تفسیر بیان کی گئی ہے۔

منتر ۱۲: آنحضورؐ کی بے نظیر سخاوت اور غربا نوازی کا ذکر ہے۔

منتر ۱۳: آپ کے ساتھی شیطان کے حسد اور ڈاکے سے محفوظ رکھے گئے۔

منتر ۱۴: یہ دعا یہ منتر ہے۔ وید کے رشی نے اپنا نعتیہ کلام قبولیت کی غرض سے پیش کیا ہے اور اس کے صدقہ میں اپنی اور اپنی قوم کے لیے امان طلب کی ہے۔

اب آپ اتھروید کانڈ ۲۰، سوکت ۲۱ کے منتر ۶، ۷، اور ۹ پر غور فرمائیں۔ ان میں جنگ احزاب، جنگ بنو قریظہ اور فتح مکہ کا ذکر ہے۔ اہمیت کے لحاظ سے جنگ احزاب اور فتح مکہ کا ذکر کافی ہے۔ جنگِ احزاب تاریخ اسلام میں بڑی معنی خیز اور دور رس نتائج کی حامل ہے اس لیے پہلے اس کے پس منظر کو سمجھنے کی ضرورت ہے تاکہ وید منتر کو آپ آسانی کے ساتھ سمجھ سکیں۔

جنگ خندق یا جنگ احزاب

پسِ منظر: پچھلے صفحات میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ طیطوس (ٹیٹس) کے ہاتھوں بیت المقدس کی دوبارہ تباہی کے بعد کچھ یہودی قبائل مدینہ و مدینہ کے اطراف میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ ان میں نضیر، بنو قینقاع، بنو مصطلق اور بنو قریظہ کو یاد رکھیے۔ انھیں یقین تھا کہ جناب موسیٰ، جناب یسعیاہ وغیرہ انبیاء اکرام نے جس "موعود نبی" کے متعلق خوشخبریاں سنائی ہیں۔ مدینہ اس کا دار الہجرت ہوگا۔ یہودی علماء اہالیانِ مدینہ کو آنحضورؐ کی بعثت کی خوشخبریاں سنایا کرتے تھے لیکن جب وہ تشریف لائے تو منحرف ہو گئے لیکن جنھوں نے پہچاننا چاہا وہ پہچان گئے، قرآن مجید میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے کہ:۔

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَعْرِفُوْنَہٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَھُمْ ؕ وَاِنَّ فَرِیْقًا مِّنْھُمْ لَیَکْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَھُمْ یَعْلَمُوْنَ۔ یعنی جنھیں ہم نے کتاب عطا فرمائی وہ اُس نبی کو ایسا پہچانتے ہیں جیسے آدمی اپنے بیٹوں کو پہچانتا ہے اور بیشک ان میں ایک گروہ ایسا بھی

ہے جو جان بوجھکر حق کو چھپاتا ہے (پارہ سیقول ۔ رکوع ۲)
مدینہ منورہ پہونچ کر آپ یہود پر برابر کرم کی بارش فرما رہے تھے ۔ لیکن یہود پہلے
حسد اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتے تھے ۔ ان کو اپنے اقتدار کے زیان کا اندیشہ تھا ۔ ان کے
لین دین کا جال نہایت وسیع تھا عورتوں تک کو رہن رکھ لیتے تھے ۔ بدکاریاں ان میں عام
تھیں جس کے مواقع اب ناپید ہوتے چلے جا رہے تھے ۔ غزوہ بدر نے جو دھاک بٹھادی
تھی احد نے اس کے اثر کو باطل کر دیا اور یہود و منافقین اور قبائل عرب پھر سے دلیر ہو گئے ۔
قریش کا اقتدار بحال ہو گیا وہ انہیں برابر بھڑکا رہے تھے ۔ ان حالات نے مدینہ کی فضا اس درجہ
مکدر کر دی تھی کہ رسول کریمؐ کو رات کے وقت باہر نکلنے میں جان کا خطرہ تھا ۔ سب سے پہلے بنو قینقاع
نے معاہدہ توڑا ۔ لڑنے پر انھیں جلا وطنی کی سزا دیگئی یہ قبیلہ سات سو افراد پر مشتمل تھا کعب ابن اشرف
قبیلہ کا سردار تھا نہایت متعصب و تنگ نظر ۔ آخر کو جہنم رسید ہوا ۔
اب بنو نضیر کی سنیے ۔ انھوں نے تجدید معاہدہ کے باوجود یہ سازش کی کہ آنحضورؐ
کو دھوکے سے بلا کر لائیں اور ایسی جگہ بٹھائیں کہ اوپر سے پتھر لڑھکا کر شہید کر دیا جائے لیکن
ان کا راز افشا ہو گیا ۔ آنحضورؐ نے ان کو جب سمجھانے کی کوشش کی تو وہ تلواریں سونت کر
کھڑے ہو گئے ۔ منافقوں کے سردار عبداللہ بن ابی نے ان کو اطمینان دلایا تھا کہ وہ دو ہزار
آدمی لے کر ان کی مدد کو آئے گا ۔ بنو قریظہ سے بھی یہی توقع تھی ۔ ان کی دلیری کا یہی سبب تھا ۔
آنحضورؐ نے مجبور ہو کر جب انھیں محصور کر لیا تو وہ از خود جلا وطنی پر راضی ہو گئے ۔ اب ذرا اسلام کی
رواداری ملاحظہ فرمائیے کہ یہ جلا وطن بھی ہوئے تو اس شان و طمطراق کے ساتھ کہ ان کے قافلے
پر جشن کا دھوکا ہوتا تھا ۔ تمام سامان اونٹوں پر لادے ہوئے اور دف پر گاتے بجاتے ہوئے
حالانکہ ان کی شرارتیں انھیں قتل کا مستحق بنا چکی تھیں ۔ یہ خیبر میں جا کر آباد ہو گئے ۔
یہود کا ایک تیسرا بہادر اور متمول قبیلہ بنو مصطلق تھا جو مدینہ سے نو میل کے فاصلے
پر آباد تھا ۔ یہ قبیلہ بھی رسول اکرمؐ سے معاہدہ کر چکا تھا ۔ کفار قریش نے اسے بھی بھڑکا

اور انھیں کی امداد و استعانت کے بھروسہ پر مسلح ہو کر میدان میں نکل آیا۔ باقاعدہ جنگ ہوئی پھر یہودی مارے گئے اور چھ سو کو قیدی بنالیا گیا جو بعد کو رہا کر دیئے گئے۔ ام المومنین حضرت جویریہؓ اسی قبیلے کے سردار حارث کی بیٹی ہیں۔

جنگ احزاب کے اسباب و انجام و پس منظر کو سامنے رکھنے کے بعد جنگ احزاب کے وجوہ آسانی کے ساتھ سمجھ میں آسکتے ہیں۔ بنو نضیر کو سازشِ قتل میں زندہ نکل جانے کے احساس کا بدلہ ان احسان ناشناسوں نے یہ دیا کہ خیبر میں آباد ہوتے ہی انتقام کی تدابیر سوچنی شروع کر دیں۔ ان کے رؤسا حی بن اخطب، کنانہ بن الربیع، اور سلام ابن ابی الحقیق خیبر سے مکہ پہونچے اور قریش مکہ کو جنگ کے لیے تیار کیا۔ قریش تو پہلے سے دشمن تھے۔ انھیں جنگ کے لیے آمادہ کرکے قبیلہ غطفان کے پاس گئے یہ بہت بڑا اور دلیر قبیلہ تھا۔ انھیں خیبر کی زرخیز زمینوں کا نصف حصہ دینے کا وعدہ کرکے اپنے ساتھ ملا لیا۔ اسی طرح دوسرے بڑے بڑے قبائل مثلاً بنو اسد، بنو سعد، بنو تمیم وغیرہ کو استیصالِ مدینہ کے لیے تیار کرلیا۔ المختصر عرب کی تاریخ میں یہ ایک انوکھا واقعہ ہے۔ عرب کے تمام شجاع قبائل کا بیک وقت آمادۂ پیکار ہونا، ان کے ساتھ یہود کی دولت کی فراوانی، قریش کا مذہبی اقتدار اور ابوسفیان جیسا جہاندیدہ اس لشکرِ جرار کا سپہ سالار۔ حقیقت میں عرب کی زمین دہل اٹھی اور سب کو اسلام کے خاتمہ کا یقین ہوگیا۔ مدینہ میں جو اس یلغار کی خبر پہونچی تو ایک ہلچل سی مچ گئی۔ آنحضورؐ نے حضرت سلمان فارسیؓ کی رائے کو ترجیح دیتے ہوئے مدینہ کے غیر محفوظ گوشہ کی طرف خندق کھودنے کا حکم دیا۔ خندق کھودنے میں خود بھی برابر کے شریک رہے۔ آخر معاندین کا دس ہزار کا لشکر جرار مدینہ پہنچ گیا اور پہونچتے ہی محاصرہ کرلیا۔ مدافعت کے لیے مٹھی بھر مسلمان تھے کم و بیش ایک ہزار۔ خندق کی وجہ سے دشمن مدینہ کی آبادی تک تو نہیں پہونچ سکا لیکن دور سے برابر تیر برسا رہے تھے اس شدت سے کہ بارہ بارہ گھنٹے تیر برستے رہتے تھے اور مسلمان بھوکے پیاسے اپنی مدافعت کر رہے تھے۔ تین تین وقت کھانا نصیب نہیں ہوتا تھا ایک مرتبہ صحابہ نے پیٹ کھول کر دکھایا کہ دیکھئے پتھر بندھے ہوئے ہیں لیکن جب آنحضورؐ

نے اپنا قلم مبارک کھولا تو ایک کی بجائے دو تپھر نظر آئے۔

بہرحال باہر سے تو یہ سیلاب امنڈا ہوا تھا اور ایک ہی ریلے میں اسلام کے بہا لیجانے کا داعیہ کر رہا تھا اُدھر اندرون آبادی منافقین اور یہود بنو قریظہ معروف سازش و فتن تھے۔ بنو نضیر کا سردار حی بن اخطب جلا وطنی کے وقت خدا کو ضامن دے کر وعدہ کر گیا تھا کہ آئندہ وہ کسی معاندانہ کارروائی میں حصہ نہ لے گا لیکن اسی حی بن اخطب نے آکر بنو قریظہ کو بھڑکایا اور وہ آنحضورؐ سے کئے ہوئے معاہدہ کو بالائے طاق رکھ کر حملہ آوروں کے ساتھی بن گئے۔ اس طرح مسلمانوں کو مدافعت کے لیے دوہرا انتظام کرنا پڑا۔ بائیس روز کے محاصرہ نے پریشان کر دیا۔ دشمن بھی بددل ہو گیا وہ یہ سمجھے ہوئے تھا کہ چشم زدن میں مسلمانوں کو ختم کر دیا جائے گا۔ لیکن اُس کی اُمید بر نہیں آئی۔ اِدھر محاصرے کی طوالت نے حوصلہ پست کر دیا اُدھر طرّہ یہ کہ شدید آندھی آئی جس نے خیمے اکھاڑ پھینکے۔ چولھوں پر ہانڈیاں اُلٹ گئیں۔ جانور قابو سے باہر ہو گئے۔ فضا تیرہ و تار ہو گئی۔ دشمن بھاگ کھڑا ہوا۔ الغرض محاصرہ چھوڑ کر بے نیل و مرام واپس لوٹ گیا۔ اس طرح چڑھی ہوئی آندھی اُتر گئی۔

اب آپ وید منتر کا لطف اُٹھائیں جس میں واقعہ مذکورہ بالا کی ہزاروں سال پیشتر اطلاع دی گئی ہے۔ منتر یہ ہے:۔

ते त्वा मदा प्रमदन तानि वृष्ण्या ते सोमासो वृत्रहत्येषु सत्पते ।

यत कारवे दश वृत्राण्य प्रति बर्हिष्मते नि सहस्त्राणि बर्हय: ॥६॥

(اتھروید کانڈ ۲۰، سوکت ۲۱ منتر ۶)

معنی:۔

تے۔ اُن یا انھوں نے — مَدَا۔ سرور دینے والوں نے

تُوَا۔ تجھے — اُمدن۔ مسرور کیا

تان۔ اُن کے

وِرْشنْیَاْ۔ بہادرانہ کارناموں نے	کَاْرُوْءْے۔ (احمد) حمد کرنے والے کے لیے
تے۔ اُن	دَشْ۔ دس
شُوْنَاشُو۔ مستانہ ترانوں نے	سہسرانی۔ ہزار
ورتر۔ دشمن	وِرْتَرَانِیْرِیَہ۔ دشمنوں کو
ہَنْتِیْشُو۔ مارنے میں	آپرتی۔ بغیر مڈھ بھیڑ کے
سَتْ پَتے۔ صادقوں کے رب	بَرہِشْمَتے۔ یگیہ، عبادت کرنے والے کے لیے۔
یَت۔ جب	نِی وَرْ ہِیَہ۔ تونے ہرادیا۔

مطلب:۔ اے صادقوں کے رب تجھے ان سرور دینے والوں نے، ان کے بہادرانہ کارناموں نے، اور اُن کے مستانہ ترانوں نے دشمن کی جنگ میں مسرور کیا۔ جب حمد کرنے والے، عبادت کرنے والے کے لیے تونے دس ہزار دشمنوں کو بغیر مڈھ بھیڑ مار بھگایا (ہرا دیا)۔

تشریح:۔ (۱) اِس وید منتر میں اللہ تعالیٰ کو "ست پتی" یعنی حق پرستوں یا صادقوں کا رب بتایا گیا ہے۔ صادقین صحابہ کرام کی شان ہے۔ جنگ احزاب میں ان کے متعلق فرمایا گیا۔ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ۔ یعنی مومنوں میں وہ مرد ہیں جنھوں نے سچ کر دکھایا اُس بات کو جس پر اللہ سے عہد کیا تھا۔ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۞ (احزاب: ۲۳) پھر بعضے تو ان میں وہ ہیں جو اپنی نذر پوری کر چکے اور بعضے ان میں منتظر (مشتاق) ہیں۔ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا اور اپنے قول و قرار میں ذرا سی بھی تبدیلی نہیں کی۔ انھیں مومنوں کے متعلق آگے فرمایا لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ۔ یعنی (یہ جنگ اس لیے ہوئی ہے) تاکہ اللہ تعالیٰ صادقین (حق پرست مومنوں) کو ان کے سچ کا صلہ دے۔ اس جنگ میں منافقوں نے بھی اپنا منافقانہ رنگ دکھایا تھا۔ ان کے متعلق فرمایا وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ۔ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا۔

رسول(احزاب۔ ۲۴) اور منافقوں کو وہ اگر چاہے تو سزا دے یا چاہے تو توبہ کی توفیق
بیشک اللہ تعالیٰ غفور رّحیم ہے۔

(۲) اس جنگ میں دشمن بظاہر ہر طرح سے غالب تھے۔ ایک طرف ان کا عظیم الشان
دوسری طرف مٹھی بھر مسلمان۔ مسلمانوں کے حلیف بنو قریظہ غدّاری کرکے دشمنوں سے مل گئے۔
مسلمانوں کے اندر منافقوں کی جماعت الگ سے اپنا کام کر رہی تھی۔ ان حالات میں مسلمانوں کا
استقامت ان کی بےنظیر شجاعت کی دلیل ہے اور پھر دشمن سے مرعوب نہ ہوکر اس بات
ہونا اور یقین کرنا کہ یہ وہی جماعت ہے (جس کی نشاندہی آنحضور کر چکے ہیں) انشاء اللہ
اور جیت مومنوں کی ہوگی اس لیے کہ اللہ و رسول کا ان سے وعدہ ہے اور وہ وعدہ سچا
ان کی حرارتِ ایمانی میں اور اضافہ ہوگیا۔ یہ بھی ان کے حق پرست اور صادق ہونے کی
کہ حق کی بات حق پرست ہی مانا کرتے ہیں۔ وید منتر میں ان تینوں حالتوں کا ذکر ہے

(ا) مَدَا یعنی سر ور دینے والوں نے اپنی فرماں برداری و تسلیم و رضا کے ذ
راضی کر لیا اور وہ ان سے خوش ہوگیا۔

(ب) وِدْشٹریہ۔ یعنی بہادرانہ کارناموں نے اور

(ج) سُوماسہ۔ یعنی مستانہ ترانوں نے۔

ظاہر ہے کہ اپنی قلتِ تعداد اور بے سروسامانی نیز حالتِ حصار میں ہونے کے
اٹھنا کہ فتح یقیناً ہماری ہے جہاں ان کی بہادری و شجاعت پر دال ہے وہیں یقین
پر پکار مظہر ہے۔

وید منتر کی ان بتائی ہوئی نشانیوں کی تصدیق کلام پاک سے اس طرح
" وَلَمَّا رَاَى الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْ
اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا (سورۂ احزاب
یعنی جب مومنوں نے ان لشکروں کو دیکھا تو پکار اٹھے یہ وہی جنگ

ہمت (۱۲) حزاب - یہ لشکر عظیم شکست خوردہ یہاں ہے - جس کی ہم کو اللہ اور رسول نے خبر دی تھی (یہ پکار ان کی ایک مستانہ ترانہ تھی) اللہ و رسول نے سچ فرمایا تھا (یہی یقین ان کے شجاع و نڈر ہونے کی دلیل ہے) اور اس سے ان کے ایمان و اطاعت میں اور اضافہ ہو گیا (جس کو دیکھ کر اللہ ان سے خوش ہو گیا)

(۳) مذکورۃ بالا تمام صداقتوں کے علاوہ وید منتر میں لفظ "کارُوے" بتا کر ایک ایسی صداقت کا اظہار کیا ہے جو جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ اور کسی پر منطبق نہیں ہوتی۔ "کارُوے" کے معنی ہیں اُستُوتا یعنی حمد کرنے والا یا احمد (مترجمہ پنڈت راجہ رام پروفیسر ڈی۔ اے۔ وی کالج لاہور بحوالہ میثاق النبیین صـ۲۸) آنحضورؐ نے میدانِ جنگ میں جو حمد گائی ہے وہ آج ہر حاجی مدینہ منورہ جا کر مسجد فتح میں گایا کرتا ہے۔ مسجد فتح میں حضورؐ نے پیر، منگل، بدھ تین روز دعا مانگی تھی تیسرے دن حضرت جبرئیلؑ نے آکر اجابتِ دعا کی بشارت دی پوری دعا اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ سے شروع ہو کر فَقَدْ تَرٰی حَالِیْ وَحَالَ اَصْحَابِیْ پر ختم ہوتی ہے۔ بشارت دی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اور آپ کے تمام اصحابؓ کو ہولِ دشمن سے محفوظ رکھا۔ حضورؐ یہ پیغام سنتے ہی دو زانو بیٹھ گئے اور دستِ مبارک پھیلا کر اور چشمانِ مبارک نیچی کر کے جنابِ باری میں عرض کیا۔ شُکْرًا کَمَا رَحِمْتَنِیْ وَرَحِمْتَ اَصْحَابِیْ یعنی اے مالک بے نیاز تیرا شکر ہے جس طرح تو نے مجھ پر رحم فرمایا۔ بعض صحابہ کرامؓ کسی مشکل کے درپیش آنے پر یہاں آکر دعا مانگا کرتے تھے۔

(۴) وید منتر میں "کارُوے" (حمد کرنے والے احمد کے لیے) دوسری صفت "بہ ہشٹھتے" بتائی ہے اس لفظ کا مادّہ "پرمِعی" ہے جس کے معنی مقدس گھاس جو ویدی (آتشکدہ) کے کناروں پر بچھائی جاتی ہے۔ استعارۃً اس سے مراد "عبادت گذار" ہوتی ہے۔ اس کے دوسرے معنی "روشن اور نورانی شخص" کے بھی ہیں یعنی جناب رسول کریمؐ میدانِ جنگ میں نہ صرف حمد گاتے ہیں دعا مانگتے ہیں بلکہ عبادت بھی کرتے ہیں۔ ان کی دعا و عبادت اتنی مقبول بارگاہ ایزدی ہے کہ [illegible] حرکت میں آجاتے ہیں اور دشمن [illegible] یعنی اپنی [illegible]

لئے ہوئے فرار ہوجاتا ہے۔ ویدمنتروں نے فرار کیوجہ بھی بتائی ہے۔ جیساکہ آگے آتا ہے۔

(۵) ویدمنتر میں جنگ احزاب کی پیشگوئی کا ایک اہم جز " دشمنوں کی تعداد بقدر دس ہ
ہے " ویدمنتر کی اس نشانی کو سامنے رکھکر یہ بات قابلِ غور ہے کہ دنیا کی تاریخ میں وہ کوا
جنگ لڑی گئی جس میں کفار اور مومنوں کی فوجوں کا تناسب وہ ہے جو آپ کے سامنے پیش ہ
یہ تناسب و تعداد بجز جنگ احزاب تاریخ عالم میں مفقود ہے اس لیے آنحضورؐ پر ایمان لا
لیے اور ان کی صداقت پر یقین رکھنے کے لیے بس یہی ایک نشانی کافی ہے۔

(۶) ویدمنتر کے دوسرے پد میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حمد کرنے والے (احمدؐ) کے
دس ہزار دشمنوں کو پسپا کردیا۔ دشمن کا لشکر جرار تھوڑی سی فوج کا مقابل تھا۔ اس کی غرض
اقتدار کی بحالی اور گذشتہ شکست کی بدنامی کو مٹانا تھا اور اس طرح اپنے دل کی حسرت
اپنے غصہ کو ٹھنڈا کرنا تھا۔ اس کی پہلی کامیابی اس کی کثرت تھی۔ دوسری کامیابی مومن
حلیف بنو قریظہ کا ان سے مل جانا تھا اور تیسری کامیابی یہ تھی کہ ان کے غلبہ سے مومنوا
کے اندر محصور ہوجانا تھا۔ ان پے درپے کامیابیوں کے باوجود ان کا میدان جنگ سے فرا
بلاشبہ ایک حیرت انگیز بات ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مقابلہ مسلمانوں سے
نہیں بلکہ خالق فطرت کے ساتھ تھا۔ ویدمنتر نے اس کی وجہ یہ بتلائی ہے۔ اِسی سوکت
اتا ۵ اور ۷، ۸، میں اندر سے خطاب ہے۔ رگوید میں اندر کی تعریف " رعد بکف
وہ رعد و کڑک کا دیوتا ہے جس سے خوف کھاکر دشمن بھاگ گیا۔

اتھروید کانڈ ۲۰، سوکت ۲۱، منتر ۳ میں وجہ فرار بیان کی گئی۔ لکھا ہے " ہما
پیار کرتی ہوئی اندر کے پاس پہونچی ہیں (دعا بیان کی جاچکی ہے) اُس اندر نے اپنے
سے آسمان اور زمین دونوں کو ہلادیا ہے اور بغیر مقابلہ دشمن کو مار ڈالا ہے " گویا اس
کے ایک ادنیٰ حاکم " اندر " یعنی تند ہوا اور رعد و کڑک کے ڈر سے دشمن میدان ج
بھاگ گیا حالانکہ یہ آندھی دونوں فریقوں پر یکساں چلی تھی ایک مومنوں کے لیے

دشمنوں کے لیے ہلاکت کا سبب بن گئی۔

وید منتر کے اس دوسرے پد کی تصدیق قرآن شریف نے ان الفاظ میں کی ہے۔

" وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوا خَيْرًا ۚ وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِينَ الْقِتَالَ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيزًا ۝

یعنی اللہ تعالیٰ نے کافروں کو ان کے غصہ میں بھرا ہوا ہٹا دیا کہ ان کی مراد کچھ بھی پوری نہ ہوئی اور جنگ میں اللہ تعالیٰ ہی مومنوں کے لیے کافی ہوگیا اور اللہ بڑی قوت والا اور بڑا زبردست ہے۔ (سورہ احزاب[۱۵])

اللہ تعالیٰ نے اپنی قوت کا مظاہرہ اس نازک موقع پر کس طرح کیا؟ اس کی تشریح اسی سورۃ کی نویں آیۃ میں ہے:۔

" يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَاءَتْكُمْ جُنُودٌ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا وَجُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا ۚ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا ۝ یعنی اے مومنو یاد کرو اللہ کا انعام واکرام اپنے اوپر کہ جب تم پر بہت سے لشکر چڑھ آئے تو ہم نے ان پر ایک آندھی بھیجی اور ایسی فوج بھیجی جو تم کو دکھائی نہیں دیتی تھی اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو دیکھتے تھے (اعمال کا ذکر پچھلے سطور میں ہو چکا ہے کہ جن سے خوش ہو کر اللہ جلّ شانہٗ نے مومنوں پر یہ فضل فرمایا)

فائدہ:۔ وید منتر کی ان تمام تشریحات کو سامنے رکھ کر غور کیجئے کہ منتر کے رشی نے کس طرح ہزارہا برس پیشتر جنگ احزاب کے متعلق پیشگوئی کی ہے جو حرف بحرف سرکار دو عالم تاجدار مدینہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صادق آتی ہے۔ اس پیشینگوئی میں کئی باتیں ہیں مثلاً۔

(۱) ہزارہا سال گذرنے کے بعد ایک جنگ کا ذکر۔ (۲) اللہ تعالیٰ صادقین کی جماعت کو کامیاب کرے گا۔ (۳) صادقین بے مثال بہادرانہ نعرہ لگائیں گے یعنی دشمن سے خوف زدہ نہ ہوں گے۔ (۴) مومنوں کے نعرۂ مستانہ سے اللہ تعالیٰ راضی ہو جائے گا۔ (۵) اس جنگ کا سپہ سالار اللہ کی حمد کرنے والا (احمدؐ) ہوگا۔ (۶) دشمن کی تعداد دس ہزار ہوگی (۷) دست بدست جنگ کی نوبت نہیں آئے گی۔ (۸) دشمن کا لشکر جرار یقینی غلبہ کے باوجود فرار ہو جائے گا۔ (۹) دشمن

کے فرار کا سبب اللہ تعالیٰ کا ایک معجزانہ نشان (اندر) ہوگا (تَحَوِّیاً غَزْنِیْما لفظ اندر کے مترادف ہے) (۱۰) وہ معجزانہ نشان اندر دیوتا یا بالفاظِ دیگر بجلی کی کڑک اور سخت آندھی کی شکل میں ظاہر ہوگا۔

عرض کرنے کا مدعا یہ ہے کہ ہمارے ہندو بھائی وید منتر کے رشی کی بتائی ہوئی باتوں پر سنجیدگی کے ساتھ غور کریں اور بزرگ رشی کی بتائی ہوئی باتوں کو جو سب کی سب آنحضورؐ کی تصدیق کرتی ہیں۔ مان کر عزت و عظمت کا اعتراف کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ جناب رسول اللہؐ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کر کے ہی دونوں جہان میں سرخروئی حاصل کی جاسکتی ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ سے ظاہر ہے۔ فرمایا:- لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا ۝ یعنی لوگوں کے لیے (ایسے لوگوں کے لیے) جو اللہ اور یوم آخرت سے ڈرتے ہوں اور کثرت سے ذکر الٰہی کرتے ہوں۔ جناب رسول اللہؐ کا اسوۂ حسنہ (قولی و عملی دونوں شکل میں) موجود ہے۔ (سورہ احزاب۔ آیۃ ۲۱)

اللہ تعالیٰ ان کے اسوۂ حسنہ کو اپنانے کی توفیق ہم سب کو مرحمت فرمائے آمین۔

مسئلہ کفائت کی حقیقت اور اس کی شرعی حیثیت

نکاح کی ضرورت

مولوی محمد یوسف صاحب قاسمی بہرائچی

تمام انسانوں کو دنیا میں زندہ رہنے کے لیے ایک طرف اسباب معاشی کا اختیار کرنا ضروری ہے، تو دوسری طرف بقاء نوع اور خواہشات کی جائز تکمیل کے لیے شادی بیاہ بھی ناگزیر ہے' اسی لیے بعض صورتوں میں نکاح فرض اور واجب ہو جاتا ہے، البتہ عام معتدل حالات میں مسنون ہے۔

شادی بیاہ کرنے میں وہ طریقہ اختیار کرنا بھی ضروری ہے جس سے انسانیت حیوانیت سے ممتاز رہ جاوے، اور صنف نازک ہوسناک لوگوں کی ہوس اور بہیمیت کا شکار نہ ہونے پاوے" اس مقصد لیے کچھ رشتے حرام اور کچھ حلال قرار دے گئے۔ اور رشتۂ ازدواج قائم کرنے کے لیے کچھ شرائط قیود لگا کر مخصوص طریقہ متعین کیا گیا۔

زوجین میں موافقت صنفِ نازک کے مقام و مرتبہ کی عزت اور اس کی عفت و عصمت کی حفاظت صورت میں ہو سکتی ہے جبکہ اس رشتہ کو مدتِ عمر تک باقی رکھنے کا انتظام کیا جاوے، نکاحِ مؤقت اور متعہ سے یہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا، نیز رشتۂ ازدواج باقی رہنے کے لیے توافق و اتحاد ضروری ہے، جس کی خشت اوّل بنیادی عقیدہ کا اتحاد ہے، بنیادی عقیدہ میں فرق و اختلاف ہی کی وجہ سے مشرک عورتوں سے نکاح حرام ہے، البتہ اہل کتاب کی لڑکیاں مسلمان قبول کر سکتے ہیں۔ کیونکہ اہل کتاب اور مسلمانوں کے عقیدہ وغیرہ میں قرب و مماثلت ہے۔ ارشاد خداوندی ہے۔

الیوم احل لکم الطیبات وطعام الذین اوتوا الکتاب حل لکم وطعامکم حل لھم والمحصنٰت

آج تمہارے لیے (اے مسلمانو) تمام پاکیزہ چیزیں حلال کر دی گئیں، اہل کتاب کا کھانا ان

مِنَ الْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُحْصَنَاتِ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتَابَ مِنْ قَبْلِکُمْ (سورۂ مائدہ)

میں ذبیحہ بھی شامل ہے تمہارے لیے اور تمہارا کھانا ان کے لیے حلال ہے، مسلم عورتیں اور اہلِ کتاب کی پاکدامن تمہارے لیے حلال ہیں۔

زوجین میں کفائت البتہ بعض اہم اور معقول وجوہات کی بنا پر شریعت اسلامیہ نے کسی م
کو کسی بھی اہلِ کتاب یا غیر مسلم مرد سے نکاح کی اجازت نہیں دی ہے، اور یہ حرمت ابدی ہـ
عادات و اطوار میں مماثلت اور فکری ہم آہنگی سے بھی اتحاد و موافقت کو تقویت پہنچتی
افکار و عادات وغیرہ میں تبدیلی گردوپیش کے نئے اثرات سے بتدریج ممکن ہے، ا
میں اتحاد و یگانگت، انعقاد نکاح یا بقاء نکاح کے لیے بنیادی شرط نہیں ہے، البتہ
میں رعایت رکھنا اس وقت تک بہتر ہے جب تک اس سے زیادہ مفسدہ نہ پیدا
فکری ہم آہنگی اور عادات و اطوار میں یگانگت و مماثلت ہی کا نام کفائت ہے جو
میں معتبر ہے لیکن اس سے اشرف و ارذل یا ادنیٰ اعلیٰ طبقات کا ثابت رکھنا مقصود نہیں۔

صاحب ہدایہ کے الفاظ میں:۔

لان انتظام المصالح انما یکون بین المتکافئین عادۃً فان الشریفۃ حسباً ونسباً تابی ان تکون فراشاً للخسیس فلابد من اعتبارہا (ہدایہ ج ۲ ص ۲۹۹)

کفارت کا اعتبار اس وجہ سے ناگزیر ہے کے درمیان گھریلو مصالح کا انتظام کتا یا" والفت ہی کے وقت بخوبی ہوسکتا ہے اور الفت، عادات و اطوار میں ہم آہنگ جوڑے ہوا کرتی ہے، کیونکہ جو عورت اپنے کو حسب و نسب کے اعتبار سے شریف و بلند سمجھتی ہے، وہ ...
ماتحتی و فروشیت قبول کرنے سے انکار کر دے گی۔

اسی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جو عورت تعلیم و تہذیب وغیرہ کی وجہ سے اونچ
طبقاتی ذہن نہ رکھتی ہو اور خود برضا و رغبت عرفی غیر کفو میں اپنے ولی کی رضامندی پاکر نکاح کرے

پھر رکاوٹ نہ ہوگی۔

فارت فی نفسہٖ مقصود نہیں کیونکہ یہ کفارت فی نفسہٖ مقصود نہیں ہے، اگر کفارت فی نفسہٖ مقصود ہوتی زوجہ کی جانب بھی کفارت کی شرط معتبر ہوتی۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ علامہ شامی کے الفاظ میں:

لا تعتبر من جانبها لان الزوج مستفرش فلا تغیظه دناءة الفراش (شامی جلد دوم ص ۳۱۲)

(معاملہ چونکہ باہمی رضامندی و موافقت کا ہے) اسی وجہ سے عورت کی جانب سے کفارت کا اعتبار نہ ہوگا کیونکہ شوہر صاحبِ فراش ہے اس کو مفروش (بیوی) کے طرفی) ادنیٰ ہونے سے نفرت و ناپسندیدگی نہ ہوگی۔

اس طرح زوالِ کفارت سے نکاح بھی زائل ہوجاتا حالانکہ باقی رہتا ہے، زائل نہیں ہوتا۔

الکفاءة اعتبارها عند ابتداء العقد فلا یضر زوالها بعده (در مختار ج ۲ باب الکفاءة)

عقدِ نکاح کرتے وقت شروع میں کفارت کا اعتبار ہے، بعد عقد اگر کفارت زائل ہوجائے اس سے کوئی نقص نہیں پیدا ہوتا۔ مثلاً صالح شخص فاسق ہوجائے۔

کفارت کی غرض دراصل کفارت کا اعتبار کرنے سے ایک طرف عورت کے جذبات کی رعایت مقصود گو کہ وہ فاسد خیالات پر مبنی ہوں کیونکہ نباہ اس کو کرنا ہے، تاکہ زوجین میں خوش دلی اور باہمی احترام کے ساتھ تعلقات استوار رہیں، اور دوسری طرف ہمدرد و شفیق اعزہ و اولیاء کے جذبات کی رعایت بھی مقصود ہے: کیونکہ گھریلو معاشرہ کو اختلال و برہمی سے محفوظ رکھنے، اور خاندان کے اخلاق و معاملات اندرونی و بیرونی فتنوں سے بچانے کی ذمہ داری قبل از ازدواج عورت کے ولی پر ہے، اسی لئے غیر کفو سے بلا اجازت ولی نکاح کرنے کی صورت میں لڑکی کے نکاح کو فسخ کرنے کا ولی کو اختیار ملتا ہے، لیکن ولی کے ذمہ اس من مانی نکاح کو فسخ کرانا واجب نہیں بلکہ باقی بھی رکھ سکتا ہے، لان التفریق لیس بواجب علیه بل هو رخصة فی حقه۔ رفع الحکمین

امتیازی جذبات کی و صلہ شکنی کی گئی ہے اور اگر اس نکاح سے حمل بھی ہوگیا ہو تو اب ولی کا یہ حق فسخ بھی ختم ہوجاتا ہے، کیونکہ فی نفسہٖ نکاح مقصود ہے اور ان جذبات کی رعایت [illegible] ان کو درست قرار دینا مقصود ہے۔ بلکہ ان جذبات کی [illegible]

ان کی شریعت اسلامیہ نے حوصلہ شکنی کی ہے اور اس کو ختم کرنے کی ترغیب دی ہے۔

کفارت کا اعتبار ان چیزوں میں کیا گیا ہے، (۱) نسب (۲) دین داری (۳) مال (۴) آزادی (۵) اسلام (۶) پیشہ، اوّل کی تین چیزیں عرب میں معتبر ہیں، اور پہلی چھوڑ کر پانچ عجم میں معتبر ہیں۔

نسب میں کفارت اوّل نسب کے معاملہ میں اولاً عرب و عجم میں تفریق کی، پھر عرب میں قریش اور غیر قریش کی تفریق کی گئی۔ عجمی لوگوں کا درجہ اس قدر گھٹا پایا کہ خواہ عالم بادشاہ ہوں لیکن کسی عربی النسل عورت کے کفو نہیں ہو سکتے، والعجمی لا یکون کفواً للعربیۃ ولو کان العجمی عالماً او سلطاناً وھو الاصح (درمختار ج ۲ باب الکفارۃ)

اس میں نسل و خاندان، علاقہ و زبان کا امتیاز اور عدم مساوات دہرف فاسد ہے اور اسی پر مبنی جذبات کی رعایت ہے، حالانکہ انھیں امتیازات کے خلاف

امتیازات کے خلاف اعلاناتِ نبوی بے شمار نبوی اعلانات ہیں جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں

(الف) لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لاسود علی احمر ولا لاحمر علی اسود الا بالتقویٰ۔

فی نفسہ عرب کو عجم پر اور عجم کو عرب پر، کالے کو گورے پر اور گورے کو کالے پر کوئی فضیلت اور بڑائی نہیں، ہاں تقویٰ و کردار کے ذریعہ بڑائی ہو سکتی ہے جس کو حاصل کر سکتے ہیں۔

(ب) یا معشر قریش ان اللہ قد اذھب عنکم نخوۃ الجاھلیۃ وتعظمھا بالاباء، الناس من آدم وآدم من تراب (ابن ہشام)

اے قریش کے لوگو جاہلیت کا غرور اور نسب کا فخر مٹا دیا، تمام انسان آدم کی نسل ہیں اور آدم مٹی سے ہیں۔

(ج) إن اللہ اذھب عنکم عُبِّیّۃ الجاھلیۃ فخرھا بالاباء انما ھو مومن تقیٌّ و فاجر شقیٌّ، الناس کلھم بنو آدم وآدم خلق من تراب۔ (ترمذی)

خدا نے جاہلیت کے زمانے کے غرور اور نسب کے فخر مٹا دیا۔ انسان یا متقی ایماندار ہے، یا گناہگار بدبخت ہے۔ تمام انسان آدم کے بیٹے ہیں اور آدم مٹی سے پیدا ہوئے تھے۔

قرآنی آیات سے بھی یہی ثابت ہے، آیات کے چند ٹکڑے ملاحظہ ہوں۔

(د) وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَّقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا۟ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقَاكُمْ۔ (قرآن کریم)

تم کو خاندان و قبائل میں اس لئے منقسم کر دیا تاکہ آپس میں شناخت و تعارف کر سکو، جس طرح کہ گھوسی اور دہلوی کہنے میں تعارف مقصود ہے اس سے تفاخر مقصود نہیں کیونکہ زیادہ شریف اللہ کے نزدیک وہ ہے جو عمل و کردار میں تم میں بڑھا ہوا ہے۔

(ہ) إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ (قرآن کریم) تمام مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

(ی) إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّأُنْثَىٰ (الآیہ) سب کے ماں باپ (آدم و حوا) ایک ہی ہیں۔

سب کا جوہر اور خون ایک ہی ہے۔ ع کردآفرینش زیک جوہر اند،

ان میں رنگ و نسل، علاقہ اور زبان کی بنیاد پر قائم ہونے والے تمام امتیازات و تعصبات ختم کر کے ایک عالمگیر ملی وحدت میں ضم ہو جانے کی واضح ترغیب ہے، اور یہ تمام باتیں پہلے دنیا کے لیے اور نتیجۃً آخرت کے لیے ہیں، فلان الدنیا مزرعۃ الآخرۃ (حدیث) دین اور دنیا کی تقسیم، پھر دنیا میں ہر روا و ناروا سلوک و امتیاز کو جائز قرار دینا ایسی خطرناک غلطی ہے جو سنگین نتائج کی حامل ہے۔

فضائل اور مناقب کفاءت کی بنیاد نہیں ہیں | یہاں پر یہ بھی ذہن نشین رہے کہ بعض شعوب و قبائل کے مناقب، بعض علاقوں کے باشندوں کی خوبی اور عمدہ اوصاف، اور بعض مقامات مقدسہ کے [illegible] وامحافظین کے فضائل احادیث پاک کے اندر جو بیان کئے گئے ہیں، ان مناقب و فضائل کو کفاءت کی بنیاد نہیں بنایا جا سکتا ہے اور نہ فقہاء مجتہدین نے بنایا ہی ہے، نیز نسبی [illegible]رت کے سلسلہ میں ایک ضعیف حدیث بھی ہدایہ میں درج ہے جس کو تمام محدثین نے ضعیف [illegible]رنا قابل استناد قرار دیا ہے، اس کی تفصیل خود ہدایہ کے حاشیہ (نصب الرایہ فی تخریج ہدایہ [illegible] صفحہ) پر بھی موجود ہے۔ اس لیے اس کو بھی صحیح اور قوی الاسناد احادیث اور آیات کے مقابلہ [illegible] بنیاد نہیں بنایا جا سکتا ہے۔

[illegible]ت میں کفاءت | دوم: دینداری کے سلسلہ میں جس قدر تاکید احادیث پاک میں آئی

ہے، اسی قدر لاپرواہی عوام وخواص میں برتی جا رہی ہے اس کی کچھ تفصیل مقالہ کے اذ جاءکم من ترضون دینہ وخلقہ الخ کے ضمن میں درج ہے۔

مال میں کفاءت | سوم مال کے اعتبار سے مہر معجل کی ادائگی اور ایک ماہ نان ونفقہ ہونا کافی بتلایا گیا، لیکن امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ ایک روایت کی رو سے مالداری کے قائل ہیں اور وجہ وہی فخر اور دفع عار ہے۔ فاما الکفاءۃ فی الغنی فمعتبرۃ فی قولہما حتی ان الفائقۃ فی الیسار لایکافیہا القادر علی المہر والنفقۃ لان الناس یتفاخرون بالغنی ویتعیرون بالفقر (ہدایہ ج ۲ ص۳۰۰) اس میں غریب وامیر میں امتیاز اور امیر پر فخر ومباہات اور مفلس وغریب کو کم درجہ سمجھنے کے جذبات ہیں، حالانکہ احادیث پاک خیالات کو مٹا دینے کا اور ہر مسلم کے اکرام واحترام ومحبت کا حکم ہے خواہ وہ غریب

آزادی میں کفاءت | چہارم آزادی میں کفاءت یعنی غلام مرد آزاد عورت کا کفو نہیں، آزاد شدہ غلام بھی اس عورت کا کفو نہیں ہو سکتا جو اپنی اصل کے اعتبار سے آزاد ہو یا آزاد ہوا ہو۔ (ہدایہ ج ۲ ص۳۰۰)

اسلام لانے میں کفاءت | پنجم اسلام لانے کے تقدم وتاخر میں یعنی وہ شخص جس کے والد مسلمان ہوئے ہیں ایسے شخص کا کفو نہیں ہو سکتا جس کی اوپر سے کئی پشتیں اسلام میں چلی آرہی ہوں (ہدایہ ج ۲ ص۳۰۰) آزادی اور اسلام لانے میں کفاءت کا اعتبار بھی دفع عار اور فخر ومباہات کی رعایت کر کے ہے حالانکہ فخر ومباہات اور دوسروں کو اپنے سے کمتر سمجھنے کو شرعاً داخل گناہ قرار دیا گیا۔

پیشہ میں کفاءت | ششم پیشہ میں عجمی تصورات اور عرف فاسد کا اعتبار کر کے طبقات بنائے گئے اور ادنیٰ پیشہ کا لڑکا اعلیٰ پیشہ کی لڑکی کا کفو نہیں قرار دیا گیا۔ اس کی بھی وجہ وہی فخر ومباہات ہے۔ وجہ الاعتبار ان الناس یتفاخرون بشرف الحرف ویتعیرون بدناءتہا

(ہدایہ ج ۲ ص۳۰۱)

یہاں تک کہ عرب میں بھی اگر یہ عجمی تصورات قائم اللہ عرف فاسد رائج ہو جاوے تو ان میں بھی پیشہ میں کفائت معتبر ہوگی، لیکن زمانۂ نبوی سے لے کر آج تک بفضلہ تعالیٰ اسلامی ممالک بالخصوص

عرب میں پیشوں کی پوزیشن | عرب کے خطہ کی فضا ان فاسد تصورات سے پاک صاف ہے، ان کے اذہان پیشہ کی بنیاد پر ذات پات کی تقسیم سے بالاتر ہیں، وہ ایک سبزی فروش، ایک کپڑا بنکر اور ایک چرواہے کو بھی یا شیخ کہہ کر پکارتے ہیں، اور خود بھی بوقت ضرورت ان پیشوں کے اختیار کرنے میں ذرہ بھر بھی عار یا جھجک تک محسوس نہیں کرتے، درحقیقت مقامات مقدسہ کا فیضان صحبت نبوی کے متبرک آثار نسلاً بعد نسل موجود رہنے کے ساتھ ہی حضورؐ کا یہ ارشاد بھی ان کے سامنے ہے، جس میں ہر طرح سے حلال کمائی حاصل کرنے کی ترغیب دی گئی ہے اور تمام جائز پیشہ اختیار کرنے والوں کی ہمت افزائی فرمائی ہے۔

پیشہ ودستکاری کے بارے میں حدیث |

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما أکل احدٌ طعاماً قط خیراً من ان یأکل من عمل یدہٖ وان نبی اللہ داؤدؑ کان یأکل من عمل یدیہ (بخاری شریف)

نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا کہ اپنے ہاتھ کی کمائی سے بہتر کھانا کسی شخص نے کبھی نہیں کھایا اور اللہ تعالیٰ کے نبی داؤدؑ اپنے ہاتھوں کی کمائی کھاتے تھے۔

شرعاً کوئی پیشہ ذلت نہیں بن سکتا | اس میں عمومیت ہے کہ کوئی بھی جائز پیشہ آدمی اپنی صلاحیت و صوابدید کے مطابق اختیار کر سکتا ہے، پیشوں میں فی نفسہ اونچ نیچ نہیں اور نہ کسی پیشہ کو مستقل ذات اور گوت بنایا جا سکتا ہے، پیشوں کی بنا پر ملت کی تقسیم کرنا قطعاً غیر اسلامی ہے۔ کتب فقہ میں بھی مندرجہ ذیل عبارتوں سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ پیشہ سے بالفعل (موجودہ) پیشہ مراد ہے۔

پیشہ میں تبدیلی سے حکم میں تبدیلی ثابت ہے | اور پیشہ کی تبدیلی اور اس کی پوزیشن کی تبدیلی دونوں ممکن ہے جس کے ساتھ حکم بھی بدل جاوے گا۔

(۱) امالوکان دبّاغاثم صار تاجراً — اگر ایک وقت میں دباغت کا پیشہ
فان بقی عارها لم یکن کفوا والا لا — تھا پھر تجارت کا پیشہ اختیار کر کے تا
(درمختار ج ۲ باب الکفارۃ) — دباغت کی عار باقی ہے تو تاجر کا کفو نہ
اگر اس کی پوزیشن بدل گئی ہے تو وہ تاجر کا کفو ہوگا۔ اس میں پیشہ کی اور اس کی پوزیشن
حکم میں تبدیلی کو بتلایا ہے۔

(۲) امام ابوحنیفہؒ ایک روایت کی رو سے پیشہ میں کفائت کا اعتبار اس۔
کہ اس میں تبدیلی ممکن ہے، دلیل کے الفاظ یہ ہیں۔

وجہ القول الآخر ان الحرفۃ لیست بلازمۃ — قول آخر (عدم اعتبار) کی وجہ یہ
ویمکن التحول عن الخسیسۃ الی النفیسۃ — پیشہ ہمیشہ کے لیے لازم نہیں ہے،
منھا۔ (ہدایہ ج ۲ صلا۳۱) — سے نفیس اور عمدہ پیشہ کی طرف
(ایسی صورت میں کس کا

(۳) ولاخیّاط لبزاز وتاجر ولاھما لعالم — نہ درزی کا پیشہ ور بزاز (کلاتھ مرچنٹ
او قاضی (درمختار ج ۲ باب الکفارۃ) — کفو ہو سکتا ہے، اور نہ بزاز اور
کرنے والا کسی عالم اور قاضی کے

اس میں بزازی اور تجارت کے لیے اور عالم وقاضی ہونے کے لیے کسی خاص
کی قید وتخصیص نہیں ہے بلکہ ہر قبیلہ وبرادری کا فرد ہو سکتا ہے، اور عالم و
سب سے بڑھکر بیان کیا گیا ہے۔ لیکن افسوس کہ آجکل مذہبی مسند ولے پر کبھی ا
عزّت واحترام ہے جو بقول ذات ونسب پرستوں کے اونچی ذات کا ہو۔ بالخصوص
لڑکی کی ایک ہم قوم جاہل بازاری غنڈہ گرد، مفلس کے ساتھ تو کر دیں گے، لیکن
کے عالم یا جج، یا وکیل و بیرسٹر، مہذب، با اخلاق، خوشحال، مالدار کے سا
سمجھیں گے، خواہ وہ اپنے کو عربی نسل کی طرف منسوب کرتے ہوں یا عجمی نسل

(۵) واما الوظائف فمن الحرف فصاحبها کفوٌ للتاجر غیر دنیئۃ کبوابتہ
(درمختار ج ۲ باب الکفاءۃ)

وقف کے وظائف اور ملازمتیں (جیسے امامت و خطبہ خوانی وغیرہ) پیشوں میں داخل ہیں، تو وظیفہ دار ملازم تاجر کا کفو ہو سکتا ہے، بشرطیکہ وہ ملازمت دربانی کی طرح پوزیشن کے اعتبار سے معمولی اور ادنیٰ نہ ہو۔ اس میں بھی خاندان و برادری کی تخصیص نہیں۔

(۶) وذو تدریس او نظر کفو لبنت الامیر بمصر (حوالا بالا)

اور مدرس (تعلیمی خدمات انجام دینے والا) یا ناظر (سپروائزر، نگرانی کرنے والا) مصر جیسے شہر میں امیر و حاکم شہر کی لڑکی کا کفو ہو سکتا ہے (مدرسین وغیرہ کی پوزیشن بلند ہونے کی وجہ سے)

گورنمنٹ اور پرائیویٹ ملازمت بھی پیشہ ہے اور ان میں کفائت کی نوعیت

اس جیسی بہت سی فقہی عبارتوں پر غور کرنے سے یہ معلوم و ثابت ہوتا ہے کہ تمام گورنمنٹ ملازم (خواہ کسی خاندان و برادری کے ہوں) آپس میں ایک دوسرے کے بھی کفو ہو سکتے ہیں۔ بشرطیکہ عہدہ و پوزیشن میں مماثلت پائی جاتی ہو۔ نیز یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ پرائیویٹ اور گورنمنٹ ملازمتوں کو بھی پیشہ میں اگر شمار کیا جائے تو تمام سرکاری ملازمین اپنے ڈپارٹ اور محکمہ میں ہی پوزیشن و عہدہ کے مطابق ایک دوسرے کے کفو ہو سکتے ہیں پرائیویٹ ملازمین اور مل ملازمین کا بھی یہی حکم ہوگا۔ نیز تمام کاریگر صنعت و حرفت کی پوزیشن کے مطابق آپس میں ایک دوسرے کے کفو ہو سکتے ہیں، خواہ پہلے سے وہ کسی خاندان و برادری سے تعلق رکھتے ہوں، مثلاً ٹیلرنگ اور درزی کا کام کرنے والے ایک دوسرے کے کفو ہو سکتے ہیں،

تمام بیڑی و سگریٹ بنانے والے کاریگر، تمام ڈاکٹر، تمام انجینیر، تمام کاشتکار وغیرہ آپس میں ایک دوسرے کے کفو ہو سکتے ہیں۔

کیونکہ علامہ شامی کے الفاظ ہیں:۔

(۸) ان الموجب ھو استنقاص اہل العرف — پیشہ میں کفارت کے اعتبار کا سبب اہل عرف

فیہ ورمعہ، وعلی ھذا ینبغی ان یکون الحائک کفواً للعطار بالاسکندریۃ لما ھناک من حسن اعتبارھا وعدم عدھا نقصا۔ (شامی ج ۲ ص ۳۲۲)

کا ناقص اور گرا ہوا سمجھنا ہے لہٰذا عرف کے ساتھ ہی دائر رہیگا۔ اور اس بنیاد پر تو کپڑا بُنکر اسکندریہ جیسے شہر میں عطار کا کفو ہو سکتا ہے، کیونکہ وہ بننے کے پیشہ کی پوزیشن سے بلند ہے۔ وہاں اس کو باعث نقص نہیں سمجھا جاتا۔

پیشوں کی موجودہ حیثیت

باختلاف زمان ومکان پیشہ میں پوزیشن کی تبدیلی سے حکم میں تبدیلی ضروری ہے اور حالات حاضرہ کا بغور سنجیدگی سے مطالعہ کیا جاوے تو واضح ہو جائے گا کہ اب جاگیرداری، نوابیت، خاندانی اور شخصی حکومتوں کے خاتمہ کے ساتھ ہی وہ ذہنیت بھی ختم ہو چکی ہے۔ موجودہ عوامیت اور جمہوریت میں کوئی پیشہ فی نفسہ اعلیٰ وادنیٰ نہیں سمجھا جاتا۔ حکومت اور عوام تمام ہی پیشوں اور ان کے کاریگروں کی عزّت وہمّت افزائی کرتے ہیں۔ سرکاری اور پرائیویٹ ملازمین کو بھی ایک ہی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، اس جمہوری اور عوامی سوسائٹی میں ملازمت، صنعت وحرفت تجارت وزراعت یکساں اہمیت اور حیثیت رکھتی ہیں، جیساکہ خلافتِ راشدہ میں اور اس کے بعد کچھ دنوں تک رہا۔ آج اگر کسی کو ذلیل یا نیچا سمجھا جاتا ہے، تو وہ محض پاس پڑوس کے اثرات کی وجہ سے کہ وہ فلاں قوم کا ہے اور وہ فلاں خاندان کا۔ فی نفسہ پیشہ عزّت وذلّت کا مدار نہیں رہ گیا۔ چنانچہ ایسے بھی لوگ روزانہ دیکھنے میں آئیں گے جو ایک ہی مل وکارخانہ، یا ایک ہی ٹیلرنگ ہاؤس کے اندر ایک ہی کام کرتے ہیں، پھر بھی آپس میں ایک دوسرے پر، فقرہ بازی، تحقیر، ذات پات کی بنیاد پر کرتے ہیں، نیز اس کا بیّن ثبوت یہ بھی ہے کہ آج جس علاقہ میں جو گھریلو دستکاری پھیلی ہوئی ہے اس علاقہ کی تمام ہی برادریاں اور قبائل اس کو احساسِ عزّت وخودداری کے ساتھ اپنائے ہوئے ہیں، اس لیے اب پیشوں میں پوزیشن کی تبدیلی سے اس عموم بلوی کے تحت، حکم کفاءت میں تبدیلی ناگزیر ہے۔

پیشوں میں پوزیشن کا سوال کب سے ہوا

یہاں یہ بھی واضح کر دینا فائدہ سے خالی نہیں کہ خلافتِ راشدہ کے بعد جب طوائف الملوکی عام ہوئی اور شخصی وخاندانی حکومتیں قائم ہوئی تو معاشرتی حالات جاگیردا

بن گئے، عجمی تصورات، نسلی امتیاز وغیرہ کے غیر اسلامی عرف وعادات نے مسلم معاشرہ کو بھی صید زبوں بنا یا، اور نتیجۃً عجم میں مسلم معاشرہ کا بھی عرف وتخیل اسی لائن پر چلا گیا جس سے ہدایت الٰہی کھینچ کر لائی تھی، یا اسی یا اسی لائن پر رہ گیا جس پر قبل اسلام تھا، اگرچہ ہدایت الٰہی یعنی قرآن و حدیث کی تعلیمات جاہلیت کے عرفِ فاسد، بُری عادات اور غلط افکار و نظریات کو ختم کرنے کے لیے ہے، لیکن معاشرتی ضرورت کے تحت اسی عرفِ فاسد اور طبقاتیت پر مبنی جذبات کی رعایت کرتے ہوئے فقہائے کرام نے اُسی زمانے میں فقہی احکام ومسائل مدوّن کیے اور پوری للہیت اور خلوص کے ساتھ عجم کے مخلوط معاشرہ میں اس زمانہ کے تقاضہ کے مطابق رہنمائی کا کام انجام دیا، خطۂ عرب کے معاشرہ میں عرف فاسد اور عجمی تصورات کا اتنا اثر نہیں ہو سکا تھا اس لیے حجاز مقدس کے سرخیل اعظم امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس عرفِ فاسد اور طبقاتیت کی رعایت نہیں کی، چنانچہ ان کے مسلک کے مطابق کفارت کا اعتبار صرف دین میں ہوگا، اس کے علاوہ نسب پیشہ وغیرہ کسی چیز میں نہیں ہوگا۔ بہر حال عجم کے عرفِ فاسد کا اعتبار کرکے دیگر فقہاء نے احکام اگرچہ مرتب کیے کہ نظام زندگی عجم کی یکدم مختل نہ ہوجائے جس طرح رواج غلامی ختم کرنے کی پالیسی میں ہوا لیکن علت واسباب بیان کرتے ہوئے یہ حقیقت بھی ظاہر فرمادی کہ ان معاشرتی احکام ومسائل کو اسی شکل میں دائمی نہ سمجھ لیا جائے۔ گردوپیش کے حالات بدلنے کے ساتھ معاشرتی احکام میں تبدیلی کو بھی ناگزیر سمجھا جائے،

کفارت کا مقصد اپنے ہی خاندان میں رشتۂ ازدواج پر منحصر رکھنا نہیں ہے

یہ بھی دھیان رہے کہ فقہ کی کتابوں میں کفارت کا جو باب قائم ہے اس کا مقصد رشتۂ ازدواج کو اپنے ہی خاندان میں منحصر رکھنا نہیں، بلکہ زوجین میں خوش دلی اور باہمی احترام کے ساتھ نباہ مقصود ہے۔ نیز یہ بھی بتلانا مقصود ہے کہ نکاح لڑکی اور اس کے ولی کے باہمی اشتراک وتعاون اور لڑکی کی دلی رغبت کے مطابق ہونا چاہیے۔ جہاں کوئی سرپھری لڑکی اپنے ولی کا خیال نہ کرے گی، یا ولی لڑکی کی دلی رغبت وخواہش کا خیال نہ کرے گا، وہاں نزاع واختلاف پیدا ہونا یقینی ہے۔ اس نزاع کا فیصلہ کن اصولوں کے تحت ہوگا، اس کو فقہاء کرام نے باب ولی وکفارت میں اپنے زمانہ کے حالات کے مطابق بیان

کر دیا ہے، نسب میں تبدیلی ممکن ہے۔

لڑکی اور اس کے ولی کی رضامندی سے غیر کفو میں نکاح ہوجاتا ہے

بعض لوگوں کا یہ سمجھنا کہ غیر کفو میں مطلقاً نکاح نہیں ہوتا یہ سراسر غلط، اور ناواقفیت پر مبنی ہے، صرف اسی صورت میں نکاح کو بعض فقہاء نے باطل احتیاطاً قرار دیا ہے جبکہ لڑکی اپنی مرضی سے بلا اجازت ولی غیر کفو میں نکاح کرے لیکن جہاں لڑکی اور اس کے ولی کے باہمی اشتراک وتعاون وخوش دلی کے ساتھ، بالخصوص لڑکی کی دلی رغبت کا خیال رکھ کر نکاح کیا جائے گا۔ خواہ رسمی کفو میں یا غیر کفو میں وہاں بہرصورت نکاح باتفاق جمیع فقہاء صحیح ولازم ہو جائے گا۔ بعد میں کسی کو بھی رخنہ اندازی کی گنجائش نہیں ہوگی، کیونکہ اوپر بتلایا جا چکا ہے کہ کفارت فی نفسہٖ مقصود نہیں ہے۔ بلکہ لڑکی کے جذبات کی رعایت رکھ کر معتبر مانا گیا تاکہ زوجین باہمی احترام کے ساتھ تعلقات استوار رکھ سکیں اور خوش دلی کے ساتھ نباہ ہو۔

اب اگر لڑکی اور اس کے اولیاء کے جذبات و خیالات، تعلیم وتہذیب، یا تبدل حالات کی وجہ سے اِن رسم ورواج اور فاسد عرف سے بالاتر ہو جاویں، پھر ان کو پابندئ رسوم و روایات پر مجبور نہیں کیا جا سکتا ہے۔

کفارت کا مقصد حفاظت نسب بھی نہیں ہے

اب یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اسلام نے نسب ونسل کی حفاظت کو بھی اہم قرار دیا ہے، ایک قبیلہ وخاندان کی دوسرے میں شادی ہونے سے نسب پر تو اثر نہیں پڑے گا؟ - اس کا جواب یہ ہے کہ نسب انسانوں میں باپ سے چلتا ہے، "اور جانوروں میں مادہ سے، اس لئے جو لوگ ایسا کرتے ہیں ان کے نسب محفوظ ہی قرار دیئے جائیں گے" تاریخ شاہد ہے کہ خود ہمارے اسلاف اور قدیم مسلمان دورِ عروج وترقی میں، فوجی اور غیر فوجی شکل میں جہاں کہیں، اور جس علاقہ وملک میں گئے اور اقامت وہاں کی اختیار کی تو اس علاقہ وملک کی عورتوں سے بلاتکلف شادیاں بھی کیں۔ اور ان سے ان ملکوں میں مسلم نسل بھی چلی ہے۔ جو آج تک چلی آرہی ہے۔ نیز آج بھی اگر کسی سید زادے کا نکاح صدیقی یا فاروقی یا کسی دوسرے خاندان میں ہو جا دے تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس شخص کا یا اس کی اولاد کا نسب محفوظ نہیں رہ گیا بہرکیف

کفاءت کی حد بندی نسب کی حفاظت کے لیے کبھی نہیں البتہ جن مقاصد کے پیش نظر کفاءت کی حد بندی کی گئی تھی۔

مذہبی مسند نشینوں کا موجودہ رویہ سخت نقصان دہ ہے

آج عوام تو عوام ہیں، بعض ان لوگوں کی بھی نگاہ نہیں جاتی ہے جو کہ مذہبی مسندوں پر قبضہ جمائے ہوئے ہیں انھوں نے ان حد بندیوں ہی کو اصل مقصود قرار دے لیا ہے اور ہر پیشہ کو مستقل ذات بنا ڈالی۔ غیر منقسم ہندوستان میں نسلی، علاقائی اور لسانی بنیادوں پر جو امتیاز اور اونچ نیچ کا نظام قائم تھا، اس کے ناپاک جراثیم نے مسلم معاشرہ کو بھی دبوچ لیا، جدید تعلیم و تہذیب نے ان جراثیم کو بہت کچھ کمزور کر دیا ہے۔ پھر بھی اس بیمار ذہنیت کو ان مہلک جراثیم سے مکمل نجات دلانے کا کام علماء اور مفتیان کرام دونوں ہی کو کرنا چاہیئے۔ تاکہ اخوت و مساوات وغیرہ کو خواص اور عوام، اسلامی تعلیم کی برکت سمجھیں، نہ کہ جدید تعلیم و تہذیب کی کرامت۔

مفتیان کرام عموم بلویٰ کا بہانہ بنا کر نہیں بچ سکتے ہیں، اور نہ علماء کرام فتاویٰ کا سہارا لے کر ہی محفوظ رہ سکتے ہیں عرف فاسد کو بدرجۂ مجبوری ضرورتاً معتبر مانا جا سکتا ہے لیکن ہمیشہ کے لیے لازم نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ایسی روش اختیار کرنا ضروری ہے کہ فاسد چیز کو فاسد ہی سمجھا جائے، بتدریج اس کو صحیح نہ سمجھا جانے لگے، جہاں شدید ضرورت نہ دکھائی دے۔ بلکہ غلط رسم و رواج کے مفاسد کو عام طور پر سمجھ کر اس کی کا جذبہ پیدا ہونے لگے، تو مذہبی مسند نشینوں کا فرض ہے کہ ان کی تقویت کریں۔ اس عرف فاسد کو جوں کا توں باقی رکھ کر اس کے ساتھ چپکے رہنے کا قولاً یا عملاً تلقین کرنا تباہ کن نتائج کا باعث ہے۔ اسی کا ایک نتیجہ سب کے سامنے ہے کہ ہندوستان کے مسلم معاشرے میں ایک طرف ذات پات کے امتیاز، اور اونچ نیچ کی ذہنیت کو فروغ ہوا جس نے اسلام کے نورانی چہرہ کو مسخ کر کے رکھ دیا۔ آج کے سماجی مورخین بھی یہ تحریر کرتے ہیں کہ مسلمانوں میں ذات پات اونچ نیچ کا امتیاز ہندوؤں سے کم نہیں ہے، تو دوسری طرف کتنی مسلم بچیاں ہیں جن کی عمریں ۴۰،۴۵ سال بلکہ ۵۰ سال سے متجاوز ہو رہی ہیں، اور شادی محض اس بنا پر ان کے اولیاء نہیں کر رہے ہیں کہ ان کے برابر خاندان کا لڑکا نہیں مل رہا ہے۔

اب جن بچیوں کو مذہب و روایات کا پاس نہیں وہ اپنا راستہ تلاش کرنے میں مکمل آزاد ہیں، حتیٰ کہ مسلم اور غیر مسلم کا بھی ان کے نزدیک کچھ فرق نہیں، عزت و ناموس کی حفاظت تو درکنار اور جن میں حمیت و غیرت باقی ہے، وہ سسک سسک کر پوری زندگی گذارنے پر مجبور ہیں۔ انھیں خطرات سے آگاہ فرماتے ہوئے محسن عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دین و اخلاق کو سب سے زیادہ قابلِ اعتبار قرار دیا تھا اور فرمایا تھا کہ:-

زیادہ تر نگاہ دین و اخلاق پر جانی چاہیئے لڑکی والوں کو حضورؐ کا مشورہ

اذاجاءکم من ترضون دینہ و خلقہ، فانکحوہ الا تفعلوا تکن فتنۃ فی الارض و فساد، قالوا یارسول اللہ وان کان فیہ (ای شیئ من قلۃ المال او عدم الکفاءۃ) قال اذاجاءکم من ترضون دینہ وخلقہ فانکحوہ ثلث مرات

(ترمذی ج ۲ صـ۱۶۵ و مشکوٰۃ صـ۲۵۹)

جب تمھیں ایسا شخص مل جائے جس کے دین اور جس کے اخلاق پسندیدہ ہوں تو اس سے لڑکیوں کا نکاح کر دیا کرو۔ اگر تم ایسا نہیں کروگے تو زمین پر ایک زبردست فتنہ و فساد پھیل جائے گا۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسولؐ اللہ اگرچہ اس میں (غربت یا یا کسی غیر کفو ہونے کا) کچھ نقص ہو پھر بھی، اس کے جواب میں پھر حضورؐ نے تین بار یہی فرمایا کہ جب تمھیں کوئی ایسا شخص مل جائے جس کی دین داری اور جس کے اخلاق و کردار پسندیدہ ہوں تو اس سے نکاح اپنی لڑکیوں کا کر دیا کرو،

اس حدیث کی شرح صاحب مجمع البحار نے اس طرح کی ہے:۔

ای ان لم تزوجوا من ترضون دینہ وخلقہ و ترغبوا فی معر د العسب والجمال تکن فتنۃ و فساد لانھما جالبات الیھا، و قیل ان نظر تسم الی صاحب مال

یعنی اگر تم اپنی لڑکیوں کا ایسے شخص سے نکاح نہ کروگے جس کی دینداری اور اخلاق مندی تمھیں پسندیدہ ہے اور محض حسب و نسب اور حسن و جمال میں ہی نگاہ رغبت کروگے تو اس سے

وجاه يبقى أكثر النساء والرجال بلا تزوج فيكثر الزنا ويلحق العار والغيرة بالأولياء فيقع القتل ويهيج الفتنة وفيه حجة لمالك على الجمهور فإنه يراعي الكفاءة في الدين فقط

(بحوالہ حاشیہ ترمذی شریف ج ۱ ص ۱۲۸)

فتنہ و فساد برپا ہو جائیگا۔ کیونکہ وہ باعث فتنہ ہیں۔

بعض نے اس کی تشریح اس طرح کی ہے کہ اگر تم لوگ مال و دولت اور جاہ و نسب والے کی تلاش میں رہو گے تو بہت سی عورتیں اور بہت سے مرد بلا شادی کے پڑے رہ جائیں گے، جس سے زنا اور حرام کاری کی کثرت ہوگی۔ نتیجۃً اعزہ و اقربا کو بھی ننگ و عار، حمیت و غیرت لاحق ہوگی۔ اور قتل و خونریزی، فتنہ و فساد کی آگ بھڑک اٹھے گی

یہ حدیث امام مالکؒ کے لئے دیگر ائمہ کے مقابلے میں حجت ہے۔ کیونکہ اس میں دین و اخلاق ہی کو سب سے زیادہ قابلِ لحاظ قرار دیا گیا ہے۔ اور امام مالکؒ دین داری ہی میں کفاءت کو معتبر مانتے ہیں۔

انتخاب زوجہ میں بھی دین و اخلاق پر ہی زیادہ دھیان دیں، مردوں کو حضورؐ کا مشورہ

مردوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مشورہ یہ دیا تھا کہ:۔

تنکح المرأة لاربع، لمالها ولحسبها ولجمالها ولدينها فاظفر بذات الدين تربت يداك۔

(بخاری و مسلم بحوالہ مشکوٰۃ ص ۲۵۹)

(عام طور پر) عورت سے شادی چار خوبیوں میں سے کسی خوبی کی وجہ سے کی جاتی ہے، اس کے (کثرت) مال کی وجہ سے۔[1] اس کے حسب و نسب کی وجہ سے۔[2] اس کی حسن و خوبصورتی کی وجہ سے۔[3] اس کی دینداری کی وجہ سے،[4] تو تم دیندار عورت کو ترجیح دیتے ہوئے اس سے نکاح کر کے کامیاب ہو۔ ابدیہ فلاح و

کامیابی آخرت کے لیے تو ہے ہی، د
بھی ہو گی ۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ
ارشاد ہے ۔

الدنیا کلھا متاع وخیر متاع الدنیا المرأۃ الصالحۃ۔

دنیا ساری کی ساری پونجی ہے - ا
کی بہترین پونجی نیک و صالح عورت

(مسلم بحوالہ مشکوٰۃ صـ۲۵۹)

علامہ اقبال اور تاألہ زمان

(۳)

شبیر احمد خاں صاحب غوری۔ ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ سابق رجسٹرار امتحانات عربی فارسی، اتر پردیش

"زروانیت" سے ساسانی مدبروں کی یہ بے اعتنائی مذہبی تنگ نظری کا نتیجہ نہ تھی، بلکہ چونکہ زروانی عقائد آخر میں جبر کا عقیدہ پیدا کردیتے ہیں جو ایک زندہ قوم کی روح کے لیے سم قاتل ہیں۔ اس لیے ساسانی مدبرین نے سوسائٹی کی اصلاح اور اس میں جذبۂ عمل کوشی کی روح پھونکنے کے لیے ان زروانی معتقدات کو یک قلم دبانے کی کوشش کی۔ پھر بھی "زروانیت" اجتماعی ذہن سے کلیتاً محو نہ ہوسکی اور جب ساسانی سلطنت کے آخری زمانہ میں اجتماعی فکر فارق المرکز تحریکات کا تختۂ مشق بننے لگی تو زروانیت نے بھی سر اٹھایا، چنانچہ ہوارٹ لکھتا ہے:۔

"ساسانیوں کے زمانہ میں بدعتی فرقوں کے اندر ایک توحید پسند رجحان نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ زمان نامحدود یا زروان اکرن کی اصطلاح جو اوستا کے آخری حصہ میں ملتی ہے، خدائے واحد کے واسطے بھی اساس کے طور پر استعمال کی جاتی تھی جو کہ خیر و شر دونوں ہی مبدؤں سے بلند تر ہے۔ یہ عقیدہ چوتھی صدی مسیحی میں تھیوڈور مصیصی کے اور پانچویں صدی میں آرمینی مصنفین ازنیک اور ایلیس کے علم میں بھی تھا" (۱)

---

(1)
"In the time of the Sasanides a monotheistic tendency becomes clearly apperent in disside sects. The expression, infinite time. Zarv akarana, which is found in the later part of

بقیہ اگلے صفحہ پر

ان میں سے تھوڈور مصیصی کی شہادت کو مارٹن ہوگ ذرا تفصیل سے بیان کر

" اُن اقتباسات کی رُو سے جنھیں خوطیوس نے محفوظ رکھا ہے (ملاحظہ ہو ببلیوتھ

تھیوڈور مصیصی نے بھی اسی موضوع پر یہ تبصرہ قلمبند کیا ہے :۔ خوطیوس نے لکھا ہے کہ ا

پہلے مقالے میں (جو اُس نے مجوسیوں کے عقائد پر لکھی ہے) وہ ایرانیوں کے اس نفرت

کی وضاحت کرتا ہے جسے زرتشت نے رائج کیا تھا اور جو زروم (زروان) کے متعلق

سارے جہان کا بادشاہ بناتا ہے اور تقدیر کے نام سے موسوم کرتا ہے " (۱)

دوسری جگہ ازنیک کی شہادت کو نقل کرتے ہوئے لکھتا ہے :۔

" ازنیک اپنی کتاب ابطال الحاد (جلد ثانی) میں جو اہلِ ایران کے عقائد پا

مشتمل ہے لکھتا ہے کہ (زروانیوں کے نزدیک) ہر چیز آسمان، زمین نیز دیگر اق

کے وجود سے پیشتر زروان موجود تھا، جس کے نام کا مطلب تقدیر یا عظمت و برکہ

بقیہ ص۵ سے آگے

sta, was used as the basis for the idea
ngle God superior to the two principles.
ctrine was known to Theodoros of
tia in the IV century of our era and to
menian writers, Eznik and Elisaeus in
century".
rt: Ancient Persian and Iranian
ilization, P. 171).

the same matter Theodoros of Mopsestia
as follows, according to the fragment
ed by the Polihstor Photios (Biblioth 81):
first book of his work (On the doctrines
Magi), says Photios, he propounds the
us doctrine of the Persians, which
ades introduced, viz, that about Zarouam,
makes the ruler of the whole universe
and calls

غرض ساسانی ایران میں سرکاری ہمت شکنی اور موبدوں (مذہبی طبقہ) کی مخالفت کے باوجود "زروانیت" باقی رہی چنانچہ کرشن سین لکھتا ہے:۔

"اس بات کا ثبوت کہ ساسانیوں کی مزدائیت زروان پرستی کی شکل میں مروج تھی، نہ صرف اشخاص کے ناموں کی کثیر تعداد سے ملتا ہے جو ساسانیوں کے زمانہ میں لفظ زروان کے ساتھ مرکب پائے جاتے ہیں بلکہ اُن بے شمار مقامات سے بھی جو یونانی ارمنی اور سریانی مصنفین کی کتابوں میں ملتے ہیں" (۱)

چنانچہ سریانی زبان میں کتب وقائع شہدائے ایران کے سلسلے میں ایک "تاریخ سابہا" ہے جس میں ایک مجوسی موبد اپنے خداؤں کا شمار کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

"ہمارے خدا زبوس، کرونوس، اپولو، بیدوخ اور دوسرے خدا"

یہ زروانی خداؤں کی ایک چوکڑی ہے۔ زبوس۔ کرونوس اور اپولو علی الترتیب اہورا مزدا، زروان اور مستھرا ہیں۔ (۲)

لیکن جس طرح زردشتی مصلحین نے شروع میں اصلاح اور جذبۂ عمل کوشی کی روح پھونکنے

بقیہ ص۵۸ سے

him Destiny. (Marting Haug: Essays on the Sacred Language Writings and Religion of the Parsis. p.12).

(۲) "Fanik says, in his refutations of heresi (in the second book), containing a refutati of the false doc- trine of Persians: Before any thing, heaven or earth, or creature of an kind whatever therein, was esisting Zeruah existed, whose name means fortune or glory". (Ibid p. 12).

(۱) ایران بعہد ساسانیاں ص۱۹۶ (۲) ایضاً صفحہ ۲۰۵

کے لیے "مزدائیت" کو "زروانیت" سے پاک کرنے کی کوشش کی تھی، اسی اصول کے تحت انھوں نے ساسانی عہد کے زوال پر بھی اس کی مخالفت کی۔ زروانی عقائد جو ساسانیوں کے عہد حکومت کے آخر میں مروج ہونے لگے تھے اندر ہی اندر جبر کا عقیدہ پیدا کر رہے تھے

جو نہ صرف قدیم "مزدائیت" کے لیے سم قاتل تھا، بلکہ پوری قوم کو
نومیدی و محکومی و مایوسی جاوید

کے غارِ مذلت میں ڈھکیل رہا تھا کیونکہ خدائے قدیم "زروان" جو اہورامزدا اور اہرمن کا باپ تھا نہ صرف "زمان نامحدود" کا نام تھا بلکہ "تقدیر" بھی وہی تھا (تفصیل اوپر مذکور ہوئی) اور اس تقدیر کی بے پناہ کارفرمائیوں کے آگے انسان اور اس کا عزم صمیم سبھی تو حرفِ باطل ہیں۔ چنانچہ کتاب "دادستان مینوگ خرد" میں عقل آسمانی حسب ذیل اعلان کرتی ہے۔

"اتنی عظیم طاقت اور عقل و خرد اور علم و حکمت کی اتنی بڑی قوت کے ساتھ بھی تقدیر کے ساتھ نبرد آزمائی ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ جب نوشتہ قسمت میں لکھا ہوا مقدر خواہ وہ نیکی اور بھلائی کے متعلق ہو یا اس کے خلاف سامنے آتا ہے تو عقلمند انسان بھی ادائے فرائض کے باب میں کوتاہ و ناکارہ (نیازیان) بنجاتا ہے اور وہ جسے شرارت میں ملکہ حاصل ہو، عقلمند بنجاتا ہے۔ کمزور دل کا انسان شجاع و بہادر بنجاتا ہے اور شجاع و بہادر کمزور دل۔ محنتی آدمی کاہل و نکما بنجاتا ہے اور کاہل و نکما آدمی بڑی محنت سے کام کرنے لگتا ہے۔ جو کچھ صورت حال کے متعلق مقدر ہو چکا ہوتا ہے اسی کے مطابق اسباب و عمل پیدا ہونے لگتے ہیں اور اُن کے علاوہ ہر چیز وہاں سے نکال دی جاتی ہے"[1]

---

(1) 'Even with this might and powerfulness of wisdom and knowledge, even this it is not Int-nd with destiny. Because when predestination as to virtue, or as to the reverse, comes forth, the wise becomes wanting (niyazan) in duty, and the estute in evil becomes intelligent, the faint-hearted becomes

لیکن زرتشتی خردانیت اس "زروانیت" اور اس کے نتیجے میں پیدا شدہ جبر و قنوطیت کو برداشت نہ کر سکی۔ لہٰذا اس کا ردِ عمل ناگزیر تھا۔ اس "دہریت" کے ابطال میں مذہبی طبقہ کی تصنیفی سرگرمیاں ظہور میں آنے لگیں اور کچھ ہی عرصہ بعد اس کے رد میں ایک اہم کتاب بعنوان "سکند گمانیک وژار" (شکوک کو رفع کرنے والی کتاب) ظہور میں آئی اس میں ان "دہریوں" (زمانہ پرستوں یا دہریہ پرستوں) کے سلسلے میں لکھا ہے :-

"اُن لوگوں کی فریب خوردگی کے بارے میں جن کا دعویٰ ہے کہ کوئی مقدس وجود (الوہیت) موجود ہی نہیں ہے اور جنھیں منکرینِ خدا (دہری) کہتے ہیں :- (ان لوگوں کا دعویٰ ہے کہ) وہ مذہبی تکالیف سے آزاد کر دیئے گئے ہیں نیز نیک کام انجام دینے کی مشقت ان پر واجب نہیں ہے اور (اس قسم کی) بے شمار ہفوات ہیں سے جس میں یہ لوگ مشغول رہتے ہیں، تم ان باتوں پر غور کرو -

وہ اس دین اور اس کے اندر جو کثیر التعداد تغیرات ہوتے رہتے ہیں اور اُس کے اجزاء و آلات کا باہمی توافق و ہم آہنگی نیز اُن کا باہمی تضاد اور ایک دوسرے کے ساتھ التباس، یہ سب اُمور (ان دہریوں کے خیال میں) زمانِ نامحدود کے ابتدائی ارتقا کا نتیجہ ہیں۔

یہ بھی سمجھ لو (کہ ان کے نزدیک) نہ تو اچھے کام کی کوئی جزا ہے اور نہ گناہ کی کوئی سزا۔ نہ بہشت ہے نہ دوزخ اور نہ اچھے کاموں کے لیے اور اسی طرح ارتکاب جرائم کے لیے کوئی امر محرک ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ (یہ بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ ان لوگوں کے نزدیک) جو کچھ بھی ہے

بقیہ صفحہ سے آگے

braver, and the braver becomes faint-hearted. the diligent becomes lazy and the lazy acts diligently. Just as predestined ast to the matter, the cause enters into it and thrust out every thing else." (Dina-i-Mainog Khirad Chap. XXIII- 4-9, Sacred Book of the East Part III, p.54). ۹۱

وہ دُنیاوی (مادی) ہی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی روح (یا رُوحانی) نہیں ہے" (۱)

یہ صورت حال تھی کہ اسلام مبعوث ہوا اور کچھ ہی عرصہ بعد عربوں نے ایران کو فتح کر لیا۔ اس سے ایران کے قومی وقار کو جو بھی صدمہ پہونچا ہو، سیاسی انحلال اور انتشار زیادہ عرصہ تک باقی نہ رہ سکا۔ بہت ہی قلیل عرصہ میں مسلمان فاتحین نے یہاں ایک منظم سلطنت قائم کر لی۔ یہ فاتحین "مزدائیت" یا مجوسیت کو برداشت کر سکتے تھے جس طرح انہوں نے یہود و نصاریٰ کی مذہبی آزادی کو برقرار رکھا تھا۔ لیکن مسلمان جیسی فعّال قوم کے زیر حکومت "مقدر پرستی" کی تحریکیں فروغ نہیں پا سکتی تھیں۔ لہٰذا "زروانیت" اور اسی طرح "حرنانیت" کی تحریکیں دب گئیں اور ڈھائی سو سال تک سننے میں نہیں آئیں تا آنکہ ابوبکر محمد بن زکریا الرازیؒ نے ان کو گوشۂ خمول سے نکال کر از سر نو متعارف نہیں کرایا۔ اس تجدید حرنانیت کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے۔

---

(۱) "As to another delusion of those asserting the non-existence of a sacred being, whom they call athestical (Dahri) that they are ordained free from religious trouble (alag) and the toil of practising good work and the unlimited twaddle (drayisin) they abundantly chatter, you should observe this. That they account this world, with the much change and adjustment of description of its members and appliances, their antagonism to one another, and their confusion with one another, as an original evolution of boundless time. And this, too that there is no reward of good that things are only worldly and there is no spirit." works, no punishment or sin, no heaven and hell, and no stimulator of good works and crimes. Besides this (Sikand Gumanik Vijar Chap.VI Sacred Book of the East Part III. p.146).

زمانہ پرستی ہندوستان میں | مستشرقین کی شہادت (بحوالہ مارٹن ہوگ) نقل ہو چکی ہے کہ تمام آریائی اقوام زمانہ کو اصل کائنات بلکہ وجود کا مبداء اوّلین سمجھتی تھیں۔ قدیم ہندوستانی فکر میں بھی یہ عقیدہ ملتا ہے۔ چنانچہ "بھگوت گیتا" میں ایشور کو سری کرشن کی زبانی کہتے ہوئے بتایا گیا ہے:۔

"میں زمانہ ہوں جو دُنیاؤں کو تباہ کرتا ہوں" (۱)

اسی طرح ابوریحان البیرونی نے "کتاب الہند" میں قدیم ہندو مفکرین کے مذاہب گناتے ہوئے "زمانے کے قدیم ہونے" کے مذہب کو بعض ہندو مفکرین کی طرف منسوب کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔

"واما الهند فكلامهم في هذا الباب نزر وغير محصل ..... وقال كپل لم يزل الله والعالم معه بجواهره واجسامه لكنه هو علة للعالم ويستعلي بلطفه على كثافته۔ وقال كنبهك ان القديم هو مهابوت اے مجموع العناصر الخمسة وقال غيره القدم للزمان وقال بعضهم للطباع وزعم الآخرون ان المدبر هو كرم اى العمل" (۲)

(رہے ہندو مفکرین تو اس باب میں (زمانہ و مدّت نیز خلق و فنائے عالم کے بارے میں) اُن کا کلام غیر تشفی بخش اور مبہم وغیر واضح ہے ...... اور کپل کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے ہے اور عالم مع اپنے جملہ جواہر و اجسام کے (ہمیشہ سے) اُس کے ساتھ رہا ہے لیکن وہ عالم کی علّت ہے اور اپنے لطف و لطافت سے عالم کی کثافت پر بلند ہے۔ کنبھک کا کہنا ہے کہ قدیم صرف مہابوت ہے جس سے اس کی مراد عناصر خمسہ کا مجموعہ ہے۔

اور کنبھک کے علاوہ دوسرے لوگ کہتے تھے کہ قِدَم صرف زمان ہی کے لیے ثابت ہے (اور کچھ لوگ قِدَم کا مصداق طبیعت کو سمجھتے ہیں اور دوسرے لوگوں کا گمان ہے کہ مدبّر

---

(۱) اصول فلسفۂ ہنود از مسٹر سرینواس آئنگر صفحہ ۳۵ اسی طرح "اتھروید" کے نمبر ۱۵، ۳۵، ۱۰ اور ۵۵ میں زمانہ کو تمام چیزوں کا مبداء اور حاکم کہا گیا ہے۔ (۲) کتاب الہند ص ۱۲۴

(عالم) صرف کرم یا عمل ہے)

زمانہ پرستی یونان میں | ایران کے بعد زمانہ پرستی کا دوسرا سب سے بڑا گہوارہ یونان تھا
قدیم اساطیری خرافات میں "کرونوس" (Kronos) "یا کال دیوتا" (زمانہ اپنے ہی
جایا کرتا تھا، چنانچہ اپولوڈورس، جس کا زمانہ پہلی یا دوسری صدی مسیحی ہے، اپنی کتاب
جسے اُس نے ہیزیوڈ (Hesiod) (زمانہ آٹھویں صدی قبل مسیح) کی کتاب (ony
سے منتخب کر کے لکھا تھا، کہتا ہے۔

"سب سے پہلے آسمان (Uranus) دنیا پر حکومت کرتا تھا۔ اُس نے ز
شادی کی....... اُس کے بچّوں میں سب سے چھوٹا کرونوس تھا..... کرونوس نے
سے شادی کی اور چونکہ اُس کے ماں باپ نے پیشین گوئی کی تھی کہ اُسے خود اس کے بچّے
لہٰذا وہ اپنے بچوں کو نگل جایا کرتا تھا۔" (۱)

اس اسطوری افسانے کی تمثیلی توجیہ یہ ہے کہ۔

(الف) زمانہ کی اصل فلک ہے اور خود زمانہ دیگر موجودات حتیٰ کہ زیوس
کی بھی جو تمام یونانی دیوتاؤں کا پدر اوّلین ہے، اصل ہے۔

(ب) تمام موجودات کو ہلاک کرنے والا (اپنے بچّوں کو نگل جانے والا) "کرونوس"
یا زمانہ ہے۔

بھگوت گیتا میں مذکور زمانے کے تصوّر میں کہ وہ "دنیاؤں کا تباہ کرنے والا"۔
خرافات کے "کرونوس" میں جو "اپنے ہی بچّوں کو نگل جایا کرتا تھا"، بڑی گہری مماثلت
اس سے یوڈیموس اور دمسقیوس کی اس شہادت کی تصدیق ہوتی ہے کہ قدیم
زمانہ کو اصل کائنات سمجھتی تھیں۔

Rd: Greek Religious Thoughts pp. 20-21

بعد میں یونانی فلسفہ کی فلک بوس عمارت یونانی دیومالا ہی پر قائم ہوئی۔ صرف اتنا ہوا کہ فلاسفہ نے اساطیر کے خرافاتی پوست کو ہٹا کر سائنسی مغز کو اپنا موقف بنالیا۔ مثلاً یونانی اسطوریات کا اہم ترین مسئلہ یہ تھا کہ کوہ اولمپس میں بسنے والے دیوتاؤں کا مورث اعلیٰ (پدر اولین) کون ہے۔ فلاسفہ نے اس سوال کی تعبیر بدیں طور کی: "کائنات کا اصل الاصول اور وجود کا مبدا اوّلین کیا ہے؟" اور پھر اسی بحث کو اپنی تفکیری سرگرمیوں کا موضوع بنالیا۔

یہی حال زمانہ کے ساتھ ہوا۔ فلاسفہ کے یہاں آکر وہ "خدا" (دیوتا) تو نہ رہا، لیکن "خود+آ" (غیر مخلوق = قدیم) ضرور بنا رہا۔ تمام فلاسفہ یونان اسے قدیم مانتے ہیں، چنانچہ ارسطو اپنی کتاب "اسماع الطبیعی" (Physics) میں لکھتا ہے:-

"تمام مفکرین باستثنا فرد واحد، اس بات پر متفق ہیں کہ زمانہ کی ابتدا نہیں ہے، بلکہ ہمیشہ سے علیٰ سبیل الاستمرار موجود ہے۔ صرف افلاطون ہی وہ فرد مستثنیٰ ہے جس نے زمانہ کے لئے ابتدا بتائی ہے کیونکہ وہ کہتا ہے کہ زمانہ کائنات کے ساتھ وجود میں آیا ہے اور کائنات کے لیے آغاز ثابت کرتا ہے"

لیکن پیروان افلاطون کو ارسطو کی اس توجیہ سے انکار ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ افلاطون کی رائے میں بھی عالم محسوس اور زمانہ ازلی ہے۔

غرض یونان کے سائنسی فلسفہ میں "زمانہ کا قدم" اور عرفانی فلسفہ میں "اس کا تاثر" یونانی ثقافت کا اہم جزو بنتے رہے اور اسی ثقافت کی توجیہہ و توضیح حکمار یونان ایک ہزار سال تک کرتے رہے۔ پھر دیگر فلسفیانہ تصورات کی طرح یونان کی فکر زمانی نے اپنی مخصوص شکل نو فلاطینیوں (Neo-Platonists) کے یہاں اختیار کی۔ یوں بھی یونانی اور ایرانی افکار میں ہمیشہ سے تبادلۂ فکر ہوتا رہا تھا مگر چھٹی صدی کے ربع ثانی میں جب ایتھنز کے مدرسہ فلسفہ کی قفل بندی کے بعد آخری یونانی فلاسفہ دمسقیوس کی

قیادت میں خسرو نوشیروان کے ایرانی دربار میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے تو چونکہ اسی زمانہ میں خود ایرانی فکر کے اندر "زروانیت" (زمانہ پرستی) دوبارہ سر اٹھا رہی تھی لہٰذا یونانی و ایرانی تفکیر کے جوڑ پیوند سے زمانہ کے اس تصور نے جنم لیا جو ارسطاطالیسی فلسفہ کے سریانی شراح، اسکندریہ کے مدرسہ فلسفہ کے مشائی معلمین اور ایران کے نسطوری مدارس نیز مدرسۂ جندی سابور سے فارغ ہونے والے متعلمین کے توسط سے اسلامی فکر میں منتقل ہوا اور جس کی گرم شکل نے ابوبکر زکریا رازی کی تجدید حرنانیت میں "تاثر زمان" کی اور شیخ بوعلی سینا کے یہاں اپنی نرم شکل میں اور بعد میں اس کے متبعین کے فکری نظاموں میں ازلیت و ابدیت زمان کی صورت اختیار کی (۱)

زمانہ پرستی عرب جاہلیۃ میں | ایران ہی سے دہریت اور "تاثر زمان" عرب جاہلیۃ میں پہونچے ایران کی مغربی سرحد پہ مناذرہ کی نیم آزاد عرب حکومت حیرہ کے اندر، اکاسرۂ ایران کے زیر استبداب قائم ہوئی۔ لہٰذا ثقافت و شائستگی میں اس کا ایران سے متاثر ہونا فطری تھا اسی ثقافتی تاثر نے مقامی مترفین کی خوش حالی و فارغ البالی کے ساتھ ایک طرح کی دہریت و زندقہ کو جنم دیا جسے بعد میں عرب جاہلیۃ کے مترفین نے اپنا لیا، چنانچہ اصمعی نے کہا ہے:

"دہریت و زندقہ قریش میں پائے جاتے تھے جسے انہوں نے اہل حیرہ سے اخذ کیا تھا"(۲)

اس کے نتیجہ میں وہ فرقہ ظہور میں آیا جسے شہرستانی "معطلۃ العرب" کے نام سے موسوم کرتا ہے، وہ لکھتا ہے:-

"جاننا چاہیئے کہ عرب جاہلیت کے مختلف فرقے تھے۔ بعض ان میں سے مذہب تعطیل کے پیرو تھے۔ ان کا ایک فرقہ خالق کائنات اور حشر و نشر کا منکر تھا اور اس بات

---

(۱) چنانچہ اثیر الدین ابہری نے "ہدایۃ الحکمۃ" کے اندر جس کی شروح بعد میں نصاب فلسفہ کے ابتدائی و اعلیٰ نصاب میں... متداول رہیں زمانہ کے وجود خارجی کو ثابت کرنے کے بعد لکھا ہے: "ونقول ایضاً ان الزمان لا بد ایتہ لہ ولا نہایۃ لہ (ہدایۃ الحکمۃ ص۲)

(۲) الاعلاق النفیسہ لابن رستہ ص۲۱ "وکانت الزندقۃ فی قریش اخذوھا من الحیرۃ"

ئل تھا کہ طبیعت زندگی بخشنے والی، اور دہر فنا کرنے والا ہے۔ اسی فرقے کے قول کو قرآن
یم دہراتا ہے: وَ قَالُوْا مَا هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَ نَحْیٰی وَ مَا یُهْلِکُنَا اِلَّا الدَّهْرُ جس
ارہ طبائع محسوسہ کی جانب ہے، نیز اس بات کی طرف کہ زندگی اور موت انھیں طبائع کی ترکیب
انحلال پر موقوف ہے۔ پس طبیعت جامع (موجب تکوین) اور دہر مہلک (موجب فساد)
ہے۔" (۱)

اس خیال نے عرب انداز فکر میں، بالخصوص اس طبقہ میں جو عیش کوشی وانجام فراموشی کا
ائل تھا، اپنے عقیدت مند پیدا کر لئے تھے چنانچہ ایک جاہلی شاعر کا شعر ہے:۔

حیاۃ ثم موت ثم نشر حدیث خرافۃ یا ام عمرو

بہر حال دوسرے عیش کوشانِ روزگار کی طرح مترفین عرب نے بھی دہر (زمانہ)
ایک "صنم خیالی" تراش رکھا تھا جسے وہ "موثر فی الوجود" سمجھتے تھے مگر عربوں کی زود رنج
ور اشتعال پذیر طبیعت عسر و یسر ہر حال میں اپنے معبودوں کی تعظیم و عقیدت پر خود کو
بھی نہیں رکھ پاتی تھی، اگر ضرورت پڑے تو کل تک جس بت کی پرستش کرتے تھے، اسے کھا جانے
یں بھی دریغ نہ ہوتا۔ (۲)

---

(۱) کتاب الملل والنحل للشہرستانی الجزء الثانی صفحہ ۹۶: "اعلم ان العرب اصناف شتی۔ فمنهم معطلة
منهم محصلة نوع تحصیل۔ معطلة العرب وهی اصناف فصنف منهم انکروا الخالق
البعث والاعادة وقالوا الطبع المحی والدهر المفنی۔ وهم الذین اخبر عنهم القرآن المجید
قالوا ما هی الا حیاتنا الدنیا نموت ونحیی وما یهلکنا الا الدهر اشارة الی الطبائع المحسوسة
یقصر الحیاة والموت علی ترکبها وتحللها۔ فالجامع هو الطبع والمهلک هو الدهر"

(۲) بنو حنیفہ نے حیس (آٹے) کا ایک بت بنایا تھا وہ اس کو پوجتے تھے۔ لیکن جب قحط پڑا تو اپنے معبود کو بھی
بھی کھا گئے، چنانچہ ایک جاہلی شاعر ان کی ہجو میں لکھتا ہے:۔

اکلت بنو حنیفة ربها عام التقحم والمجاعه لم یحذروا من ربهم سوء العواقب والتباعه

گالی دینا تو کوئی بات ہی نہیں تھی۔ (۱)

لہٰذا دہر کی تعظیم و عقیدت بھی ان کے یہاں محدود و مشروط ہی تھی۔ وہ اُسے "موثر فی الوجود" ضرور سمجھتے تھے۔ وہ بے شک بلایا و حوادث اور مصائب و نوائب کو "دہر" ہی کی طرف منسوب کرتے تھے۔ مگر جب ناراض ہو جاتے تو اسی دہر کو گالیاں دینے لگتے چنانچہ ابنِ حجر عسقلانی نے لکھا ہے:۔

"اور عربوں کی عادت تھی کہ جب اُنھیں کوئی تکلیف پہونچتی تو وہ اُسے دہر کی طرف منسوب کرتے اور کہتے بُرا ہو دہر کا اور بربادی ہو دہر کے لیے"(۲)۔

مشرکین عرب کی اسی عادتِ بد کی اصلاح کے لیے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:۔

"یقول اللہ تعالیٰ یوذینی ابنُ آدم یسبّ الدھر وانا الدھر بیدی الامر اُقلّب اللیل والنھار"

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

ابنِ آدم مجھے تکلیف پہونچاتا ہے جب وہ دہر کو بُرا بھلا کہتا ہے حالانکہ میں ہی مقلب دہر (زمانہ کا مالک متصرف ہوں) میں ہی اس کے لیل و نہار کو اُلٹ پلٹ کرتا ہوں۔

---

(۱) کامل للمبرد الجزء الثانی ص۱۳۷

رب العباد ما لنا و ما لکا قد کنت تسقینا فما بدا لکا

انزل علینا الغیث لا ابالکا

(۲) فتح الباری جلد ۲۰ ص۲۳۴

"وکانت عادتھم اذا اصابھم مکروہ اضافوہ الی الدھر۔ فقالوا بؤساً للدھر وتبّاً للدھر"

اور اسی اصلاح کے لئے آیت کریمہ :-

وَ قَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَ نَحْيٰى وَ مَا يُهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ وَ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ "

کا نزول ہوا -

جس نے "زمانہ" کے باب میں اسلام کا موقف قطعی طور پر متعین کر دیا - اس کی تفصیل اگلی قسط کا موضوع ہے -

مگر محررہ بالا معروض سے اتنا متحقق ہے کہ " تاألّہ زمان " کا خیال اسلام کی نہیں بلکہ غیر مسلم مذاہب اور فکری نظاموں کی پیداوار ہے - اس کی تلاش خالص اسلامی فکر میں عبث و بیکار ہے -

آپ کا انمول بچّہ
آپ کا پیارا بچّہ۔
آپ اُس کی خواہش پوری کرنے کے لئے آسمان کے تارے بھی
توڑ کر لانے کو تیار ہیں۔
لیکن اگر آپ کے بچّے زیادہ ہوں تو کیا آپ اُن کی
خواہشوں اور ضرورتوں کو پورا کر سکیں گے؟
دوسرا بچّہ تین سال بعد
اپنے قریب کے فیملی ویلفیئر پلاننگ سینٹر سے
صلاح لیجئے۔

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتبہ

سعید احمد اکبر آبادی

مصباح اللغات

مکمل عربی اردو ڈکشنری

مرتبہ

ابوالفضل مولانا عبدالحفیظ بلیاوی

قیمت
اٹھائیس روپے

ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی

بُرہان دہلی

جلد ۷۰	ماہ صفر المظفر ۱۳۹۳ھ مطابق مارچ ۱۹۷۳ء	شمارہ ۳

علی گڈھ مسلم یونیورسٹی

(۹)

از: سعید احمد اکبر آبادی

گورنمنٹ کا اعلان چنانچہ ابھی گفت وشنید کا سلسلہ جاری
کہ جولائی ۱۹۱۲ء کے آخری عشرہ میں شملہ سے اچانک حسب ذیل سرکار
شائع ہو گیا۔

"اس بات کا قطعی فیصلہ ہو گیا ہے" کہ علی گڑھ اور بنارس کی یونیورسٹی
اثر اسی مقام تک محدود ہو جس میں کہ وہ یونیورسٹی قائم ہو،

اس اعلان نے ہندوستان کے مسلمانوں میں بددلی اور مایوسی ضرور
لیکن یونیورسٹی کے لیے ان کا جوش وخروش کم نہیں ہوا۔

نواب وقار الملک علی گڈھ کی سکونت ترک کرکے مراجعت وطن کی تیاری
تھے، کیونکہ سکریٹری کے عہدہ سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ صحت خراب تھ
گورنمنٹ کے اعلان کو پڑھ کر تڑپ اٹھے، اسی وقت اس اعلان کے جواب
طویل مضمون اخبارات میں شائع کیا اور اس میں صاف لکھا:

گورنمنٹ کے اس اعلان کے باوجود مسلمانوں کو بدستور
خواہش پر قائم رہنا چاہیے، کیونکہ اگر آج ہم اس پر رضامند ہو

> توکل کو خود ہمارے ہاتھ کٹے جاتے ہیں اور ہماری آئندہ نسلیں جو عدم الحاق کے نقصانات سے متاثر ہوں گی وہ ہم پر لعنت بھیجیں گی کہ ہم نے ایسے انتظام کو قبول کر کے اپنی نسلوں کو یونیورسٹی کے فوائد سے محروم کر دیا۔

اسی مضمون میں آگے چل کر انھوں نے گورنمنٹ سے مطالبہ کیا ہے کہ الحاق کو منظور کرنے کے وجوہ بیان کرے اور اس کے بعد لکھتے ہیں:

> یہ بات مدت سے محسوس ہوتی چلی آرہی ہے کہ گورنمنٹ غریبوں کو اعلیٰ تعلیم سے روکتی ہے، چنانچہ تعلیم کے اخراجات کا روز بروز بڑھتا جانا اس بات کی صاف دلیل ہے اور اب حال کا یہ اعلان تو سونے پر سہاگہ کا کام دیتا ہے۔

مسلمان زعماء کا ردِ عمل | یہ صرف نواب وقار الملک کا اپنا اور شخصی تاثر نہ تھا۔ بلکہ مسلمانوں کے سب سردار اور سربرآوردہ حضرات کا ردِ عمل بھی یہی تھا۔

چنانچہ گورنمنٹ کے اس اعلان پر غور و خوض کرنے کی غرض سے ۱۱، ۱۲ اگست کو یونیورسٹی کنسٹیٹیوشن کمیٹی کا جو جلسہ لکھنؤ میں منعقد ہوا اس میں کمیٹی کے صدر سر راجہ محمود آباد نے ایک نہایت پُر زور تقریر کی اور کہا:

> ہمارا نصب العین الحاقی یونیورسٹی ہے، مقامی یونیورسٹی کا تو کبھی ہم نے خیال بھی نہیں کیا۔ گورنمنٹ کے اس اعلان کے باوجود ہم اب بھی الحاقی یونیورسٹی کی تائید میں ہیں اور رہیں گے، ہم برابر کوشش کرتے رہیں گے کہ ہمیں الحاق کا حق ملے۔

جناب صدر کی تقریر کے بعد کمیٹی کے سکریٹری ڈاکٹر ضیاء الدین احمد نے تار اور خطوط پڑھ کر سنائے جو اس موقع پر کمیٹی کو موصول ہوئے تھے ان میں ایک تار سر آغا خاں کا اور خطوط میں ایک خط مولانا شبلی کا بھی تھا اور ان دونوں حضرات نے یونیورسٹی کے

الحاقی ہونے پر اصرار کیا تھا۔

ملک میں ترکِ موالات اور اس کے بعد تحریک آزادی نے ایک عام ذہن مسلمانوں میں یہ پیدا کر دیا تھا کہ ان میں جتنے لوگ خان بہادر، یا سر، یا نواب یا اسی قسم کا کوئی اور خطاب رکھتے ہیں وہ حکومت کے خوشامدی اور اس کے غلام ہیں اور ان کو ملک و ملت کے مفاد سے کوئی واسطہ نہیں، یہ ذہن کس درجہ غلط اور حقیقت سے دور تھا اس کا اندازہ اس ایک بات سے ہی ہو سکتا ہے کہ اس ایک یونیورسٹی کے معاملہ میں جتنے مسلمان خان بہادر، سر، نواب - راجہ وغیرہ حضرات ہیں وہ اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کے خاطر انگریزی حکومت کے بالمقابل صف قائم کیے ہوئے ہیں۔ سر آغا خاں اور راجہ محمود آباد کا تو خیر کہنا ہی کیا ہے۔ وہ تو اس تحریک کے عظیم لیڈر تھے ہی، اس جلسہ میں پنجاب کے مشہور لیڈر میاں محمد شفیع

(جو بعد میں سر اور وائسرائے کی اگزکیوٹو کونسل کے ممبر بنے)

موجود تھے۔ ان کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ انھوں تقریر کرتے ہوئے کہا

"میں پنجاب کے مسلمانوں کی طرف سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر گورنمنٹ کے دباؤ میں آکر آپ حضرات نے مقامی غیر الحاقی یونیورسٹی تسلیم کر لی تو پنجاب کے مسلمان یونیورسٹی دستور کمیٹی کے خلاف قانونی چارہ جوئی کریں گے۔

آنریبل فخر الدین (جو بعد میں سر ہوئے) بھی اس جلسے میں موجود تھے۔ انھوں نے کھڑے ہو کر کہا

آنریبل میاں محمد شفیع نے جو خیالات الحاق کے بارہ میں پنجاب کے مسلمانوں کے بیان کئے ہیں وہی خیالات بہار کے مسلمانوں کے ہیں اور ان کا پیغام بھی یہی ہے کہ آپ لوگوں نے قوم کی بات نہ سنی اور مقامی یونیورسٹی لے کر بیٹھ گئے تو وہ آپ کے خلاف عدالتی کاروائی کریں گے

ان پرجوش و ولولہ انگیز تقریروں کے بعد یونیورسٹی دستور کمیٹی نے ایک مفصل اور واضح رزولیوشن باتفاق آرا منظور کیا۔ جس میں اور باتوں کے ساتھ اس پر اپنے سخت افسوس کا اظہار کیا کہ گورنمنٹ مجوزہ مسلم یونیورسٹی کو الحاقی ماننے کے لیے آمادہ نہیں ہے۔ اس کے بعد یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کی میٹنگ ہوئی اور اس میں بھی اسی قسم کی پر جوش تقریریں ہوئیں۔ ادھر مسلمانوں کے اخبارات بھی مسلسل مضامین لکھ رہے تھے اور مسلمانوں میں حکومت کے خلاف سخت اشتعال پیدا ہو گیا تھا۔

لیکن آگے چل کر خود کمیٹی کے ممبروں میں دو گروہ ہو گئے، ایک گروہ ان مسلمانوں کا تھا جو الحاق کے معاملہ میں گورنمنٹ کی بات تک سننے کا روادار نہیں تھا۔ اس کے بالمقابل ایک دوسرا گروہ تھا جس کو اعتدال پسند کہنا چاہیئے۔ اس گروہ نے محسوس کیا کہ اگر مسلمان الحاق کی شرط پر اصرار کرتے ہیں تو اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہ ہوگا کہ مسلمان یونیورسٹی سے ہی محروم ہو جائیں گے اور یہ کونسی عقلمندی ہے کہ کھائیں گے تو گھی سے کھائیں گے ورنہ جی سے ہی جائیں گے۔

اس کے علاوہ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ہندوؤں نے الحاق کے معاملہ میں گورنمنٹ کی بات تسلیم کر لی تھی اور اس بنا پر ۱۹۱۶ء میں ہندو بنارس یونیورسٹی قائم بھی ہو گئی تھی ان سب پہلوؤں پر نظر کر کے مسلمانوں کا ایک نمائندہ وفد جس میں مولانا محمد علی مرحوم بھی تھے۔ پوشیدہ طور پر شملہ جا کر وائسرائے سے ملا اور اس نے غیر الحاقی یونیورسٹی کو تسلیم کر لیا۔

چونکہ مسلمانوں میں سخت ہیجان اور اشتعال تھا اس بنا پر ڈپوٹیشن نے چپ چاپ حکومت سے یہ معاملہ طے کیا، لیکن جب اس کی خبر عام ہوئی تو مسلمانوں میں ڈپوٹیشن اور اس کی کارگزاری کے خلاف سخت بیزاری اور بد دلی پیدا ہو گئی۔ اس خفیہ اجلاس اور اس کی کارروائی کا نام صحبتِ اشبیت رکھا گیا۔

مولانا شبلی نے بھی ڈیپوٹیشن کی ترتیب اور اس کی کارروائی پر سخت تنقیدی نظمیں لکھیں جن کا بڑا چرچا ہوا۔ لیکن اس معاملہ میں سب سے زیادہ نکتہ چینی مولانا ابوالکلام آزاد نے کی، مولانا نے اس موضوع پر الہلال میں ایک دو نہیں متعدد مضامین لکھے جن میں مولانا کے سحر طراز قلم نے طنز و تشنیع کے وہ چمن کھلائے ہیں کہ باید و شاید!

ایک لمحۂ فکریہ! لیکن آج جب کہ مسلم یونیورسٹی زمانہ کے گوناگوں انقلابات و تغیرات سے گزری ہوئی اپنی عمر کے باون برس پورے کر چکی ہے اس بات کا موقع ہے کہ یونیورسٹی کے معاملہ میں یہ جو کچھ ہنگامہ اور معرکہ بپا ہوا اس کا ایمانداری اور صاف دماغی سے جائزہ لیا جائے۔

سوال یہ ہے کہ مولانا شبلی اور مولانا ابوالکلام آزاد جن بزرگوں پر قومی فروشی اور حکومت پرستی کا الزام لگاتے ہیں کیا وہ الزام صحیح ہے؟ ہمارے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ یہ الزام سرتاسر غلط اور بے بنیاد تھا۔ اور اس کی بنا قوم پروری کا وہ تصور تھا جو حریت پسندی کی تحریک کا زائیدہ تھا۔

لیعنی ہر وہ بات جو انگریز کی تائید میں ہو وہ قوم کے ساتھ غداری ہے اور ہر وہ اقدام جو حکومت کے خلاف ہو نیشنلزم، حریت پسندی اور قوم پروری ہے۔

اس یونیورسٹی کے معاملہ پر ہی غور کیجیے، اس سے متعلق گورنمنٹ نے یہ تسلیم کر لیا کہ اس کا نام "مسلم یونیورسٹی" ہوگا۔ اس میں مذہبی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہوگا، اس کا وائس چانسلر مسلمان ہوگا۔ کورٹ کے سب ممبر مسلمان ہوں گے اور چانسلر بھی کورٹ کا منتخب ہوگا۔ اب بجز الحاق کے مسلمانوں کا کونسا مطالبہ ہے جسے انگریزوں نے تسلیم نہیں کر لیا۔

رہا الحاق! تو سچ یہ ہے کہ اس معاملہ میں انگریزوں کا خیال درست تھا۔ اور

مسلمانوں کا مطالبۂ الحاق محض جذباتیت اور عاقبت نا اندیشی پر مبنی تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ سرسید کے ذہن میں یونیورسٹی کا جو تصور تھا وہ صرف مقامی اور غیر الحاقی یونیورسٹی کا تھا۔ جیسا کہ ان کی تحریروں اور تقریروں سے ظاہر ہے، ۹ر اگست ۱۲ء کو تار کے ذریعہ شملہ سے گورنمنٹ کا جو مراسلہ سر راجہ محمود آباد کے نام روانہ کیا گیا تھا اس میں تمہید کے بعد تحریر تھا،

> ہز مجسٹی کے وزیر ہند نے کامل غور و خوض کے بعد فیصلہ کر دیا ہے کہ مجوزہ یونیورسٹی کو اس بات کا حق نہ ہوگا کہ جس مقام پر وہ قائم ہے اس سے باہر الحاق کر سکے۔

اس کے بعد اس خط میں یہ بھی جتایا گیا تھا کہ:

سرسید بھی مقامی یونیورسٹی ہی بنانا چاہتے تھے۔ آگے چل کر چند دلائل الحاق کے نقصانات اور اس کی مضرت کے بیان کئے ہیں اور پھر لکھا ہے:

> "ہز مجسٹی کے وزیر ہند اور گورنمنٹ ہند دونوں یہ تسلیم کرتے ہیں کہ گورنمنٹ کے اس فیصلے سے مسلمانوں کو مایوسی ہوگی لیکن ان کو یقین ہے کہ آگے چل کر اس (عدم الحاق) سے مسلمانوں کو بہترین فوائد حاصل ہوں گے"

(وقار حیات ص ۵۸۳)

مذکورہ بالا عبارت کے خط کشیدہ الفاظ پر غور کیجئے اور انگریزوں کی فراست اور دور اندیشی کی داد دیجئے، انھوں نے مستقبل کے آئینے میں جھانک کر دیکھا تھا کہ ایک وقت آئے گا جب کہ ہندوستان آزاد ہوگا۔ اقتدار اعلیٰ ہندوؤں کے ہاتھ میں ہوگا اور حکومت سیکولر ہوگی۔ اس وقت مسلم یونیورسٹی کا الحاق مسلمانوں کے لیے وبال جان بن جائے گا۔

چنانچہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ آج وہی وقت ہے، اُس زمانے میں مسلمانوں کا مطالبہ یہ تھا کہ یونیورسٹی الحاقی ہو۔ لیکن آج مطالبہ یہ ہے کہ الحاقی نہ ہو۔
اس میں شبہ نہیں کہ جن مسلمانوں نے اُس زمانہ میں یونیورسٹی کا عدم الحاقی ہونا تسلیم کیا تھا ان کے سامنے یہ فائدہ جو ہم اب اٹھا رہے ہیں نہیں تھا اور صرف حالات سے
"یعنی حکومت کا سخت اصرار اور ہندوؤں کا بنارس ہندو یونیورسٹی کے متعلق اس بات کو مان لینا"
مجبور ہو کر وہ اپنے پہلے موقف سے ہٹ گئے تھے۔
لیکن اس میں حکومت پرستی کا دخل ذرا نہیں تھا اور یہ ایسا جرم قوم فروشی نہیں تھا جس پر شبلی اور ابوالکلام اس قدر شور مچائیں اور ڈپوٹیشن کو سخت برا بھلا کہیں
مولانا ابوالکلام آزاد اگر آج زندہ ہوتے تو ان سے پوچھا جا سکتا تھا کہ:
"حضرت! آپ اور آپ کی کانگریس ہمیشہ دنیا میں اعلان کرتے رہے کہ:
ملک کی تقسیم نہیں ہونے دیں گے نہیں ہونے دیں گے۔
لیکن تاریخ گواہ ہے جب وقت آیا تو کانگرس نے حضرت والا کی صدارت میں چپ چپاتے مسلم لیگ کے ساتھ ملک کی تقسیم کا معاملہ طے کر لیا اور یہ سب کچھ (اور وہ بھی شملہ پر ہی) اس رازداری کے ساتھ ہوا کہ جب یہ خبر عام ہوئی تو مہاتما گاندھی اور خان عبدالغفار خاں اور جمعیت علمائے ہند یہ سب حیران رہ گئے اور فرطِ غم واندوہ سے انہوں نے سر پیٹ لیا۔
پس اگر عدم الحاق کو مان لینا ملت کے ساتھ غداری تھا۔ درآنحالیکہ تجربہ نے بتایا کہ یہی فیصلہ بہتر اور یونیورسٹی کے حق میں مفید تھا۔ تو حضرت والا ارشاد فرمائیں کہ کانگرس کے تقسیم پر رضا مند ہو جانے کو کیا کہا جائے۔ جب کہ ہر شخص اپنی آنکھ سے دیکھ رہا ہے کہ یہ فیصلہ نہایت غلط۔ صد درجہ [illegible]

اور ہندو مسلمان دونوں کے لیے ناقابل تلافی نقصانات کا حامل تھا۔ اور یہ نقصان صرف ایک ملک کا نہیں، بلکہ پورے ایشیا اور افریقہ کا نقصان ہے۔

انسان کی یہ فطرت بھی خوب ہے کہ خود ایک کام اپنے دیرینہ منشا اور مقصد کے خلاف حالات کی مجبوری سے کرتا ہے تو اس کی سیکڑوں تاویلات توجیہات کرتا ہے لیکن وہی یا اسی قسم کا کوئی کام حالات کی مجبوری سے کوئی دوسرا کرتا ہے تو یہ پہلا شخص اس کے سو سو نام رکھتا اور اسے بدنام کرتا ہے۔

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

یونیورسٹی کی تشکیل بہر حال ان سب مراحل و منازل سے گذرنے کے بعد آخر ۱۹۲۰ء میں علی گڈھ مسلم یونیورسٹی بل مرکزی اسمبلی میں پیش ہوا اور منظور ہوا۔ اور اب علی گڑھ "محمڈن کالج" علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کی شکل میں تبدیل ہو گیا۔ بل کو پیش کرتے ہوئے وزیر تعلیم نے جو تقریر کی تو اس میں اس مراسلہ کا حوالہ بھی دیا تھا جو گورنمنٹ آف انڈیا نے سکریٹری آف اسٹیٹ کو لکھا تھا اور جس میں یہ کہا گیا تھا کہ:

یہ ایک نیا تعلیمی تجربہ ہے جس کو حکومت اور مسلمان قوم دونوں کا اعتماد حاصل ہے۔ اور یہ تجربہ مسلمانوں کی قوم کی تکمیل کا ذریعہ ہو گا۔

مرکزی وزیر تعلیم نے اس موقع پر جو تقریر کی اس میں انھوں نے کہا۔

اس بل کو پیش کر کے ہم ایک تعلیمی اقامتی یونیورسٹی کا اضافہ کر رہے ہیں۔ جدید طرز کی یہ یونیورسٹی مسلمانوں کے لیے بہت مفید ثابت ہو گی۔ اور مجھ کو امید ہے کہ یہ یونیورسٹی ہند کے مسلمانوں کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے

میں ایک اہم پارٹ ادا کرے گی۔

مسلمانوں کی اپنی یونیورسٹی کا قیام جس کے دروازے عالم گیر علم کے لیے کھلے ہوں۔ مسلمانوں کی ترقی کی ضامن ہوگی۔

یونیورسٹی کے لیے اس وقت جو ایکٹ بنا جو "علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ نمبر ۴۰ سنہ ۱۹۲۰ء کہلاتا ہے۔ اس کی مختلف دفعات میں اس بات کا اہتمام کیا گیا تھا کہ یونیورسٹی صرف نام کی نہیں بلکہ کردار کی بھی مسلم یونیورسٹی ہو۔

مدیر برہان جنوبی افریقہ کے سفر پر

مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی مدیر برہان مارچ سنہ ۷۳ء کے پہلے ہفتہ میں تین ماہ کے لیے جنوبی افریقہ کے سفر پر تشریف لے گئے ہیں دوران سفر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مضمون کا سلسلہ لکھنے کا موقعہ مل سکا تو فبہا ورنہ ناظرین کرام مدیر موصوف کی واپسی تک زحمت انتظار فرمائیں۔

نیازمند: محمد ظفر احمد غفرلہٗ

رسولؐ شاہد و مشہود

(۷)
نوید فتح مکہ ۸ھ

(از جناب قاری بشیر الدین صاحب پنڈت ایم اے)

اتھرو وید کانڈ ۲۰، سوکت ۲۱ کا نواں منتر فتح مکہ کی پیشنگوئی پر مشتمل ہے اور آٹھواں منتر جنگ بنو قریظہ سے تعلق رکھتا ہے۔ چونکہ جنگ احزاب سے زیادہ خطرناک اور کوئی جنگ نہیں، اس جنگ نے دشمن کی امیدوں پر پانی پھیر دیا اور وہ پھر متحد ہو کر کبھی سامنے نہیں آسکا اس لیے جنگ بنو قریظہ کو نظر انداز کرتے ہوئے فتح مکہ کی خوشخبری سنائی جا رہی ہے۔ اس کو سننے سے پہلے اس کے پس منظر کو سامنے رکھنا ضروری ہے تاکہ منتر کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

پس منظر:۔ ۶ھ میں کفار قریش کے ساتھ آنحضورؐ نے ایک معاہدہ کیا جو تاریخ میں "صلح حدیبیہ" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ صلح نام بظاہر مسلمانوں کے لیے نہایت ذلت آمیز تھا۔ لیکن آنحضورؐ کی دوررس نگاہیں اس کی اہمیت کو سمجھتی تھیں اسی لیے آپ نے مومنوں کو تسلی دیتے ہوئے إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا کے الفاظ سے اس کی تعبیر فرمائی۔

معاہدہ کی شرائط مختصراً یہ تھیں (۱) اگلے سال مسلمان عمرہ ادا کرنے کے لیے آئیں لیکن مکہ میں تین دن سے زیادہ نہ ٹھہریں۔ (۲) مسلمان کوئی ہتھیار اپنے ساتھ نہ لائیں۔ (۳) مکہ میں مقیم کسی مسلمان کو اپنے ساتھ نہ لیجائیں (۴) مکہ کے کافروں یا مسلمانوں میں سے جو کوئی مدینہ

جائے اُسے واپس کر دیا جائے لیکن اگر کوئی مدینہ سے مکہ چلا آئے تو اسے واپس نہیں کیا جائیگا۔ (۵) قبائل عرب کو اختیار ہوگا کہ وہ فریقین میں سے جس کے ساتھ چاہیں معاہدہ کرلیں۔ چنانچہ دو حریف قبائل میں سے بنو خزاعہ رسول کریمؐ کے حلیف اور بنو بکر قریش کے حلیف بن گئے۔ اس معاہدہ کے نتائج وعواقب نے کچھ ہی مدت کے بعد عملاً یہ حقیقت واضح کردی کہ واقعی یہ صلحنامہ صلحنامۂ شکست نہیں بلکہ فتح تھا۔ اس لیے کہ معاہدہ کے بعد (۱) کفار کو پہلی مرتبہ مسلمانوں سے آزادانہ ملنے جلنے کا موقع ملا اور آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہوا اور وہ (۲) مسلمانوں کی نیکوکاری اور اخلاق کی پاکیزگی کو دیکھ کر کثرت کے ساتھ مسلمان ہونے لگے۔ (۳) معاہدہ کے بعد مکہ کے نومسلموں نے عتبہ کی سرکردگی میں مکہ سے بھاگ کر سمندر کے کنارے اپنی ایک نوآبادی بسالی اور قریش کے تجارتی قافلوں کے لیے وبالِ جان بن گئے۔ قریش نے گھبرا کر معاہدہ کی شرط (۴) کو منسوخ کردیا، اس طرح یہ لوگ مدینہ آکر رہنے لگے۔

آنحضورؐ نے صلحنامۂ حدیبیہ کی شرائط کی پابندی کرکے دنیا کو عملاً یہ سبق سکھایا کہ معاہدہ ہو جانے کے بعد خواہ وہ اپنی منشاء کے مطابق ہو یا نہ ہو شرائط پر عمل کرکے اپنی صداقت کا ثبوت دو جو امن و امان کی ضامن ہے اور تمہاری کامرانی کی دلیل۔ کامرانی تو اسی سے ظاہر ہے کہ صلح نامہ حدیبیہ کے وقت یعنی ۶ھ میں آپ کے ساتھ کل ۱۴۰۰ جاں نثار تھے لیکن ۸ھ میں یعنی فتح مکہ کے وقت دس ہزار نفوسِ قدسیہ کی جماعت آپ کے ساتھ تھی۔ رہا صداقت کا نمونہ تو وہ اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ عین ترتیب معاہدہ کے وقت ابو جندل بن سہیل بن عمرو پا بجولاں بدحواسی کے عالم میں مکہ سے بھاگ کر آپ کے پاس آتا ہے اور آپ اسے واپس کر دیتے ہیں۔ اسی طرح عتبہ وغیرہ نے مکہ سے بھاگ کر جب مدینہ میں پناہ لینی چاہی تو آپؐ نے معاہدہ کی شرط کو ملحوظ رکھ کر پناہ دینے سے انکار کر دیا۔ اس طرح مکہ کے ان تازہ نومسلموں کو اپنی ایک نئی آبادی سمندر کے کنارے بسانا پڑی۔ قریش مکہ نے شرائط کو ملحوظ نہیں رکھا اس لیے ذلیل و خوار ہوئے۔ انھوں نے شرط نمبر ۵ کو توڑ کر اپنی کم ظرفی کا ثبوت دیا اور وہ اس طرح

کہ صلح حدیبیہ کے بعد بنو بکر اور قریش دونوں خفیہ سازش کر کے بنو خزاعہ پر ٹوٹ پڑے تاکہ اسلام کی قوت میں ضعف پیدا ہو جائے۔ عکرمہ بن ابوجہل، صفوان بن امیہ اور سہیل بن عمرو جیسے جلیل القدر سرداران قریش حدود حرم میں بھی تلوار چلانے سے نہیں چوکے۔ بنو خزاعہ نے گھبرا کر بیت اللہ شریف میں پناہ لی تھی وہاں بھی ان کا خون بہایا گیا۔ مجبور ہو کر عمرو بن سالم کی زیر قیادت ۴۰ ناقہ سواروں نے مدینہ میں پہونچ کر آپؐ سے فریاد کی۔ آنحضورؐ کو صدمہ تو بہت ہوا۔ مگر ضبط سے کام لیا۔ ایک سفیر مکہ بھیج کر قریش کو پیام دیا کہ (۱) بنو بکر کی حمایت ترک کر کے مقتولوں کا خوں بہا ادا کریں یا (۲) معاہدۂ صلح کی شکست کا اعلان کر دیں۔ قریش نے آخری شرط کو منظور کر لیا لیکن بعد کو نادم ہوئے اور بعجلت تمام رئیس اعظم ابو سفیان کو تجدید معاہدہ کے لیے مدینہ بھیجا۔ مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا اور بارِ رسالت سے کوئی جواب نہیں ملا۔

یہ ہے فتح مکہ کا پس منظر۔ اب آپ وید منتر سے لطف اندوز ہوں۔ وید نے محمد رسول اللہؐ کی جنگوں کی پیشینگوئیوں کو فتح مکہ پر ختم کر دیا ہے۔ منتر یہ ہے:-

त्वमेताञ् जनराज्ञो द्विर्दशाबन्धुना सुश्रवसोपजग्मुषः ।
षष्टिं सहस्रा नवतिं नव श्रुतो नि चक्रेण रथ्या दुष्पदावृणक् ॥

(بحوالہ اتھرو وید کانڈ ۲۰، سوکت ۲۱، منتر ۹)

معنی:-

تُوم - تو نے
اِیتاں - ان کے
جَن راجیہ (راجیہ) سرداروں
دوبِرڈش - دس دونے یعنی بیس
اَبندھونا - بے یار و مددگار یتیم
سشروش - اچھی تعریف والے (محمدؐ) کے ساتھ
اُپ جگمشہ - ان (دشمنوں) کے ساتھیوں کو۔
شَشٹم سَہَسرا - ساٹھ ہزار
نَوَتِ نَو - ننانوے
شُرتو - معروف
چکرینڑ، رتھیا - چکر اور جنگی رتھ (جنگی رتھ کے چکر سے)
دُشپدا - قابو میں نہ آنے والے یعنی ناقابل تسخیر

بِی اوِرِنک۔ تہ ویالاکردیا ہے۔

مطلب:۔"تو نے اے اندر (ایشور) ایک بے یارو مددگار (یتیم) ،، اچھی تعریف والے (محمد) کے ساتھ (ہوکر) ان (قریشیوں) کے بیس سرداروں اور ساٹھ ہزار ننانوے دشمنوں کو اپنے ناقابلِ تسخیر جنگی رتھ کے چکّر سے تہس نہس کر دیا ہے "

تشریح:۔ (۱) بوقت بعثت مکّہ معظمہ کی آبادی ساٹھ ہزار نوّے بتائی جا چکی ہے (بحوالہ اتھروید کانڈ ۲۰ ، سوکت ۱۲۷ ، منتر ۱) اور فتح مکہ کے وقت ساٹھ ہزار ننانوے تھی اور ان کے بیس سردار تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شہر میں نگر پالیکا کے طرز کی حکومت تھی (مثل الکامل ص ۵)

(۲) مذکورۂ بالا قوی جمعیت کے مقابلہ میں ایک لاچار و یتیم انسان تھا۔

(۳) جو اپنی نیکی اور پاکیزگیٔ اخلاق کی وجہ سے معروف یعنی اسم بامسمیٰ اچھی تعریف والا محمدؐ بتایا گیا ہے یعنی اس بے یارو مددگار کا صفاتی نام معروف خوبیوں والا (محمدؐ) تھا۔

(۴) ویدوں کی تفاسیر یعنی برہمن گرنتھوں میں رتھ اور چکّر جنگی ہتھیار کے مترادف ہیں (ملاحظہ ہو اتیریہ برہمن اوّل ۳ ۶/۱ نیز حصہ سوم ۱۲ ۵/۴ ، شت پتھ برہمن پنجم ۱ ۶/۳ وغیرہ)

II فتحِ مکہ کی پیشینگوئی اور اس سے متعلق وہ تمام نشانیاں کہ جن کو دیکھ کر پوری دنیا آنحضورؐ کے مبعوث ہونے پر انھیں پہچان لے اور ان پر ایمان لے آئے نہایت کھلی ہوئی اور واضح ہیں اور مذاہب عالم کی تمام مقدس کتابوں میں مذکور ہے۔ یہاں پر ایک دوسری پیشینگوئی رگوید منڈل ۱ سوکت ۵۳ ، منتر ۹ کے حوالہ سے پیش کی جاتی ہے۔ یہ پیشینگوئی انگرس رشی کے بیٹے سوّیہ رشی کی ہے۔ اس کا ترجمہ پروفیسر گرفتھ نے یوں کیا ہے:

"WITH ALL OUTSTRIPPING CHARIOT WHEEL O INDRA THOU FAR FAMED HAST OVERTHROWN THE TWICE-TEN KINGS OF MN, WITH SIXTY THOUSAND NINE AND NINTY FOLLOWERS WHO CAME IN ARMS TO FIGHT WITH FRIENDLESS SUSHRAVAS"

ترجمہ :- اے لائق حمد و ستائش اندر (ایشور) تو نے اپنی طاقت و قدرت کے جنگی
رسے ۲۰ راجہ اور ان کے ساٹھ ہزار ننانوے ساتھیوں کو شکست خوردہ کر دیا کہ جو مسلح ہو کر
بے یار و مددگار سُشرَوش (محمد) سے لڑنے آئے تھے۔

فائدہ :- ان دونوں وید منتروں میں جو پیشینگوئی ہے ظاہر ہے کہ وہ دو بادشاہوں
جنگ نہیں ہے۔ کیونکہ ایک طرف ۲۰ راجا مع ساٹھ ہزار لشکر جرّار اور دوسری طرف ایک
یار و مددگار یتیم ہے لیکن اس کے ساتھ طاقتور تائیدِ غیبی کا جنگی چکر ہے جس نے اُسے آخر کار
فتح مکّہ کے موقع پر) اتنے بڑے دشمن پر غالب کر دیا۔ اس منتر کو اتھروید کانڈ ۲۰، سوکت ۱۲۷
پہلے منتر کے ساتھ ملا کر پڑھیے تو آنحضورؐ کی پوری زندگی کا خلاصہ سمجھ میں آ جائے گا کہ ایک
وقت وہ یکہ و تنہا بے یار و مددگار ہیں، دوسرا وقت آتا ہے تو وہ ایک فاتح کی حیثیت سے
آتے ہیں۔ قدرتِ خداوندی ۲۰ برس کے اندر حق و باطل کا فرق کر کے دکھا دیتی ہے۔ اور
جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ یعنی "حق غالب ہوا اور باطل شکست کھا گیا"، کی تفسیر عملی شکل
دنیا کو دکھا کر حضورؐ کی صداقت پر ایمان لانے کی دعوت دیتی ہے کاش کہ ہمارے بھائیوں
نصیب ہو۔

II مذکورہ بالا منتر ہر پہلو سے فتح مکّہ کے متعلق ہے اس کا مزید ثبوت رگوید کا مندرجہ ذیل
تر پیش کر رہا ہے جس میں واضح طور سے اعتراف ہے کہ "مامح رشی" دس ہزار صحابہ کے
تھ معروف ہے فتح مکّہ میں ظاہر ہے کہ دس ہزار قدوسیوں کی جماعت آپ کے ہمراہ تھی۔
رگوید منڈل ۵، سوکت ۲۷ کا یہ پہلا منتر ہے ملاحظہ ہو :-

प्रनस्वन्ता सतपतिर्मामहे मे गावाचेतिष्ठो असुरो मघः
त्रैवृष्णो अग्ने दशभिः सहस्रैर्वैश्वानरः त्र्यरुणश्चिकेत ॥१॥

معنی :- ستپتی۔ حق پرست۔ صادق، حق نواز
سُوَسْتہ۔ گاڑیوں والے یعنی صاحبِ اقبال   مامح :- تعریف کیے گئے (محمدؐ) نے

مے ۔ مجھے	اَگُنِے وَلِشُوْ اَنَرَہٗ ۔ رحمت للعالمین
گاوا ۔ شرف ہمکلامی بخشا	دَشْبھی ۔ دس
چینیشٹھ ۔ نہایت دانا و عاقل	سَہستری ۔ ہزار کے ساتھ
اَشْرا ۔ اَسْر	ترِدیہ اُرُوڑاں ۔ سب خوبیوں والا
مگھونہ ۔ دولت مند سخی نے	بِکیت ۔ ممتاز ہوگیا ہے ۔
ترُ پورُ شَنَہ ۔ صاحب قدرت	

ترجمہ :- گاڑیوں والے ، حق نواز ، نہایت عاقل و دانا ، دولتمند سخی مامح (محمد) نے مجھے شرف ہمکلامی بخشا ، صاحب قدرت ، تمام خوبیوں سے متصف ، رحمت للعالمین ، دس ہزار (صحابہ) کے ساتھ معروف (مشہور) ہوگیا ہے ۔

تشریح :- (۱) پیشینگوئی کا ہر لفظ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کر رہا ہے ۔ آپؐ بچپن ہی سے حق نواز اور امین کے لقب سے مشہور تھے ۔ آپ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا ، اسی خوبی کو دیکھ کر حضرت ابوبکر صدیق رضؓ ایمان لائے تھے ۔

(۲) آپؐ کی شجاعت و استقلال کے سبھی معترف ہیں ۔

(۳) سخاوت کے لیے تاریخ کے صفحات شاہد ہیں ۔ گھر میں کوئی چیز از قسم زر کبھی نہیں رہنے دی ۔ شام ہونے سے پہلے پہلے مستحقین میں تقسیم کر دی گئی ۔

(۴) رحمت للعالمین ہونے کی گواہی تمام الہامی کتب میں اب بھی محفوظ ہے ۔

(۵) دس ہزار قدوسیوں کی جماعت کے ساتھ دنیا کے تمام انبیاء کرام میں صرف آپ ہی ممتاز ہیں ۔ وید اور انجیل گواہ ہیں ۔

(۶) آپ کو گاڑیوں والا بتایا گیا ہے ۔ اس سے دھوکہ نہ کھائیے ۔ بعض حضرات نے اسے عام گاڑی بان سمجھا ہے حالانکہ اس سے مراد ہے صاحب اقبال اور عزت دار ۔ ہندو کتب مقدسہ میں یہ ایک عام محاورہ ہے ۔ مثلاً :

(ا) کبھی اندر کو گاڑی نشین کہا گیا ہے (ملاحظہ ہو رگوید منڈل ۱، سوکت ۱۲۱، منتر ۵)
(ب) کبھی اندر کے آشا (شفق کی گاڑی) کو توڑنے کا ذکر ہے (ملاحظہ ہو رگوید منڈل ۲، سوکت ۱۵، منتر ۶ وغیرہ)
(ج) سورج کی بیٹی کا گاڑی میں پیدا ہونا بیان کیا گیا (رگوید منڈل ۱۰، سوکت ۸۵، منتر ۱)
(د) سورج کو گاڑی پر سوار ہونا کہا گیا ہے جسے گھوڑے کھینچتے ہیں۔

بہرحال مامح (محمد) رشی جو دس ہزار صحابہ کے ساتھ معروف ہیں۔ جناب محمد رسول اللہؐ کے علاوہ اور کوئی رشی، نبی یا رسول نہیں جو فاتح مکہ ہو اور پھر مکہ کو جس انداز سے فتح کیا گیا ہے، اس کا بھی ویدوں میں ذکر ہے (تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں۔ (۱) رگوید منڈل ۸، سوکت ۹۶، منتر ۱۳۔ (۲) سام وید پوروآرچک ادھیائے ۳ کھنڈ ۱۰، منتر ۱، (۳) اتھرو وید کانڈ ۲۰، سوکت ۱۳۷، منتر ۷ تا ۹)

مکہ جس انداز سے فتح کیا گیا اس کے لیے اتھرو وید کانڈ ۲۰، سوکت ۱۳۷ کا ساتواں منتر پیش کیا جا رہا ہے۔ منتر کی پیشینگوئی نہایت واضح لیکن انتہائی بلیغ انداز میں ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

अव द्रप्सो अंशुमतीमतिष्ठदीयानः कृष्णो दशभिः सहस्रैः ।
आवत्तमिन्द्रः शच्या धमन्तमप स्नेहितीर्नृमणा अधत्त
॥७॥

معنی:

درپسہ۔ کرہ (چاند)
انشومتیم: دریا میں (حوض کوثر میں)
اَوَاَتِشٹھت۔ جا کر ٹھہر گیا (جا ٹھہرا)
اِیانہ۔ آگے بڑھتا ہوا۔
کرشن، تاریک، سیاہ۔

دشبھی۔ دس
سہسرے۔ ہزار کے ساتھ
آوت تم۔ حفاظت کیا گیا
اندر۔ ایشور یا ایشور کی طاقت اندر
شچیا۔ پوری طاقت اور قوت کے ساتھ
دھمنتم۔ قرنا پھونکتا ہوا یا بگل بجاتا ہوا۔

اِسُشِیہتی ۔ ہتھیاروں کو
بَرمَنّا ۔ بہادروں نے
آپَ آدَھتّ ۔ پَرے رکھدیا ۔ الگ کردیا ۔ (آپ آدَرَہ) دور کر دیا ۔
مطلب :۔ کرشن چندر (سیاہ چاند) انشومتی (حوضِ کوثر) میں جا ٹھہرا ۔ آگے بڑھتا ہوا ۔ دس ہزار کی معیت میں (وہ) اندر قدرت سے حفاظت کیا گیا ہے ۔ بہادر دل نے قرنا (فتح کا بگل) پھونکتے ہوئے اپنے ہتھیاروں کو پرے رکھ دیا ۔
تشریح :۔ (۱) انشومتی (حوضِ کوثر) ایک خیالی دریا ہے ۔ ہندو نقطۂ نگاہ سے چاند جب مہینے کی اخیر تاریکیوں میں مکمل طور سے سیاہ ہو جاتا ہے تو انشومتی میں غوطہ لگا کر پھر سے تہنت آب و تاب کے ساتھ سفید ہو کر طلوع ہوتا ہے ۔ (سائنا چاریہ مفسر وید)
(۲) فلکیات کی تاریخ میں محققین کے نزدیک ایک ایسا زمانہ بھی گذرا ہے جب کہ چاند بذات خود روشن تھا ۔ لیکن رفتہ رفتہ اپنی روشنی کھو بیٹھا اب وہ سورج کی کرنوں سے روشنی مستعار لے کر روشن ہوتا ہے اور اپنی تاریکی کو دور کرتا ہے ۔ اس کی اپنی روشنی غائب ہو گئی اور اب وہ اپنی روشنی کے لیے سورج کا محتاج ہے ۔
فائدہ : پہلی تشریح کی توضیح گیتا کے خیال کے مطابق یہ ہو سکتی ہے کہ جب چاند پر تاریکی چھا جاتی ہے یعنی دھرم بگڑ جاتا ہے تو اس کی خرابی کو دور کرنے کے لیے ۔ " اے ارجن میں (کرشن چندر) پھر سے جنم لیتا ہوں " پورا اشلوک یہ ہے (گیتا ادھیائے ۴ ۔ اشلوک)

यदा यदा हि धर्मस्य ग्लानिर्भवति भारत ।
अभ्युत्थानमधर्मस्य तदात्मानं सृजाम्यहम् ॥ ७ ॥

معنی :۔
یَدا یَدا ۔ جب جب ، جب کبھی ۔ — دھرمَسیہ : دھرم کی
ہی ۔ بھی — گلانِی ۔ خسارہ ، نقصان ، کمی ۔
بھَوتِی ۔ ہوتی ہے ۔

تجارت ۔ اے ارجن　　　　تدٰ ۔ تب

ابھیو تھانم ۔ اٹھانے، بلند کرنے،　　　　آتمانم ۔ اپنی آتما کو

روشن کرنے کو　　　　سرجامیہ ۔ ظاہر کرتا ہوں

دھرمسیہ ۔ دھرم کی (سرخروئی کے لیے)　　　　اہم ۔ میں ۔

مطلب :۔ اے ارجن جب جب دھرم نشٹ (برباد) ہوتا ہے ۔ تب تب میں اپنے روپ (آتما) کو ظاہر کرتا ہوں یعنی جنم لیتا ہوں ۔ مطلب یہ ہے کہ چاند (یعنی دھرم) کے بے نور ہو جانے کے بعد (یعنی بگڑ جانے کے بعد) پیغمبر کی شکل میں اسی نور کا پھر سے ظہور ہوتا ہے اور چمکتا چاند نکل آتا ہے ۔ چاند سے مراد انبیاء کی تعلیم ہے ۔ اس وضاحت کو پیش نظر رکھ کر منتر کا مطلب سمجھیے ۔ کرشن چندر رانشومتی میں جا ٹھہرا " ظاہر ہے کہ آنحضورؐ کی بعثت ایسے زمانہ میں ہوئی جبکہ دنیا کے تمام مذاہب و ادیان بگڑ چکے تھے ۔ یہاں تک کہ ہندوستان میں کبھی چاند کو کرشن (سیاہ) کہا جانے لگا ۔ ایسی صورت میں نیا چاند یا سورج (وید میں چاند اور سورج کے لیے "سہسر شرنگ ورکھبو یہ سمدرات اواچرت " بتایا ہے یعنی ہزاروں سینگ والا بیل جو سمندر سے طلوع کرتا ہے) جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں نمودار ہوا ۔ جس کی حفاظت کا ذمہ قدرت نے لیا ہے وہ دس ہزار کی جماعت لے کر یعنی اپنی ہزاروں کرنوں کے ساتھ فضائے عالم پر طاقت کے ساتھ چھا گیا ۔ یعنی دنیا کو ازسرنو روشنی دی ۔ اس نے اہل غلبے کے وقت اپنے ہتھیاروں کو لکُم دینکُم ولی دین کہکر الگ رکھ دیا یعنی مذہب کی تلقین میں زبردستی کو روا نہیں رکھا ۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اس نے فتح مکہ کے موقع پر لاتثریب علیکم الیوم ۔ اذھبوا وانتم الطلقاء فرما کر " آج تم پر کوئی الزام نہیں ہے جاؤ تم سب آزاد ہو " دشمنوں کو معاف کر دیا ۔ بہرحال دونوں پہلوؤں سے منتر میں پیشینگوئی کا اطلاق نبی کریمؐ پر ہوتا ہے ۔

تشریح نمبر ۲ کی توضیح یوں کی جا سکتی ہے کہ جس طرح دنیا میں چاند اپنی روشنی

کھو چکا ہے اور اب وہ سورج کا محتاج ہے اسی طرح تمام دنیا میں تمام مذاہب کی روشنی ختم ہو چکی ہے اور اب وہ اسلام کے چمکتے ہوئے سورج سے روشنی لے کر ہی صراطِ مستقیم پر چل سکتے ہیں۔

قرآن شریف نے منتر کی پیشینگوئی کو اپنے الفاظ میں اس طرح بیان کیا" وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ وَجَعَلْنَآ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ (یعنی ہم نے رات اور دن کو دو نشانیاں بنایا ہے پھر ہم رات کی نشانی (چاند) کو مٹا دیتے ہیں اور دن کی نشانی (سورج) کو روشن بنا دیتے ہیں تاکہ تم (اس کی روشنی میں) اپنے رب کا فضل تلاش کرو۔

ظاہر ہے کہ رات (ضلالت و گمراہی) اور دن (صراطِ مستقیم) کی دو نشانیاں چاند اور سورج کو بتایا گیا ہے۔ چاند بھی پہلے روشن تھا لیکن اب بے نور ہے یہ موجودہ سائنسی تحقیقات کے اعتبار سے صرف دنیوی نظارہ ہی نہیں بلکہ مذہبی دنیا میں بھی ایسا ہی ہوا ہے جس کو "حرفِ آخر" کے عنوان سے آپ کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو سِرَاجًا مُّنِيْرًا (روشن سورج) بنا کر اُفقِ عالم پر بلند کیا تاکہ لوگ اس کی روشنی میں اپنے رب کے فضل کو تلاش کریں اس لیے کہ گذشتہ چاند کی روشنی کو اس نے ختم کر دیا ہے۔

حرفِ آخر

بزرگو و دوستو! پچھلے صفحات میں اس ناچیز نے فخرِ موجوداتِ دو عالم جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق انبیاء کرام کی جو بشارتیں درج کی ہیں ان کی اہمیت تو ظاہر ہے لیکن ان کے پیش کرنے کی ضرورت کیوں لاحق ہوئی؟ ان تمام بزرگ ہستیوں نے اپنی اپنی قوموں میں اپنے اپنے وقت پر تشریف لا کر وہ بشارتیں کیوں سنائیں؟ اس کا مختصر و جامع جواب تو قرآن شریف کی روشنی میں یہ ہے کہ انھوں نے اپنے اس وعدہ کو پورا کیا جو انھوں نے روزِ ازل اللہ سے کیا تھا کہ وہ "نبی موعود" کی شخصیت سے اپنی اپنی

قوموں کو روشناس کرائیں گے تاکہ جب وہ (نبی موعود) مبعوث ہوں تو ان کی قوم انہیں پہچان لے اور اُن پر ایمان لے آئے۔ اس عہد و میثاق کو سورۂ آل عمران میں بیان کیا گیا ہے۔" وہ وقت یاد کرو جب اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا کہ جب تمہارے پاس اللہ کی جانب سے کتاب و حکمت آئے پھر تشریف لائے تمہارے پاس وہ رسول جو تصدیق کرے اِن کتابوں کی جو تم کو دی گئیں (تمہارے پاس ہیں) تو تم ضرور ضرور اس پر ایمان لانا اور ضرور ضرور اس کی مدد کرنا۔ اللہ نے فرمایا کیا تم نے اقرار کیا اور اس پر میرا بھاری ذمہ لیا؟ سب نے عرض کی ہاں ہم نے اقرار کیا۔ فرمایا تو ایک دوسرے پر گواہ ہو جاؤ اور میں تمھارے ساتھ گواہوں میں ہوں۔" (سورۂ آل عمران۔ رکوع ۹)

اس عہد و میثاق اور ایفاء وعدہ کے اندر کیا راز مضمر ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے تھوڑے سے غور و فکر کی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ دنیا میں مادّیات و روحانیات پر فاعلِ مختار صرف ایک ہی وجود ہے اور وہ ہے خدائے وحدہٗ لاشریک لہٗ۔ مادیات میں اس کے جاری کیے ہوئے قانونِ فطرت کا مشاہدہ ہم دن رات کرتے رہتے ہیں اور ہم اس کو محسوس بھی کرتے ہیں مگر اس کے برعکس عالمِ روحانیت میں حواسِ خمسہ سے بلند وجدان و شعور جب تک رہنمائی نہ کریں کام نہیں بنتا اور حقیقت نگاہوں سے اوجھل رہتی ہے اور پھر جس طرح خدا کی ذاتِ واحد کے سوا کائناتِ عالم کی ہر شئے کے لیے دو سرحدیں مقرر ہیں یعنی آغاز و انجام۔ اسی طرح روحانیت میں بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ نسلِ انسانی کا جب آدم علیہ السلام سے آغاز ہوا تو وہ مادی وجود کے ساتھ خدا کی معرفت یعنی خدا پرستی کی امانت بھی اپنے ساتھ لائے۔ بالفاظِ دیگر وہ مادّی انسان بھی تھے اور روحانیت کے علم بردار "نبی" بھی تھے۔ تو جب یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ "اللہ" ایک ہے اور اس کی بنیادی صداقت و ہدایت کا پیغام بھی ایک ہے تو پھر عقل کا تقاضا یہ ہے کہ بنی نوعِ انسان کی رشد و ہدایت کی تعلیم کا سلسلہ بھی ایک لڑی میں ہو جس کی تمام کڑیاں ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ

ہوں کہ ان میں سے کسی ایک کی بھی تکذیب گویا پورے سلسلۂ روحانیت کی تکذیب کے مرادف ہو۔ اس حقیقت کو قرآنِ عزیز میں لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِہٖ کہہ کر بتلایا گیا ہے۔

بہر حال اس سلسلۂ روحانیت کی اگرچہ تمام کڑیاں ایک دوسرے سے وابستہ پیوستہ ہیں مگر آغاز و انجام کے درمیانی نشوونما کے پیشِ نظر اسی طرح فرقِ مراتب رکھتی ہیں جس طرح مادّی دنیا کے مختلف سلسلوں میں نظر آتا ہے۔ چنانچہ کائناتِ عالم کی ہر شے کی طرح عالمِ انسانی نے بھی عہدِ طفولیت گذارا ہے۔ اُس وقت انسانی دنیا ایک چھوٹے سے کنبہ کی طرح آباد تھی اور نسلِ انسانی کا باپ (آدمؑ) ہی روحانی طبیب بھی تھا۔ لیکن جب آہستہ آہستہ یہ سلسلہ آگے بڑھا اور بڑھ کر خاندانوں، قبیلوں، برادریوں سے بھی آگے قوموں اور جغرافیائی نسلوں میں تقسیم ہونے لگا تو ان مادّی نشوونما اور ترقیوں کے ساتھ ساتھ روحانی رشد و ہدایت نے بھی نقطۂ وحدت پر رہتے ہوئے تنوع اور کثرت کی شکل اختیار کر لی یعنی ہر ایک ملک و قوم میں جدا جدا ہادی و رہنما اور پیغمبر مبعوث ہونے لگے بلکہ بعض حالات میں ایک ہی قوم میں بیک وقت متعدد نبیوں نے دعوتِ حق میں ایک دوسرے کی اعانت کا فرض انجام دیا۔ ان سب کی اساسی و بنیادی وحدت ایک تھی یعنی خدائے واحد کی پرستش کی بنیادی تعلیم۔

عالمِ روحانیت کی اپنے محور و مرکز کی جانب یہ حرکت عالمِ مادّیات کے نشوونما اور ارتقا کے متناسب حالات سے وابستہ تھی اس لیے کہ خالقِ کائنات کا قانونِ فطرت دونوں سمتوں میں ایک ہی اصل پر کارفرما ہے تو پھر یہ بھی ضروری ہوا کہ ایک وقت بھی آئے جبکہ روحانیت کے کمال و ارتقاء کا یہ دور مادّی عالم کے ایسے دور کے ساتھ رونما ہو کہ جب کائناتِ انسانی کے ارتقاء دماغی و عقل کی استعدادات اپنے رشد و کمال کے ایسے نقطہ پر پہنچ جائیں کہ زمانۂ مستقبل کے پردے میں چھپی ہوئی تمام ترقیاں اسی ارتقاء کا نتیجہ کہلائیں اور

گو اس سلسلہ میں ایک مدت ہی کیوں نہ ہو جائے مگر کائناتِ ارضی کا یہ پورا مادی کارخانہ مادی اسباب کی بنا پر ایک کنبہ، ایک خاندان اور ایک برادری بن کر رہ جائے اور ملکوں وقوموں کی کثرت و بہتات کے باوجود کسی ایک گوشہ کی حرکت و سکون کے اثر سے تمام کائنات متاثر ہونے پر مجبور ہو جائے تاکہ اس وقت عالم روحانیات کا آخری نقطۂ ارتقاء کائناتِ انسانی کے عقل و دماغ کو اپنی یکتائی و وحدت سے متاثر کر سکے اور دنیا دانستہ یا نادانستہ اسی کے بتلائے ہوئے سوسائٹی کے نظام کو آہستہ آہستہ اپنا کر عملاً خدا کا ایک کنبہ بن جائے اور مساواتِ عالم اور اخوت ہمہ گیر کا مظاہرہ کر دکھائے۔

دوستو و بزرگو! اتنا سمجھ لینے کے بعد اب آپ دنیا کی تاریخ اقوام پر نظر ڈالیں۔ تاریخ شہادت دے گی کہ قرآنِ عزیز کی دعوت و اصلاح کی صدائے حق نے جب چھٹی صدی عیسوی میں دنیا کو پکارا ہے اس وقت دنیا کے مختلف مذاہب وادیان کی حالت بد سے بدتر تھی۔ قرآنِ عزیز کی آواز پہلی آواز تھی جس نے دنیا کے مذاہب اور ان کی سوسائٹی کے ابتر نظام میں نیا انقلاب پیدا کر دیا اور وہ دیر یا سویر میں اس کی اصلاحات کو قبول کرنے پر مجبور ہوئے تاکہ وہ اپنے وجود کو بظاہر باقی رکھ سکیں۔ توحید کامل اور خالص خدا پرستی۔ نسلی غرور و تفاخر کا انہدام۔ ذات پات کا خاتمہ۔ مساوات و اخوتِ عام کی داغ بیل۔ رواجی غلام کے خلاف اصلاح و انقلاب۔ نیک عملی وجہ شرافت اور نجات کا اس پر انحصار۔ عورتوں کے حقوقِ انسانیت میں مساوات۔ ازدواجی زندگی میں ظالمانہ رسوم و رواج اور ستی وغیرہ کا خاتمہ۔ خلع و طلاق کی مفید اصلاحات۔ زکوٰۃ کے وجوب اور سود کی حرمت کے ذریعہ اقتصادی نظام میں بنیادی انقلاب۔ انفرادی و اجتماعی ملکیت کے زرّیں اصول کے ذریعہ اعتدال کا اعلان۔ سیاسی و ملکی نظام میں شخصی بادشاہت اور یکطرفہ پارٹی کے اقتدار کو ختم کر کے "شوروی نظام" کی تشکیل وغیرہ وغیرہ ایسے اہم امور ہیں کہ آج کی دنیا میں ہر ایک انصاف پسند کے نزدیک ان کی صداقت و افادیت مسلّم ہے۔ دنیا کے

مختلف ممالک میں سوسائٹی کے نظام اور دھرم کی اصلاح کے نام سے جو صدائیں بھی
قرآنِ عزیز کے اعلانِ حق کے بعد اٹھیں اور اٹھ رہی ہیں وہ بالواسطہ اُسی صدائے حق کی
بازگشت پائیں گے جو چھٹی صدی عیسوی میں فاران کی چوٹی سے بلند ہوئی اور جس نے
وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ کی حقیقت کو تاریخِ عالم میں سچ کر دکھایا۔

مختصر یہ کہ جب مادی استعدادات نشو و نما پا رہے تھے اور چند صدیوں میں مادّی
اسباب کی بدولت یہ سارا کارخانۂ عالم ایک کنبہ بنجانے والا تھا اس وقت یہ ازبس ضروری
ہوا کہ " وحدتِ مذہب " کی روحانی صدا بلند ہو جو کسی خاص قوم و ملک کی بجائے پوری
دُنیا کے لیے یکساں حیثیت رکھے چنانچہ دنیا کی ہم آہنگی و یکجہتی کے لیے منشاء تقدیرِ الٰہی
کے مطابق جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی انھیں کی نصرت و حمایت کے
لیے تمام رشیوں، منیوں اور انبیاء کرام سے عہد لیا گیا تھا جس کو انھوں نے اپنی اپنی امتوں
کو پیشینگوئیوں اور بشارتوں کی شکل میں سنا سنا کر پورا کیا تا کہ جب وہ مبعوث ہوں تو انھیں
پہچان لیں اور ان پر ایمان لے آئیں یہ ہے بشارتوں کا اثباتی پہلو۔ اب آپ عملی پہلو پر نظر ڈالیں۔

میثاق کی عملی حیثیت | ذرا غور تو کیجیے آج بھی دنیا کے تمام مذاہب و ادیان میں صدہا اختلافات
کے باوجود " اوتار "، یا " منتظر ہستی " کا عقیدہ مشترک ہے۔ یہودی بھائی " ایلیاہ "، یا " وہ
نبی " کی آمد کے منتظر ہیں۔ نصاریٰ بھی ہر قسم کی تحریف کے باوجود " فارقلیط " (احمد) کے انتظار میں ہیں مجوس
آج تک ایک " نجات دہندہ " کا انتظار کر رہے اور ویدک دھرم کے پرستار بھائی بھی ایک " کلکی اوتار "
کے منتظر ہیں جو ہو چکا ہے۔ لیکن بے خبر ہیں۔ غرضیکہ مذاہب و ادیان میں موجودہ
اختلافات کے باوجود ایک چھوٹے سے ناستک گروہ کے علاوہ " موعود نبی " کے عقیدہ
کا ہزارہا سال تک کسی نہ کسی شکل میں بینار رہنا اس کے صحیح ہونے کی دلیل ہے یہ دوسری
بات ہے کہ ازراہِ حسد یہود نے " مسیح ہدایات " (جناب محمد رسول اللہ) کا انکار کر دیا اسی
طرح مذاہبِ عالم کی اقلیت کو چھوڑ کر جو حلقہ بگوش اسلام ہو گئی ان کی اکثریت نے محمدؐ کو قومی
و ملکی عصبیت اور تنگ نظری کی بنا پر قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن چونکہ حقیقت پھر

حقیقت ہے انھیں کبھی نہ کبھی دائرۂ اسلام میں داخل ہونا ہی پڑے گا۔ یہ سعادت جناب عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لیے مقدر ہے کہ وہ "میثاق" کو عملی حیثیت دیں۔ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی مقدس جماعت نے اپنے اپنے عہد میں اپنی اپنی قوموں اور جماعتوں کو اس ایک اور صرف ایک "آکر نہ جانے والے" (محمدؐ) کے متعلق بشارتیں سُنا سُنا کر اپنے عہد و میثاق کو جو پورا کرلیا تو یہ اس کی صرف اثباتی شکل تھی۔ میثاق کی عملی حیثیت کا تقاضا تھا کہ خود انبیاء و رسل میں سے بھی کوئی نبی یا رسول اس کا عملی مظاہرہ کرکے دکھلائے تاکہ "خاتم النبیین" جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش کردہ دین حق کی مدد و نصرت کے ارشاد باری لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ کو دنیا عملی شکل میں دیکھ سکے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ خصوصیت حضرت مسیحؑ کے حصہ میں ڈال کر وہ جناب محمد رسول اللہؐ کی بعثت کے لیے تمہید اور براہ راست منّاد و مبشر بنے۔ بنی اسرائیل کو تعلیمِ حق دیتے ہوئے فرمایا:۔

"اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ مُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ" یعنی "میں اللہ کا رسول ہوں تمہاری جانب اور مصدق تصدیق کرنے والا ہوں توراۃ کا جو میرے سامنے ہے اور مبشر (خوشخبری سنانے والا) ہوں یک رسول کا جو آئے گا میرے بعد احمدؐ نام کا (سورۂ صف۔ رکوع ۱)۔ اور قرب یامت میں انبیاء و رسل کے میثاق ازلی کی نمائندگی کے لیے انھیں مامور کیا تاکہ وہ جناب سول اکرمؐ کی نیابت اور امتِ مسلمہ کی امامت کا فریضہ انجام دے کر لتومنن بہ ولتنصرنہ عملی نمونہ پیش کریں۔

اب ذرا کرشمۂ قدرت دیکھیے کہ ازل کے ان مقدرات نے کہ جو ملاء اعلیٰ سے تعلق رکھتے ے کائناتِ ارضی میں کس طرح اپنی بساط بچھائی؟ بنی اسرائیل اپنے جلیل القدر پیغمبر (حضرت مسیحؑ) ے قتل کی سازش مکمل کرچکے ہیں اس کے تکملہ میں بس اتنی دیر ہے کہ محصور مکان کے اندر مس کر انھیں گرفتار کرلیا جائے۔ اس نازک موقع پر قدرت حق نے یہ نہیں کیا کہ ان کو نے کے لیے کرۂ ارض کے کسی دوسرے حصہ میں منتقل کردیا ہو بلکہ ملاء اعلیٰ کی ہجرت کے لیے

ماموں و محفوظ زندہ اٹھالیا اور سازش کرنے والوں کو شک وشبہ کی دلدل میں پھنسا کر خسرالدنیا والآخرۃ کا نشان عطا کر دیا اور پھر ارضی انسان کے ارضی احکام کے لیے وہ وقت مقرر کر دیا جو انبیاء کرامؑ کے عہد و میثاق کی نمائندگی کے لیے موزوں تھا یہی ہے وہ حقیقت جس کو قرآن عزیز نے وَاِنَّہٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَۃِ یعنی کہکر واضح کیا ہے۔

پھر یہ بزرگ و محترم ہستی انبیاء و رسل کی نمائندگی کا حق کس طرح ادا کرے گی کہ جب اس اس کا نزول ہوگا تو اس کرشمۂ قدرت کو دیکھ کر تو وہ جو نبی کریمؐ پر ایمان لا چکے ہیں ان کے قلوب تصدیق قرآن اور تازگیٔ ایمان سے جگمگا اٹھیں گے اور وہ حق الیقین کے درجہ میں یقین کریں گے کہ بلاشبہ راہِ مستقیم صرف "اسلام" ہی ہے عیسائی بھائی بحیثیت قوم اپنے "عقیدۂ تثلیث و کفارہ" پر نادم و شرمسار ہوں گے اور قرآن و محمدؐ پر ایمان لانیکو اپنے لیے راہِ نجات اور سعادت یقین کریں گے اور یہودی حضرات جب "مسیح ہدایت" اور "مسیح ضلالت" (دجال) کے معرکۂ حق و باطل کا مشاہدہ کریں گے تو وہ بھی "دعویٔ قتل و صلیب مسیح" سے تائب ہو کر ایمان لے آئیں گے۔ یہی ہے قرآنِ عزیز کی وہ خبرِ صادق " وَاِنْ مِّنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ اِلَّا لَیُؤْمِنَنَّ بِہٖ قَبْلَ مَوْتِہٖ یعنی اللہ ایسا کرے گا کہ اہلِ کتاب میں سے کوئی نہیں بچے گا کہ جو عیسیٰ علیہ السلام کی موت سے پہلے ایمان نہ لائے اور مسلمان نہ ہو جائے۔ غرضیکہ مسلمانوں میں ایمان کی تازگی و شگفتگی، نصاریٰ و یہود میں تبدیلی عقائد کا حیرت انگیز انقلاب دیکھ کر اب مشرک جماعتوں پر بھی قدرتی اثر پڑے گا اور نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ بھی کلمۂ توحید پڑھ کر ایمان لے آئیں گی اور اس طرح وحیِ ترجمان و حاملِ قرآن جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشادِ گرامی اپنی صداقت کو نمایاں کرے گا۔ " وَیدعوالناس الی الاسلام ویھلک اللہ فی زمانہ الملل کلھا الا الاسلام و یھلک اللہ فی زمانہ الدجال یعنی " اور (قربِ قیامت) لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہو جائیں گے اور اس زمانہ میں تمام اقوام ہلاک ہو جائینگی۔

(یعنی تمام مذاہب دعوتِ اسلام کو قبول کرلیں گے) اور اس زمانہ میں دجّال قتل کیا جائیگا۔

میرے محترم بزرگو اور عزیز بھائیو! عہد و میثاق کی روشنی میں انبیاء کرامؑ اور مقدس رشیوں ومنیوں کی پیشینگوئیوں اور بشارتوں کے اثباتی وعملی دونوں پہلو سامنے موجود ہیں۔ آپ ان بشارتوں پر نہایت سنجیدگی کے ساتھ غور فرمائیں۔ اللہ اور اس کے محبوب برگزیدہ بندوں کے ارشادات کو جھٹلایا نہیں جا سکتا اس لیے جناب محمد رسول اللہؐ کی رسالت پر ایمان لانا ہے اور آپ کے اسوۂ حسنہ کو اپنا کر دینی و دنیوی فیوض و برکات سے مالا مال ہونا ہے۔ اس سلسلہ میں چند جملے اپنے اُن بھائیوں کی خدمت میں بھی عرض کرنا ہیں جو ایمان لا چکے ہیں لیکن عمل کے میدان میں بجائے اسوۂ نبوی جناب رسولِ کریمؐ پر گامزن ہونے کے اپنے نفس کی خواہشات کی پیروی کو مقدم سمجھتے ہیں۔ انھیں اپنی حقیقت پر غور کرنا چاہیے کہ وہ کیا ہیں اور انھیں کیا کرنا ہے۔؟ قرآن حکیم میں نہایت کھلے الفاظ میں بتایا گیا ہے " مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ هُوَ مَوْلٰىكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ۠

یعنی اے مسلمانو! تمہارے مورثِ اعلیٰ ابراہیمؑ (براہم یا برہما) کی یہ ملّت ہے۔ انھوں نے تمہارا نام مسلم رکھا ہے۔ اس سے پہلے بھی ان کے ماننے والوں کا نام مسلم تھا اور جناب محمد رسول اللہؐ کے سامنے اور ان کے بعد بھی ان کا نام مسلم رہے گا تاکہ رسول تمہارے اوپر گواہ بنیں اور تم ساری دنیا پر گواہ بنو لہٰذا تم نماز کی پابندی کرتے رہو اور زکوٰۃ دیتے ہو اور اللہ کی رسّی کو مضبوط پکڑو۔ وہ سب کا کارساز ہے۔ تم سب کا والی وارث، بہترین سرپرست اور مددگار ہے (پارہ رکوع)

یاد رکھیے یہ نسبت ابراہیمی و محمدی جو آپ کو حاصل ہے وہ تمام نسبتوں سے افضل و اعلیٰ ہے خواہ وہ رنگ ونسل سے تعلق رکھتی ہو خواہ ملک و وطن سے یا حسب و نسب سے۔

آپ اس گھرانے کے فرد ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی تعمیر و ترقی اور امن و امان پھیلانے نیز دنیا کو محبت و رحمت سے مالا مال کرنے کے لیے منتخب فرمایا ہے۔ اس ابراہیمی و محمدی برادری اور کنبہ کا جو فرد جہاں کہیں ہے وہ اپنی خصوصیات سے پہچانا جاتا ہے اس کی زندگی کا ایک خاص مقصد ہے اور وہ یہ کہ خود نیک بننا اور دوسروں کو نیک بننے کی دعوت دینا۔ وہ انسانیت کا غمگسار اور دنیا کی بے راہ روی پر ہمیشہ سوگوار رہتا ہے۔ اس کی زندگی کے کچھ مخصوص طور و طریقے ہیں اس کو دنیا اور دنیا کا کوئی معاشرہ ہضم نہیں کر سکتا۔ دعوتِ توحید اس کا مقصدِ زندگی ہے۔ اس کو کوئی غیر دینی ماحول نیز نفسانی و شہوانی ماحول مطمئن کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا کیونکہ اس کا معیار غیر ابراہیمی و محمدی معیاروں سے بالکل جدا اور انوکھا ہے۔ دنیا جس کو ترقی سمجھتی ہے وہ اس کو پستی سمجھتا ہے۔ لوگ دوسروں کی تخریب سے اپنی تعمیر کرتے ہیں، وہ اپنی تخریب سے دوسروں کی تعمیر کرتا ہے۔ دنیا کی نظر انسانوں کی جیب اور پیسے پر ہوتی ہے مگر اس کی نظر انسانوں کے قلوب پر ہوتی ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ غیر ابراہیمی اقوام نے اپنی تجارت کو فروغ دینے اور دنیا کی منڈیوں پر قبضہ جمانے کے لیے ملک گیری کی ہوس کو مذہب کا لبادہ اڑھایا لیکن ملّتِ ابراہیمی نے دعوتِ حق کی خاطر اپنی منڈیاں لٹا دیں۔ غیر ابراہیمی گروہ برسرِ اقتدار آتے ہیں تو اپنی اور اپنے اعزہ کی تن پروری کی فکر کرتے ہیں لیکن اُمتِ محمدی کے لوگ جب زمین کے کسی چپّے پر قابض ہو جاتے ہیں تو پہلا کام اقام الصلوٰۃ یعنی نماز قائم کرتے ہیں پھر زکوٰۃ کا بندوبست کرتے ہیں۔ تاکہ غریب خلق اللہ کو آرام پہنچے اور امن و امان قائم رکھنے کے لیے اوامر و نواہی کی تلقین کرتے ہیں۔ یہ ہے اسوۂ ابراہیمی جس کی اتباع کا حکم اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے حبیب جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا اور ان کے ذریعہ ہم سب کو دیا۔

ہماری ملّی تاریخ کا یہ سانحہ ہے اور افسوسناک سانحہ کہ امتِ محمدی کے پیرو مغربی چمک دمک دیکھ کر اپنی امتیازی حالت کو بھول گئے۔

جاننے والے تو اس حقیقت سے پہلے بھی باخبر تھے اور اب تو ہر ایک کو نظر آرہا
ہے کہ یہ چمک دمک عارضی تھی۔ مغربی تہذیب روبہ زوال ہے بلکہ عالم سکرات میں ہے جو
ن بھی گزر رہا ہے۔ اس کو قبر سے قریب کر رہا ہے۔ یہ آوارہ گرد نوجوان لڑکے اور
یکیاں دراصل بخار سے تپتے ہوئے جسم کی پھپکے ہیں جو تہذیب کے جسم پر ابھر آئے ہیں۔
بِ نظر اس کے انجام سے باخبر ہیں۔ اب ضرورت ہے دعوتِ توحید و رسالت کو تیز سے
زتر کرنے کی اگر ملتِ ابراہیمی من حیث الجماعت باعمل جماعت بنجائے اور جناب محمد رسول اللہ
الله علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کو اپنائے تو دنیا اس کے عملی نمونہ کو دیکھ کر اپنا سدھار کر سکتی
ہے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید المرسلین۔

رشوت، معاشرۂ انسانی کا گھن

(ایک علمی تجزیہ)

جناب حافظ محمد نعیم صاحب ندوی صدیقی ایم، اے

تمہید دنیا کی پوری تاریخ عظیم ترقی یافتہ اقوام کی عبرت انگیز داستان سے لبریز ہے وہ قومیں جنھوں نے اس رُبعِ مسکوں پر ایک عرصۂ دراز تک اپنی قوت وشوکت اور سطوت وہیبت کے عَلَم لہرائے، علوم وفنون کے دریا بہائے، محیر العقول قلعے اور باغات تعمیر کیے اور یم ہستی میں طوفان برپا کردیے تھے۔ لیکن پھر وہ حرفِ غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے یوں نیست ونابود ہوگئیں کہ اب ان کا نام ونشان محض "اساطیر الاولین" کی حد تک ہی ملتا ہے۔

گزشتہ اقوامِ عالم کے زوال وادبار اور نکبت وبربادی کے اسباب وعلل کا غائرانہ مطالعہ وتجزیہ کیا جائے تو ہر بحث ورائے اسی ایک مرکزی نقطہ کے محور پر گردش کرتی نظر آئے گی کہ امم ماضیہ صرف اس وجہ سے قہرِ خداوندی کی سزاوار ہوئیں کہ وہ آسمانی ہدایت کو فراموش کرکے اپنے نفس وشہوت کے جال میں اسیر ہوگئی تھیں۔ آج ملکوں اور قوموں کا جو نقشہ ہے بلاشبہ وہی عہدِ رفتہ میں ان قوموں کا تھا جو عروج واقبال اور شان وشوکت میں اپنا ثانی نہ رکھتی تھیں۔ مثال کے طور پر صرف اسرائیلیوں، کلدانیوں، مصریوں، رومنوں، یونانیوں، علویوں، عباسیوں، سلجوقیوں، تاتاریوں، بغدادیوں، غرناطیوں اور قرطبیوں کے نام ذکر کردینا کافی ہے۔

تاریخ کی اس عبرت انگیز شہادت کے باوجود قلم کا سینہ شق ہوتا ہے اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے کہ آج دنیا کی تمام قومیں علی الخصوص اسلامیانِ عالم کریکٹر و اخلاق کی پستی اور بغض وعناد، نفرت وحقارت، بے رحمی وبے ایمانی اور شقاوت و بربریت جیسی آدم خور برائیوں کے سمندر میں غرق ہیں۔ اور انھیں اس کا احساس تک نہیں ہے۔ یاد رکھیے بدکردار، بدراہ اور بداخلاق اقوام کے لیے خدا کا قانون اٹل ہے۔ اگر مسلمانوں نے خاص طور پر اپنے باہمی افتراق وتشتت کو دور نہ کیا۔ کردار واخلاق میں بلندی نہ پیدا کی اور مذہب کے خودساختہ غلط تصورات وخیالات، گروہ بندیوں اور فرقہ بندیوں کی لعنت سے نجات نہ حاصل کی تو وہ بھی اقوامِ ماضیہ کی طرح خاک میں مل کر نسیاً منسیاً ہو جائینگی۔

آج ہر طرف افراتفری، لوٹ کھسوٹ، بددیانتی، رشوت خوری، مکر وفریب، سودی داد وستد، جھوٹ اور ظلم وجور کا بازار گرم ہے۔ ہندو ہوں یا مسلمان، سکھ ہوں یا عیسائی سب ہی اس حمام میں عریاں نظر آتے ہیں۔ ان کے اخلاق وکردار کی پستی کا یہ عالم ہے کہ اپنے پڑوس میں نادار ومفلس اور بیوہ ویتیم کی آہ وفغاں سنتے ہیں۔ لیکن وہ اپنے عشرت کدوں سے نکل کر ان کی حاجت روائی نہیں کرسکتے۔ بغیر سود در سود کے ان کو قرض نہیں دے سکتے، اور رشوت لیے بغیر ان کے کام نہیں کرسکتے۔ آج کچھ ایسا محسوس ہونے لگا ہے کہ دنیا رجعتِ قہقری کرکے چھٹی صدی عیسوی کے اس عہدِ مُظلِمہ میں پہونچ چکی ہے جب ظلمات کی تمام قہرمانی بلائیں انسانی قلوب کو ناگن کی طرح ڈستی چلی جارہی تھیں اور انسانیت تباہی وہلاکت کے دروازوں پر دستک دے رہی تھی۔ لیکن اللہ جل شانہٗ کے عفو ومغفرت کے سمندر میں موجیں پیدا ہوئیں اور اس نے عرب کے ریگ زار میں اپنی رحمت کے سوتے کھول دیئے تھے یعنی نبی عربی (فداہ ابی وامی) کی بعثت نے تو برتو تاریکیوں کو یکسر چھانٹ کر رکھ دیا تھا۔

خدا وندِ قدوس نے جو ضابطۂ حیات دے کر سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو

اس گم کردہ راہ دنیا کی رہنمائی کے لیے مبعوث فرمایا تھا۔ وہ بلا شبہ ہر گوشے سے کامل اور جامع تھا۔ زمانہ بدلتا رہا، انقلابات رونما ہوتے رہے۔ لیکن یہ قانون ابدی ہر عصر و عہد کے عقدہ ہائے مشکل کی گرہ کشائی کرتا رہا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عمر بھر اسی نظام حیات کو عام کرنے کے لیے جد و جہد کرتے رہے اور آپؐ نے اپنی بار آور مساعی کے ذریعے پورے کرۂ ارض سے برائیوں کی جڑ کاٹ کر اسے امن و آشتی کا گہوارہ بنا دیا تھا۔ شرک و کفر کی بدلیاں چھٹ کر رہ گئیں۔ اسلام کے دیئے ہوئے نظامِ زندگی کو اپنا کر اس وقت ایک ایسا صالح اور صحت مند معاشرہ تیار ہو گیا تھا جو رہتی دنیا تک لائق تقلید اور نمونہ عمل ہے۔

تاریخ شاہد عدل ہے کہ امت مسلمہ جب تک اسلامی تعلیمات کی صحیح تصویر تھی اور جب تک اس کے اعمال میں پاکیزگی اور دل میں ایمان کی روشنی اور تڑپ تھی، حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کی پابند، دیانت و امانت اور صداقت و عفت کی علمبردار، رحم و مروت اور جذبہ مساوات و خدمت خلق سے سرشار تھی وہ صدیوں تک اپنی سیادت و قیادت کے ذریعہ دیگر اقوام پر فائق اور ممتاز رہی۔ اور اس کی شجاعت و دلیری کے چرچے قیصر و کسریٰ کے بلند رفعت ایوانوں کو لرزہ براندام کر دیتے تھے۔ ان کے اعمالِ حسنہ اور اوصافِ حمیدہ دشمنوں کے دلوں کو بھی فتح کر لیتے تھے یہی وجہ ہے کہ عہدِ فاروقی میں فتح حمص کے تقریباً ۲ ماہ بعد جب اسلامی افواج وہاں سے واپس ہونے لگیں تو مقامی عیسائی اور یہودی دھاڑیں مار مار کر رونے اور عاجزانہ التجا کرنے لگے کہ "خدا کے واسطے ہمیں ظالم رومنوں کے پنجوں میں نہ چھوڑیئے۔" (حالانکہ رومی ان ہی کے ہم مذہب تھے)

لیکن مرورِ ایام کے ساتھ جوں جوں قرآنی تعلیمات اور رسولؐ کے اسوۂ حسنہ سے بُعد بڑھتا گیا؛ دوسری قوموں کے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے نفرت و حقارت کے جذبات ابھرنے لگے یہاں تک کہ اب بعض ممالک میں غیر مسلموں کو مسلمانوں کا وجود بھی گوارا نہیں رہ گیا ہے۔ یہ کوئی مقامِ استعجاب و تحیّر نہیں ہے بلکہ منشائے خداوندی کے عین مطابق ہے

ایمان و ایقان کا علم سربلند کرنے والے جب فعرادبار و مذلّت میں گرنے لگتے ہیں تو اللہ جل شانہٗ دوسری اقوام کو بطور عذاب ان پر مسلط و مقرر فرمادیتے ہیں تاکہ وہ ان کے شکنجے میں کسنے کے بعد از سرنو اپنے ایمان کا محاسبہ کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ملّتِ مسلمہ کے اس ضعف و ذہن کا ایک بڑا سبب مغربی تہذیب و تمدن کی اندھی تقلید بھی ہے۔ اس کے ظاہری رنگ و روغن اور چمک دمک کو دیکھ کر لوگوں کے دلوں میں بجائے عقلی و نقلی دلائل کے یورپ کا طرزِ عمل ہی ہر رائے کے خطا و صواب اور ہر عمل کے خیر و شر ہونے کا معیار قرار پاگیا۔ پوری مسلم قوم اپنے مخصوص تہذیب و تمدّن سے دامن چھڑا کر مغرب سے آنے والے سیلاب بلا خیز کی لہروں میں بہہ گئی۔ وہ تمام مفاسد اور برائیاں جن کی بنا پر یورپ اخلاقی جذام میں مبتلا تھا یہاں بھی در آئیں۔ مثال کے طور پر رشوت ہے۔ یہ درحقیقت معاشرۂ انسانی کا ایک ایسا گھن ہے جو اندر رہی اندر اسے تباہ کرتا جارہا ہے۔ یہ معیشت کا ایک ایسا کیڑا ہے جس نے سماج کو کھوکھلا کرکے رکھدیا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

یاتی علی الناس زمان لایبالی المرء ما خذ امن الحلال ام من الحرام۔	لوگوں پر ایک ایسا زمانہ بھی آئے گا کہ آدمی پرواہ ہی نہ کرے گا کہ وہ کیا لے رہا ہے، حلال سے یا حرام سے۔

آج وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عرب کے اس صاحبِ بصیرت انسان کی اس پیشینگوئی کے مظاہر کن کن نت نئے عنوانات کے ساتھ سامنے آتے جارہے ہیں۔ آج قوم کا ہر فرد شب و روز ...ی کی طرح کسبِ زر کے لیے کوشاں ہے۔ وہ ہمہ وقت صرف اسی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتا ہے کہ کس طرح بیش از بیش مال اسے حاصل ہو جائے اور کبھی بھول کر بھی یہ خیال اس کے ہاں خانۂ دماغ میں نہیں آتا کہ حصولِ مال کا یہ طریقہ شریعت کے مطابق ہے بھی یا نہیں۔ جائز ہے یا ناجائز، مناسب ہے یا نامناسب، حرام ہے یا حلال؟ —— اب تو نوبت یہاں

تک پہنچ گئی ہے کہ عام طور پر لوگ ہر اس چیز کو جائز اور حلال تصوّر کرتے ہیں جو ان کے تعیش اور حظِ نفس کا ذریعہ بن جائے۔

صرف یہی وجہ ہے کہ انسانی زندگی میں آج حرص و آز کی کثرت ہوگئی ہے۔ نتیجۃً دولت سے برکت یکسر ختم ہو کر رہ گئی ہے جس راہ سے مال کی ریل پیل ہوتی ہے۔ دیکھتے دیکھتے وہ اسی راہ سے رخصت ہو جاتا ہے۔ چنانچہ رات کے کروڑ پتی کے صبح کو دیوالیہ ہو جانے کی مثالیں اوراق ہستی پر بکھری ہوئی بکثرت مل سکتی ہیں۔ حضور اکرم کا ارشاد ہے۔

"جو شخص حرام کا مال کھاتا ہے۔ اس میں برکت نہیں دی جاتی۔ اور اس کا صدقہ قبول نہیں کیا جاتا اور جو کچھ وہ پیچھے چھوڑ جاتا ہے وہ اس کے لیے دوزخ کا ایندھن بنا دیا جاتا ہے۔"

شرعی حیثیت سے تو رشوت کی حرمت قطعی ہے ہی، خود عقل و اخلاق کی رُو سے بھی یہ سماج و معاشرہ کے خلاف غدّاری کے مرادف ہے۔ کسی قوم کی عمارت اسی وقت مستحکم ہو سکتی ہے۔ جب اس کے بنیادی عناصر میں باہمی ہمدردی، تعاون و تکافل اور موانست و اخوت کا دور دورہ ہو اور رشوت اس میں ایک ناقابل تلافی شگاف پیدا کر دیتی ہے۔ گو کہ رشوت کا وجود کسی نہ کسی شکل میں ہر عہد میں رہا لیکن اس کا جتنا عموم آج ہوگیا ہے۔ اغلباً تاریخ کے کسی دور میں نہ رہا ہوگا۔

اس طویل تمہید کے بعد اب ذیل میں ہم کتاب و سنت اور عقل و اخلاق کی روشنی میں رشوت کے حرام، ناجائز اور نامناسب ہونے کو شرح و بسط کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ شاید کہ اس کا مطالعہ کسی ایک فرد کی بھی بگڑی زندگی کا اہم موڑ بن جائے۔

رشوت کی تعریف: رشوت ہر اُس معاوضہ کو کہتے ہیں جو کسی فرضِ منصبی کی ادائیگی، واجب کام کی انجام دہی اور ناحق و ناانجام کرنے کے لیے نقد رقم یا کسی دوسری چیز کی شکل میں وصول کیا جاتا ہے۔ علّامہ سیّد سلیمان ندوی رشوت کی تعریف کرتے ہوئے

مجمع البحار کے حوالے سے لکھتے ہیں[۱]

" رشوت کے معنی یہ ہیں کہ کوئی اپنی باطل غرض اور ناحق مطالبہ
کے پورا کرنے کے لیے کسی ذی اختیار یا کارپرداز شخص کو کچھ دے کر اپنے
اپنے موافق کرلے "

ناجائز معاوضہ | کسی فرض منصبی کی ادائیگی میں ناجائز معاوضہ لینے کی مختلف صورتیں ہیں۔ (۱) کسی بل یا چیک متعلقہ حاکم سے منظور کرانے کے لیے کسی شخص کو تعویق میں ڈالے رکھنا۔ حتیٰ کے مبتلیٰ بہ شخص اس کلرک کو کچھ " حق " ادا کرے اور پھر فوراً اس کا کام ہو جائے۔

(۲) کسی کی سفارش یا " کچھ " دینے کی وجہ سے اصلی حق دار کو محروم کر کے غیر مستحق کے حق میں فیصلہ کر دینا۔

(۳) کسی منصبی فرض کو انجام دینے کے لیے کچھ اپنا " حق الخدمت " وصول کرنا اور اس کے نہ ملنے کی صورت میں مبتلیٰ بہ کو پریشان کرنا، ڈرانا اور دھمکانا وغیرہ۔

مذکورہ بالا ان تینوں صورتوں کے علاوہ اور بھی متعدد صورتیں ایسی ہیں جن میں لیا گیا معاوضہ قطعی ناجائز اور ناحق ہوتا ہے، کسی مظلوم، آفت رسیدہ پریشان حال اور حاجت مند کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا یوں قانونِ اخلاق کی رو سے قطعی غیر انسانی حرکت ہے اور پھر جب اس پر قرآن و حدیث دونوں نے سخت نکیر فرمائی ہو تو اس کی حرمت اور شناعت مزید مسلم ہو جاتی ہے۔

تحریم رشوت، قرآن کی روشنی میں | خداوند قدوس نے اپنی مخلوق کے لیے ایک نہایت صالح اور صحتمند معاشرہ تجویز کیا ہے۔ جس میں ملّت کا ہر فرد ایک دوسرے کا مونس و غمخوار اور ہمدرد ہو۔ ایک کی ذرّہ برابر تکلیف دوسرے کا شب و روز کا چین اڑا دے۔ اور ایک کی خوشی دوسرے کے لیے شادیانہ مسرت ثابت ہو۔ جہاں یہ اسپرٹ مجروح

اور یہ جذبہ مضمحل ہوگا وہیں سے قوم کی عمارت متزلزل ہو جائے گی۔

چنانچہ اللہ جل شانہ نے انسان کو رزق حلال کمانے کا حکم دیا تاکہ ہر شخص کسب مال میں اور معاش میں ساعی رہے۔ اور کسی کے حاشیہ خیال میں کبھی یہ بات نہ آسکے کہ وہ دوسرے کے مال کو ناجائز طریقہ سے حاصل کرے اور اس طرح سے جو رزق حاصل ہوگا وہ حلال اور طیب ہوگا اور اس سے نشو و نما پایا ہوا جسم انسانی کامل طور پر طاہر ہوگا۔

چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے ۱۲؎

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ۝

اے ایمان والو! کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو روزی دی ہم نے تم کو اور شکر کرو اللہ کا اگر تم اس کے بندے ہو۔

دوسری جگہ فرمایا ۱۳؎۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ۔

اے لوگو زمین کی چیزوں میں سے حلال پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور شیطان کی اتباع نہ کرو کیونکہ بلا شبہ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔

اسی طرح سورۂ اعراف میں حرام و حلال کی ایک جامع فہرست بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کے درمیان گویا خط فاصل کھینچ دیا ہے۔ فرمایا ۱۴؎:

قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْإِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَأَن تُشْرِكُوا بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ عَلَيْكُمْ سُلْطَانًا وَأَن تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝

آپ کہہ دیجئے میرے رب نے حرام کیا ہے۔ صرف بے حیائی کی باتوں کو جو ان میں کھلی ہوئی ہیں اور جو چھپی ہوئی ہیں اور گناہ کو اور ناحق کی زیادتی کو اور اس بات کو کہ شریک کرو اللہ کا ایسی چیز کو جس کی سند اس نے نہیں اتاری اور اس بات کو کہ لگاؤ اللہ کے ذمے وہ باتیں جو تم کو معلوم نہیں۔

آیت مذکورہ بالا کا ہر لفظ درحقیقت اپنے اندر تفصیلات کا ایک دفتر نہاں رکھتا ہے "الفواحش" میں تمام علانیہ وخفیہ کام اور ان پر اکسانے والی چیزیں آجاتی ہیں۔ "الاثم" میں ہر قسم کے صغائر وکبائر داخل ہیں خواہ ان کا تعلق ظاہر سے ہو یا باطن سے "البغی" سے حیوانی رذیل خصائل مراد ہیں "بغیر الحقّ" میں ظلم کی حد تک پہونچی ہوئی زیادتیاں شامل ہیں وغیرہ وغیرہ۔

اب یہ امر متعین ہو گیا کہ غیر کے مال کو کسی ناجائز طریقہ سے حاصل کرنا درحقیقت باطل اور حرام مال لینا ہے قرآن نے ناجائز طریق سے حاصل کردہ مال (جس میں رشوت بھی شامل ہے) کے بیان میں کسی ابہام سے کام لیے بغیر بہت صراحت اختیار کی ہے۔ علاوہ ازیں رشوت کی حرمت کو مستقل طور سے بھی واضح کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:[۵۵]

وَلَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝	اور ایک دوسرے کا مال آپس میں ناحق مت کھاؤ اور نہ پہونچاؤ ان کو حاکموں تک۔ تاکہ کھا جاؤ کوئی حصہ لوگوں کے مال سے ظلم کرکے (ناحق) اور تم جان رہے ہو۔

آیت بالا میں "الاکل" درحقیقت "الاخذ" کے معنی میں مستعمل ہوا ہے یعنی مال کو ناجائز طریقہ سے لینا۔ اور کسی طرح بھی اپنے تصرف میں لے آنا۔ یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اگر اس مال کو کھایا نہ جائے، بلکہ کسی اور مصرف میں استعمال کر لیا جائے تو وہ جائز ہو جائے گا۔ کیونکہ عمومی طور پر مال کے حصول کا مقصد کنبہ پروری ہوتا ہے۔ اس لیے قرآن نے "الاکل" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جمیع مفسرین نے اس کو "الاخذ" ہی کے معنی پر محمول کیا ہے:

چنانچہ علامہ آلوسی آیت زیر نظر کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ[۵۶]

المراد من الاكل ما يعم الاخذ والاستيلاء	اکل سے مراد اخذ اور تسلط ہے

علامہ رشید رضا مصری رقمطراز ہیں؎۵۴

المراد بالاکل مطلق الاخذ والتعبیر من الاخذ بالاکل معروف فی اللغۃ تجوزوا فیہ قبل نزول القرآن۔

اکل سے مطلقاً اخذ مراد ہے اور یہ چیز لغت میں معروف عام ہے۔ اہل زبان نزول قرآن سے قبل بھی اسی طرح استعمال کرتے تھے۔

عصر حاضر کے باکمال مفسر اور صاحب اسلوب ادیب مولانا عبدالماجد دریابادی آیت زیر بحث کی تشریح و تفسیر کرتے ہوئے خامہ ریز ہیں؎۵۵۔

"اکل یہاں لفظی معنی میں نہیں۔ یعنی صرف "کھانا" مراد نہیں بلکہ کسی طرح بھی اپنے تصرف میں لے آنا ہے۔ اردو میں محاورہ بھی ایسے موقع پر بولتے ہیں کہ فلاں صاحب روپیہ کھا گئے یا روپیہ ہضم کر گئے اور بالباطل ہرنا جائز طریق مراد ہے.... وہ مال (حلال) بھی باطل ہی کے حکم میں آتا ہے جو اس کے مالک سے اس کی خوش دلی کے بغیر حاصل کیا جائے گو مالک اسے خوشی سے بھی دے رہا ہو۔ لیکن شریعت نے اس مد کو ناجائز قرار دیا ہو۔"

آیت میں اموالکم کا لفظ قرآن کی بلاغت کا ایک شاہکار نمونہ ہے۔ حکم فرمایا کہ "اپنا مال نہ کھاؤ"، رشوت لینے والا بظاہر دوسرے کا مال حاصل کرتا ہے۔ لیکن درحقیقت وہ اپنے ہی مال کو نامناسب طریقے سے غصب کرتا ہے۔ کیونکہ "انما المومنون اخوۃ" کے اصول کے تحت ملّت کے تمام افراد ایک ہی برادری سے متعلق ہیں۔ ان میں باہم اس طور پر اسلامی اخوت پائی جاتی ہے کہ ایک انسان کی کوئی چیز درحقیقت پوری قوم کی ملکیت ہے۔ اس کی مثالیں قرآن میں دوسرے مقامات پر

بھی ملتی ہیں۔ جیسے لَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ، لَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ یعنی کسی بھی فرد کی جان، مال، اور آبرو کا احترام اور حفاظت اصل میں اپنی مال، جان اور آبرو کا احترام اور حفاظت ہے۔

اور " باطل" کا مطلب یہ ہے کہ اس مال کے مقابل میں کوئی حقیقی شے نہ ہو جسے اس مال کا معاوضہ قرار دیا جا سکے۔ مثال کے طور پر ایک پیشکار کا یہ فرض منصبی ہے کہ وہ عوام کی شکایات اور درخواستوں کو حاکم کے روبرو پیش کرے اب اگر وہ کسی شخص سے درخواست پیش کرنے کا کچھ " حق الخدمت " لیتا ہے تو یہ رشوت ہے اور قطعی ناجائز اور حرام۔ کیونکہ درخواست پیش کر کے تو اس نے اپنا فرض منصبی انجام دے دیا جس کی تنخواہ وہ حکومت یا متعلقہ محکمہ سے ماہ بماہ وصول کرتا ہے۔ اب یہ " حق الخدمت " کے نام سے جو معاوضہ ہے اس کے مقابل میں کوئی بھی چیز باقی نہیں رہتی۔ لہذا اس کے جواز کا کوئی سوال نہیں۔

علامہ رشید رضا مصری لکھتے ہیں[59]:-

ما الباطل فھو ما لم یکن فی مقابلة شئ حقیقی ..... فقد حرمت الشریعة اخذ المال بدون مقابلة حقیقة

باطل کا مطلب یہ ہے کہ اس کے مقابل میں کوئی حقیقی چیز نہ ہو.... لہذا شریعت نے بغیر حقیقی شے کے مقابل مال لینے کو حرام قرار دیا ہے۔

مفسر ابو حیان اندلسی نے لکھا ہے کہ بالباطل سے مراد یہ ہے کہ اموال کو ایسے طریق سے لیا جائے جو مشروع نہیں ہے۔ رقمطراز ہیں[60]:-

یدخل فی ذلك الغصب والنھب القمار وحلوان الکاھن والخیانة والرشاء وما یأخذہ المنجمون وکل ما لم یأذن فی اخذہ المشروع۔

چنانچہ اس میں لوٹ کھسوٹ، جوا، کاہن کی رشوت خیانت، رشوت اور جو نجومی لیتے ہیں اور ہر وہ چیز شامل ہے جس کے لینے کی شریعت نے اجازت نہیں دی۔

اور تفسیر خازن کے مطابق ظلم کرنا، چوری کرنا، ڈاکہ ڈالنا، رہزنی کرنا، جوا کھیلنا، گانے بجانے کو ذریعۂ روزگار بنانا۔ لہو و لعب کے کھیل دکھا کر روزی کمانا، رشوت لینا، جھوٹی گواہی دینا، جعلی دستاویزات تیار کرنا، دروغ حلفی کرنا، حاکموں کو نذر نذرانے اور ہدیے و تحفے پہونچانا، ان کی دعوتیں کرنا اور امانت میں خیانت کرنا (خواہ مسلم سے یا غیر مسلم سے) یہ سب چیزیں ناجائز طریق (باالباطل) کی تعریف میں داخل ہیں [۱۱]:۔

یہاں تک کی گفتگو آیت کریمہ کے پہلے جزو یعنی ناجائز طریق سے مال حاصل کرنے کے بارے میں تھی۔ جس میں دوسری صورتوں کے ساتھ رشوت بھی داخل ہے۔ جیسا کہ مذکورہ بالا تصریحات سے ظاہر ہوا۔ اس کے بعد آیت کا دوسرا جزو رشوت کی حرمت کے سلسلہ میں بہت صریح ہے فرمایا گیا:

وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝	اور تم حکام کے پاس رشوت نہ پہونچاؤ تاکہ تم لوگوں کا مال ناحق کھا جاؤ۔ درآنحالیکہ تمھیں علم ہو۔

آج کچہریوں، دفتروں، پرائیویٹ اداروں، سرکاری محکموں یہاں تک کہ تعلیمی اداروں میں اس رشوت کی جو بہتات ہے وہ اہل نظر و خرد سے مخفی نہیں۔ علامہ آلوسی آیت کریمہ کے اس جزو کی نسبت رقمطراز ہیں کہ [۱۲]:۔

لَا تُلْقُوْا بَعْضَهَا اِلَى حُكَّامِ السُّوْءِ على وجه الرشوة۔	کچھ مال بڑے حکام کو رشوت کے طور پر نہ دو۔

عربی میں ادلاء کے معنی پانی نکالنے یا کسی اور غرض کے لیے کنویں میں ڈول ڈالنے کے ہیں اسی سے استعارۃً مقصود حقیقی یا کسی شے تک پہنچنے کے معنی میں لے لیا گیا۔

چنانچہ لغات القرآن میں ہے [۱۳]:۔

"تدلوا" ادلاء سے ہے۔ جس کے معنی ڈول نکالنے کے ہیں۔ اسی اعتبار

سے بطور استعارہ کسی چیز تک پہونچنے اور کسی شے کے ڈالنے کے لیے استعمال ہوتا ہے"

حافظ ابن جریر طبری رقمطراز ہیں ؎۱:۔

اصل الادلاء ارسال الرجل الدلو فی سبب متعلقاً به فی البئر	ادلاء کی اصل کسی شخص کا کنوئیں میں کسی غرض کے لیے ڈول ڈالنا ہے۔

اور علامہ آلوسی لکھتے ہیں ؎۱:۔

الادلاء فی الاصل ارسال الحبل فی البئر ثم استعیر للتوصل الی الشئی	اصل میں ادلاء کے معنی کنوئیں میں رسی ڈالنے کے ہیں پھر کسی شے تک پہونچنے کے معنی میں اس لفظ کو مستعار لے لیا گیا۔

رشوت کو "ادلار دلو" سے تشبیہ دینے کی دو وجہیں ہیں ۔ امام فخرالدین رازی اس کی توضیح کرتے ہوئے اپنی شہرہ آفاق تفسیر میں لکھتے ہیں ؎۱:

" (۱) بلاشبہ رشوت ضرورت کی رسّی ہے ۔ پس جس طرح پانی سے بھرا ہوا ڈول رسّی کے ذریعہ دور سے قریب کھینچ لیا جاتا ہے ۔ اسی طرح مقصد بعید کا حصول بھی رشوت کے ذریعہ قریب ہو جاتا ہے "

(۲) جس طرح حاکم کو رشوت دے کر بغیر کسی تاخیر کے فوراً موافق فیصلہ کرالیا جاتا ہے اسی طرح ڈول بھی جب پانی نکالنے کے لیے کنوئیں میں ڈالا جاتا ہے تو غایت درجہ تیزی سے چلا جاتا ہے "

ابو حیان اندلسی تدلوا بہا الی الحکام کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؎۱:۔

معناہ لا ترشوا باموال الحکام لیقضوا لکم باکثر منہا	اس کے معنی یہ ہیں کہ حکام کو مال کی رشوت نہ دو تاکہ وہ تمہارے موافق فیصلہ کر دیں۔

ابنِ عطیہ نے ابو حیان کے مذکورہ بالا قول کو راجح قرار دیتے ہوئے لکھا ہے [۱۸]:-

لان الحاکم مظنۃ الرشاء الا من عصم وھو الاقل	اس لیے کہ حاکم ہی زیادہ رشوت لیتے ہیں الا یہ کہ کوئی مامون رہے مگر ایسے حاکم خال خال ہی مل سکیں گے۔

تفسیر مدارک میں ہے [۱۹]:-

وتدلوا بھا ای وتلقوا بعضھا الی حکام السوء علی وجہ الرشوۃ یقال ادلی دلوہ ای القاہ فی البئر للاستقاء	وتدلوا بھا یعنی برے حکام کو مال رشوت کے طور پر مت دو۔ کہا جاتا ہے کہ ادلیٰ دلوہ یعنی اس نے کنویں سے پانی نکالنے کے لیے اس میں ڈول ڈال دیا۔

متذکرۃ الصدر تفصیلات سے معلوم ہوا کہ جمیع مفسرین نے اس آیت کریمہ کو تحریم رشوت کے باب میں صریح قرار دیا ہے۔ کیونکہ جب ناجائز طریق سے مال کے حصول میں رشوت کا تعین ہو جاتا ہے تو پھر "لا تاکلوا" سے اس کی حرمت پر مہر قطعی ثبت ہو جاتی ہے۔

احادیث کی روشنی میں | رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی کا مقصد اولین اور مشن ہی یہ تھا کہ اس کرۂ ارضی پر خدائے وحدہٗ لاشریک کا اطاعت گزار ایک ایسا معاشرہ وجود میں آجائے جو ہر گوشہ اور ہر حیثیت سے اس طرح مکمل ہو کہ آنے والی نسلیں اسے نمونۂ عمل اور دلیل راہ بنائیں۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ آپ کی بار آور مساعی کے ثمرہ میں قرونِ اولیٰ کے بے نظیر معاشرہ کی مثال سے پوری تاریخ انسانی خالی ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سماج اور سوسائٹی سے تمام برائیوں کی جڑ کاٹتے ہوئے رشوت پر بھی شدید نکیر فرمائی ہے۔ چنانچہ تحریم رشوت کے سلسلہ کی بنیادی حدیث جس میں رشوت لینے اور دینے والوں کا ٹھکانا دوزخ قرار دیا گیا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ

الراشی والمرتشی کلاھما فی النار [20]

رشوت لینے اور دینے والے دونوں کا ٹھکانا جہنم ہے۔

اس حدیث کے متعلق امام ترمذی رقمطراز ہیں :۔

حدیث ابی سلمۃ عن عبد اللہ بن عمرو عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احسن شیٔ فی ھذا الباب [21]

ابو سلمہ کی حدیث جو انھوں نے عبد اللہ بن عمرو سے روایت کی ہے اور انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ اس باب میں سب سے بہتر اور سب سے زیادہ صحیح ہے۔

اس کے علاوہ اور بھی بہت سی حدیثوں میں رشوت پر شدید ترین نکیر فرمائی گئی ہے۔ چند درج ذیل ہیں :۔

عن عبد اللہ بن عمرو قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لعنۃ اللہ علی الراشی والمرتشی [22]

عبد اللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ رشوت لینے اور دینے والے پر خدا کی لعنت ہوتی ہے۔

عن عبد الرحمٰن بن عوف قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لعن اللہ الآکل والمطعم الرشوۃ [23]

حضرت عبد الرحمٰن بن عوف سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ نے رشوت کھانے اور کھلانے (لینے اور دینے) والے پر لعنت کی ہے

عن عبد اللہ بن عمرو قال لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الراشی والمرتشی [24]

عبد اللہ بن عمرو سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت لینے اور دینے والے پر لعنت کی ہے۔

اور نہ صرف رشوت لینے اور دینے والوں پر لعنت کی گئی ہے بلکہ وہ شخص جو ان دونوں کے درمیان معاملت اور دلالی کا کام انجام دیتا ہے وہ بھی اسی سزا کا مستوجب اور مستحق قرار دیا گیا ہے۔

چنانچہ فرمایا گیا:۔

عن ثوبان قال لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الراشی والمرتشی والرائش الذی یمشی ۔ ۲۵	حضرت ثوبان سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت لینے دینے والوں اور وہ شخص جو ان دونوں کے درمیان دلالی کرے ان سب پر لعنت کی ہے ۔

رشوت اور حکام | قرآن پاک کی جو آیت شروع میں گذری ہے اس میں تحریم رشوت کے ساتھ حکام کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے ۔کیونکہ معاشرہ میں سب سے زیادہ وہی ملوث ہوتے ہیں ۔ آج بھی عدالتوں میں ، کچہریوں میں ، سرکاری اور نیم سرکاری دفتروں میں اور نجی تجارتی اداروں میں غرض ہر جگہ رشوت کی گرم بازاری اور نت نئی شکلوں میں اس کا عمل دخل ملتا ہے کہیں بواسطہ اور کہیں بلاواسطہ ۔کہیں نقد اور کہیں دوسرے ناجائز مفاد کی شکل میں ۔

دراں حالیکہ ہر محکمہ کا ذمہ دار درحقیقت عوام اور رعایا کے حقوق کا محافظ اور اپنے شعبہ کا امین ہوتا ہے ۔ اگر وہ اپنے اس فرض میں کوتاہی اور خیانت کا ارتکاب کرتا ہے تو وہ درحقیقت حدود اللہ کے توڑنے کے ساتھ حکومت کی عمارت میں شگاف ڈالنے کا مرتکب ہوتا ہے جس کی سزا نہایت دردناک ہے ۔

تحفہ اور حکام | حکام کے لیے رشوت کے حرام ہونے کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ہدیہ اور تحفہ جو از دیاد تعلق و محبت کی علامت ہے ۔ اور جس کا حکم خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے " تہادوا تحابوا " کے واضح الفاظ کے ساتھ فرمایا ہے ۔لیکن حکام کے لیے تحفہ قبول کرنے کی ممانعت کی گئی ہے کہ وہ بھی رشوت میں داخل ہے ۔ فرمایا:

ھدایا العمال حرام علیھا ۲۶	حکومت کے کار پردازوں کے لیے ھدیہ قبول کرنا یکسر حرام ہے ۔

اور

اخذ الامیر الھدیۃ کفر وقبول القاضی الرشوۃ کفر[۲۷]	امیر کا ہدیہ لینا اور قاضی کا رشوت قبول کرنا دونوں کفر کی طرح ہیں ۔

اور

ھدایا السلطان سحت وغلول[۲۸]	سلطان کو ہدیوں کا لینا خیانت اور حرام ہے ۔

اور

الھدایا للامراء غلول[۲۹]	امراء کے لیے ہدایا لینا خیانت ہے ۔

ہاں چند شرائط کے ساتھ حکام اور دوسرے ذمہ دار لوگوں کو تحفہ دینا اور ان لوگوں کا اس کو قبول کر لینا جائز ہے:[۳۰]

۱ ۔ جب از راہ اخلاص اور کسی توقع کے بغیر پیش کیا جائے ۔

۲ ۔ اس سے کوئی غرض وابستہ نہ ہو ۔

۳ ۔ سابقہ تعلقات نہ ہوں ۔

عہد نبوی میں ایک علاقہ کا حاکم لُتبیہ نامی ایک مرتبہ صدقات وزکوٰۃ کی رقمیں جمع کر کے دربار نبوی میں حاضر ہوا ۔ تو اس نے رقمیں پیش کر کے عرض کیا کہ یہ آپ کا اجنبی الوصول ہے اور یہ مجھے بطور ہدیہ دیا گیا ہے ۔ یہ سن کر حضورؐ منبر پر کھڑے اور ایک تاریخی خطبہ دیا ۔ جس میں فرمایا کہ[۳۱]

"عامل کا کیا حال ہے کہ ہم اس کو بھیجتے ہیں تو آکر کہتا ہے کہ یہ تمہارا ہے اور یہ مجھے ہدیہ دیا گیا ہے ۔ وہ اپنے والدین کے گھر کیوں نہ بیٹھ رہا اور پھر دیکھتا کہ گھر بیٹھے اس کو تحفے ملتے ہیں یا نہیں قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے ۔ وہ اس مال میں سے جو کچھ بھی رکھے گا وہ قیامت میں اپنی گردن پر لاد کر لائے گا ۔ اونٹ، گائے، بکری جو ہو ۔"

حضرت عمر بن عبدالعزیز اپنے دور حکومت میں ہدایا قبول نہیں کیا کرتے تھے۔ اس کا سبب دریافت کیا گیا کہ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہدیے قبول فرمایا کرتے تھے تو آپ کیوں انکار کرتے ہیں؟ فرمایا کہ حضورؐ کو نبوت کی وجہ سے تحفہ دیا جاتا تھا اس لیے اس کی صورت نہیں بدلتی تھی۔ مگر ہمیں حکومت کی وجہ سے ہدیہ پیش کیا جاتا ہے اس لیے اس کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ وہ ہدیہ نہیں رہتا۔ بلکہ رشوت بن جاتا ہے۔ ایک مرتبہ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے تمام حاکموں کو لکھا "لاتقبلوا الھدیۃ فانھا رشوۃ" یعنی ہدیہ قبول نہ کیا کرو کیونکہ وہ رشوت ہوتا ہے۔

رشوت اور فیصلہ: آج یہ ایک انتہائی غلط تصور عام ہو چکا ہے کہ حکام اور ذمہ دار منصب والوں کو رشوت دے کر اپنے حق میں فیصلہ کرانے سے فی الواقع اور عنداللہ بھی وہ فیصلہ جائز اور برحق ہوتا ہے۔ حالانکہ مقدمات فیصل کرنے میں رشوت لینا بجائے خود حرام ہے۔ جیسا کہ ارشاد نبوی ہے:

کل لحم انبتہ السحت فالنار اولیٰ بہ قیل و ما السحت قال الرشوۃ فی الحکم۔ ۳۲؎	ہر وہ جسم جو حرام مال سے نشو ونما پائے وہ آگ میں جلائے جانے کا زیادہ مستحق ہے۔ دریافت کیا گیا کہ "السحت" سے کیا مراد ہے فرمایا فیصلہ کرنے میں رشوت لینا۔

دوسری جگہ سخت وعید کی خبر دیتے ہوئے فرمایا:

لعن آخذ رشوۃ فی الحکم کانت ستراً بینہ و بین الجنۃ ۳۳؎	فیصلہ کرنے میں رشوت لینے والے پر لعنت کی گئی ہے وہ رشوت اس شخص اور جنت کے درمیان حائل ہو جائے گی۔

حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ:-

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

لعن اللہ الراشی و المرتشی فی الحکم[۳۴] کہ اللہ جل شانہٗ نے فیصلہ کرنے میں رشوت لینے اور دینے والے پر لعنت کی ہے۔

یہاں تک کہ رشوت لے کر فیصلہ کرنے والے کے عمل کو کفر کے برابر سنگین گناہ قرار دیا گیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ:۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم الرشوۃ فی الحکم کفر و ھی بین الناس سحت[۳۵] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فیصلہ کرنے میں رشوت لینا دینا کفر ہے اور لوگوں کے درمیان باہمی رشوت کا لین دین حرام ہے۔

دوسری بات یہ کہ بقول مولانا ابوالکلام آزاد:

" رشوت خور حاکم کے فیصلہ سے ناجائز بات جائز نہیں ہو سکتی[۳۶] "

امام ترمذی نے اپنی جامع میں ایک مستقل باب ہی قائم کیا ہے:۔

" باب ماجاء فی التشدید علی من یقضی لہ بشیٔ لیس لہ ان یاخذہ "

اور پھر اس کے تحت درج ذیل حدیث درج کی ہے[۳۷]

عن ام سلمۃ رضی اللہ تعالی عنہا قالت قال رسول اللہ صلی اللہ و سلم انکم تختصمون الیّ وانما انا بشر ولعل بعضکم ان یکون الحن بحجتہ من بعض فان قضیت لاحد منکم بشیٔ من حق اخیہ فانما اقطع لہ قطعۃ من النار فلا یاخذ منہ شیئاً۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے ارشاد فرمایا کہ تم لوگ میرے پاس اپنا تنازعہ لے کر آئے مگر میں بھی ایک انسان ہی ہوں اور ممکن ہے تم میں سے کوئی فریق اپنی تیز زبانی سے دوسرے پر سبقت لے جائے۔ اگر میں کسی چیز کا فیصلہ کر دوں اور وہ درحقیقت اس کے ساتھی کی ہو تو سمجھ لو کہ میں اس کے لیے آگ کا ٹکڑا دے رہا ہوں بس اس کو اس میں سے ناحق نہ لینا چاہیئے۔

اس خوفناک انجام کے فرمان کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو فریقین اپنا قضیہ لے کر دربار نبوی میں آئے تھے۔ ان میں سے ہر ایک دوسرے کے حق میں دستبردار ہونے پر مصر ہونے لگا۔
عرب میں یہودیوں کے مقدمے ان کے احبار و رئیس فیصل کرتے تھے۔ وہ لوگ قانون کی زد سے بچنے کے لیے علانیہ رشوت دیتے تھے اور ان کے قاضی علانیہ لیتے تھے اور اس طرح وہ توراۃ کے احکام پر پردہ ڈال کر ناحق فیصلے کرتے تھے۔
علامہ سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ توراۃ کے قوانین میں تحریف کا ایک بڑا سبب یہی رشوت خواری ہے۔ قرآن مجید کی اس آیت میں ان کے اسی گناہ کی پردہ دری کی گئی ہے:-

"اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنَ الْکِتٰبِ وَیَشْتَرُوْنَ بِہٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا اُولٰٓئِکَ مَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِہِمْ اِلَّا النَّارَ الخ"

"پیٹ میں آگ بھرنا" اس لیے فرمایا کہ یہود دنیا کی اس معمولی دولت کے لالچ میں آکر خدا کے احکام میں ردو بدل اور منشائے الٰہی میں تحریف پیٹ ہی کی خاطر کرتے تھے۔ [۳۸]

سفارش اور رشوت | "جائز اور ناجائز" حلال و حرام اور گناہ و ثواب کا امتیاز اٹھ جانے کے باعث سفارش کرنا اور کرانا ایک فیشن، رسم اور رواج کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ حالانکہ سفارش صرف حق کے لیے جائز ہے۔ ورنہ ناجائز حرام اور گناہ ہے۔ اسی لیے حق تعالیٰ فرماتے ہیں [۳۹]:-

من یشفع شفاعۃ حسنۃ یکن لہ نصیب منہا و من یشفع شفاعۃ سیئۃ یکن لہ کفل منہا ط	جو کوئی نیک بات کی سفارش کرے گا اس کو اس میں سے حصہ ملے گا۔ اور جو کوئی بری بات کی سفارش کرے گا اس پر بھی اس میں سے بوجھ پڑے گا۔

یعنی اگر وہ کسی نیک اور اچھی بات کے لیے مشروع طریق پر سفارش کرے گا تو وہ اس

عمل خیر کے اجر کا مستحق ہوگا۔ جیسے کسی دولت مند سے کسی محتاج کی سفارش کر کے کچھ دلا دینا تو اس طرح دلانے والا بھی خیرات کے ثواب میں داخل ہو جائے گا۔ لیکن اگر کسی غیر شرعی کام کے لیے خواہ وہ بظاہر کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو سفارش کرے یا کسی بُرے کام کے لیے سفارش کرے تو وہ اس میں اس وقت تک کے لیے شریکِ گناہ رہے گا جب تک کہ اس کی سفارش کی بنا پر برے کام کرنے والا اُسے جاری رکھے گا جیسے کسی بدمعاش، چور، رہزن اور فریب کار کی سفارش کر کے اُسے چھڑا لیا جائے۔ اور وہ پھر ویسے جرائم شروع کردے۔ تو جب تک ان جرائم کا سلسلہ جاری رہے گا۔ سفارش کرنے والا اس وقت تک اس گناہ میں شریک رہے گا۔ اس لیے سفارش کرنے سے قبل کام کی نوعیت اور حقیقت معلوم کرلینی ضروری ہے۔ تاکہ کہیں انسان خود ہی مبتلائے عذاب نہ ہو جائے۔ سفارش کو مؤثر بنانے کے لیے ہدیہ وغیرہ پیش نہ کرے کہ یہ رشوت میں شمار ہوگا۔

حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ و التسلیم کا ارشاد ہے کہ:

من شفع لاحد شفاعۃ فاھدی لہ ھدیۃً علیھا فقبلھا فقد اتیٰ بابا عظیماً من ابواب الربا۔	جس نے کسی کی کوئی سفارش کی اور اس پر اسے کوئی ہدیہ دیا اور اس نے قبول کر لیا تو یہ سود کے شعبوں میں سے بڑے شعبہ کا مرتکب ہوا۔

مُلّا علی قاری نے لکھا ہے کہ:-

"سود شریعت میں وہ زیادتی ہے جو عوض سے خالی ہو اور معاملہ میں شرط قرار دی گئی ہو۔" ۷۹ے

تو جس طرح سود حرام ہے۔ ویسے ہی ایسا ہدیہ بھی حرام ہے۔ احیاء العلوم میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے سوال کیا گیا کہ قرآن مجید میں "اَکّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ" آیا ہے۔ وہ سحت کیا ہے؟

فرمایا کہ کوئی تمہاری حاجت پوری کردے اور تم اس کو ہدیہ دے دو۔ امام غزالیؒ

کہتے ہیں کہ حضرت ابن مسعود کی اس سے مراد یہ ہے کہ کوئی ایسی بات کہدی جائے جس میں کوئی مشقت کا کام نہ کرنا پڑے یا یہ کہ محض اللہ کے لیے کیا ہو تو پھر اس پر کچھ لینا جائز نہیں۔

حضرت عائشہ رض کے متعلق نے کسی کی سفارش کی اس نے ان کو ایک باندی پیش کی تو آپ غصہ ہوئے اور واپس کردی۔ اور کہا کہ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تمہارے دل میں یہ بات ہے تو میں تمہاری حاجت کے متعلق کوئی بات نہ کہتا۔ اور اب جو تمہاری حاجت باقی رہ گئی ہے اس کی بابت کچھ نہ کہوں گا۔

لیکن اگر جائز سفارش میں کوئی مشقت کا کام کرنا پڑے جیسے جانا، آنا، کسی کو لانا لے جانا وغیرہ تو بقول امام غزالی اگر اس پر کچھ لیا تو وہ اس کام کی اجرت بن جائے گی۔"

قانون سازی اور رشوت یہ ایک حقیقت ہے کہ رشوت کا کاروبار قانون سازی کی وجہ سے فروغ پا رہا ہے۔ آئے دن نئے نئے قانون بنائے جا رہے ہیں۔ جن کی وجہ سے نئے نئے محکمے وجود میں لائے جاتے ہیں۔ اور ان کے لیے نئے نئے ضابطے (PROCEDARE) اور نئے نئے قواعد (RULES) بنائے جاتے ہیں۔ اس طرح عوام و خواص پر افسروں و اہلکاروں کی گرفت و حکومت کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ ہر نیا قانون، نیا محکمہ اور نیا ضابطہ رشوت ستانی کے نئے نئے دروازے کھول دیتا ہے۔ جہاں تک قانون سازی اور محکمہ سازی کا تعلق ہے ہماری حالت اس بادشاہ کی سی ہے جس کا سائیس اس کے گھوڑوں کے دودھ میں سے ایک سیر دودھ روزانہ اپنے لیے نکال لیتا تھا کسی نے بادشاہ کو خبر کردی۔ تو اس نے اس سائیس کی اصلاح کی بجائے اس پر نگرانی کے لیے ایک انسپکٹر مقرر کر دیا۔ انسپکٹر صاحب بھی سفارشی کو ملے سے آئے تھے۔ اس لیے انھوں نے آتے ہی سائیس سے پانچ سیر دودھ وصول کرنا شروع کر دیا۔ کچھ عرصے کے بعد اس کی بھی شکایت ہوگئی تو بادشاہ نے بنیادی نقص دور کرنے کے بجائے ان دونوں پر سپرنٹنڈنٹ تعینات کر دیا۔ اتفاق سے اس "غریب" کا کنبہ زیادہ تھا۔ اس لیے اس نے

اپنے لیے کفایتہً آٹھ دس سیر دودھ وصول کرنا شروع کردیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ گھوڑے دبلے ہونے شروع ہو گئے۔ سائیس سب کو دودھ دینے کے بعد قریبی نہر سے دودھ کے مٹکوں میں پانی بھر کر رکھ دیتا۔ ایک روز خود بادشاہ معائنہ کے لیے اصطبل میں آگیا۔ اس نے دودھ کے مٹکوں میں چھوٹی چھوٹی مچھلیاں پھدکتی دیکھیں۔ سائیس سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟

سائیس نے باادب کہا:۔

"حضور کا انتظام پھدک رہا ہے"

یہ جواب سن کر بادشاہ حیران ہوا اور اس نے کہا۔

"کبھی انتظام بھی پھدکتا ہے؟"

سائیس نے دست بستہ عرض کیا

"حضور ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے؟"

اور سارا واقعہ من وعن سنا دیا۔ اس پر بادشاہ نے اپنی غلطی کو محسوس کیا کہ انتظام بدلنے کے بجائے سائیس کی ذہنیت واخلاق کو بدلنے کی ضرورت تھی۔ اس لیے اسی وقت انسپکٹر اور سپرنٹنڈنٹ کو ملازمت سے برطرف کردیا۔ اور سائیس کی اصلاح کی فکر کے ساتھ ساتھ اس کی تنخواہ بھی بڑھا دی۔ تاکہ وہ اپنی جائز ضروریات کے لیے ناجائز وسائل اختیار نہ کرے۔"[۱۵]

خود ہمارے ملک میں بھی انسدادِ رشوت ستانی کے لیے تعزیرات ہند میں سخت قوانین موجود ہیں۔ انسدادِ رشوت ستانی کا ایک مستقل محکمہ بھی قائم ہے۔ لیکن اس کو کیا کہیے خود اس محکمے میں رشوت کا بازار پورے زور سے گرم ہے۔

آخری بات: مذکورہ بالا تفصیلات سے معلوم ہوا کہ آج سماج میں خود غرضی اور مفاد پرستی کا جو دور دورہ ہے وہ درحقیقت رشوت اور سود ہی کا ثمرہ اور نتیجہ ہے۔ ایک طاقتور

قوم کی عمارت اسی بنیاد پر مستحکم ہوتی ہے کہ اس کے افراد باہم پشتیبان ثابت ہوں اور اس کے تمام عناصر اس طرح جڑے ہوئے ہوں کہ انھیں ایک دوسرے سے جدا کرنا ممکن نہ ہو۔ لیکن جس قوم میں رشوت اور سود کا عموم ہو جائے وہاں اتحاد کے بجائے افتراق، انارکی، تشتت اور انتشار کی کارفرمائی نظر آئے گی۔ اور آج تمام اقوام عالم اسی خطرناک دور سے گذر رہی ہیں۔

حوالے

(۱) سیرت النبی مصنفہ علامہ سید سلیمان ندوی جلد ۶ صفحہ ۱۰۷ مطبوعہ معارف پریس اعظم گڑھ۔

(۲) کلام پاک سورۃ بقرہ آیت : ۲۱

(۳) قرآن مجید سورۃ بقرہ آیت ۳۱

(۴) " " " اعراف " ۳۲

(۵) " " " " "

(۶) آلوسی بغدادی : روح المعانی جلد : ۲ صفحہ : ۶۰

(۷) سید رشید رضا مصری تفسیر المنار مرتبہ مفتی محمد عبدہ جلد : ۲ صفحہ ۱۹۰

(۸) عبدالماجد دریا بادی : تفسیر ماجدی اُردو جلد : ۱ صفحہ ۷۳ لاہور اڈیشن

(۹) تفسیر المنار جلد : ۲ ص : ۱۸۰ ، ۱۹۰۰ مطبع منار مصر

(۱۰) ابو حیان اندلسی : البحر المحیط جلد ۲ ص ۵۶ مطبوعہ مصر

(۱۱) لباب التاویل فی معانی التنزیل المسمی بہ تفسیر خازن جلد ا ص ــــــ مطبوعہ مصر

(۱۲) روح المعانی جلد : ۲ ص : ۶۰ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ مصر۔

(۱۳) لغات القرآن مرتبہ مولانا عبدالرشید نعمانی جلد : ۲ ص ۱۰۶ مطبوعہ ندوۃ المصنفین دہلی

(۱۴) تفسیر طبری جلد : ۲ ص : ۱۰۳ مطبعہ الیمنیہ مصر

(۱۵) تفسیر روح المعانی جلد: ۲ ص: ۴۰
(۱۶) فخر الدین رازی: تفسیر کبیر جلد: ۲ ص ۲۱۱
(۱۷) البحر المحیط جلد: ۲ ص: ۵۶
(۱۸) ایضاً۔
(۱۹) حافظ ابو البرکات نسفی: مدارک التنزیل مطبوعہ افضل المطابع
(۲۰) مسند احمد بن حنبل جلد ۲ ص: ۲۱۲۔ کنز العمال جلد: ۳ ص ۲۱۰
(۲۱) ترمذی کتاب الاحکام
(۲۲) شیخ علی متقی: کنز العمال جلد: ۲ ص: ۲۱۰
(۲۳) کنز العمال جلد: ۳ ص: ۲۱۵
(۲۴) مسند طیالسی حدیث نمبر ۲۲۷۶ و مسند ابن حنبل جلد: ۲: ص ۱۶۴
(۲۵) مسند ابن حنبل جلد: ۵ ص: ۲۷۹، کنز العمال: جلد: ۳ ص: ۲۱۰،
اتحاف السادہ شرح احیاء العلوم ج ۷ ص ۱۶۵
(۲۶) کنز العمال جلد: ۳ ص: ۲۱۰
(۲۷) ایضاً
(۲۸) ایضاً
(۲۹) ایضاً
(۳۰) یہ بات واضح رہنی چاہیئے کہ انسان کا ضمیر خود بہت بڑا محاسب ہے۔ اس لیے ان شرائط کو اپنی بدعملی کے لیے وجہ جواز نہیں بنانا چاہیئے۔ یہ گنجائش محض رخصت ہے ورنہ عزیمت کا تقاضہ تو یہ ہے کہ اگر ہدایا اور تحائف میں یہ شرائط بدرجۂ اتم موجود بھی ہوں تو بھی اس سے احتراز کرنا چاہیئے۔
(۳۱) جامع صحیح البخاری باب ہدایا العمال اور باب الزکوٰۃ، سیرت النبی جلد: ۶ ص ۷۵

۳۲۔ ابن جریر بحوالہ کنز العمال جلد: ۳ ص: ۲۱۱
۳۳۔ کنز العمال جلد: ۳ ص: ۲۱۱
۳۴۔ مسند امام احمد بن حنبل جلد ۲ ص ۳۸۷
۳۵۔ المعجم الصغیر للطبرانی
۳۶۔ ترجمان القرآن جلد: ۱ ص: ۲۳۶
۳۷۔ ترمذی ابواب الاحکام و تفسیر المنار جلد: ۲ ص: ۱۹۴
۳۸۔ سیرت النبی جلد: ۶ ص: ۲۰۷
۳۹۔ قرآن پاک: سورۃ النساء آیت نمبر ۸
۴۰۔ مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح جلد: ۴ ص: ۱۵۵
۴۱۔ اس مقالہ میں "رشوت اور سفارش" اور "قانون سازی اور رشوت" کے عنوانات کے تحت جو کچھ لکھا گیا ہے۔ یہ دراصل منشی عبدالرحمان خاں کی ایک مختصر کتاب "بازارِ رشوت" سے ماخوذ ہے۔ یہ کتاب اپنے موضوع پر مختصر اور تشنہ ہونے کے باوجود وقیع اور قابل قدر ہے۔ چند سال قبل ہمارے یہاں "معارف" میں تبصرہ کے لیے یہ کتاب عالمی ادارہ اشاعت علوم اسلامی چہلیک ملتان شہر پاکستان سے موصول ہوئی تھی۔

ضروری گزارش

حضرات۔ ممبرانِ ادارہ اور برہان کے خریداروں سے گذارش ہے کہ ادارہ سے آپ حضرات کو یاددہانی کے خطوط ارسال کیے جارہے ہیں۔ ان پر فوری توجہ فرمائیں۔ نیز خطوط ارسال کرتے وقت یا منی آرڈر کوپن پر اپنا پورا پتہ اور خریداری نمبر کا لکھنا نہ بھولیں۔ جو پتہ کی چٹ پر درج ہوتا ہے۔ تاکہ تعمیل ارشاد میں تاخیر نہ ہو۔ (نیاز مند منیجر)

فضائل اعمال میں

حدیث ضعیف کی مقبولیت اور اس کے حدود و شرائط

از: مولوی محمد عبد اللہ صاحب دہلوی

(رفیق ادارہ)

فن حدیث کے متعلق عوام و خواص سب لوگوں میں یہ بات مشہور ہے کہ ترغیب و ترہیب اور عذاب و ثواب کے موضوع پر حدیثوں کے معیار میں محدثین کے یہاں نرمی ہے، اور اس کا سہارا لے کر اس موضوع پر بہت زیادہ کمزور بلکہ منکر و موضوع روایتیں تک نقل کر لی جاتی ہیں۔ حالانکہ اس اصول کے ساتھ محدثین کے یہاں چند ضروری قیود و شرائط ہیں۔ ان سطور میں انھی کا بیان کرنا مقصود ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ علماء اسلام نے شریعت کے اصول و قوانین مرتب کرنے اور حلال حرام کا فیصلہ صادر کرنے کے لیے جس بلند معیار کی حدیثیں لی ہیں اور ان حدیثوں کی اسانید پر جتنی سخت نگرانی کی ہے ایسی سخت نگرانی ترغیب و ترہیب کی حدیثوں پر نہیں کی بلکہ اس قسم کی روایات میں ایک حد تک نرمی سے کام لیا ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

اذا روینا فی الحلال والحرام شددنا واذا روینا فی الفضائل تساھلنا[1]	ہم جب حلال و حرام کے سلسلہ میں کوئی حدیث روایت کرتے ہیں تو اس میں سختی سے کام لیتے ہیں اور فضائل کے متعلق روایت کرتے ہیں تو نرمی برتتے ہیں۔

---

[1] الاجوبۃ الفاضلۃ للاسئلۃ العشرۃ الکاملۃ۔ از مولانا عبد الحی لکھنوی ص ۳۶ (طبعہ سوریۃ)

ملا علی قاری نے العلامہ الاوفر فی الحج الاکبر" میں کہا ہے

ان الحدیث الضعیف معتبر فی فضائل الاعمال عند جمیع العلماء من ارباب الکمال [1]	اعمال صالحہ کے فضائل کے سلسلہ میں حدیث ضعیف تمام علماء کاملین کے نزدیک معتبر ہے

اور "الموضوعات الکبیر" میں حدیث مسح الرقبۃ امان من الغل کے تحت لکھتے ہیں۔

الضعیف یعمل بہ فی فضائل الاعمال اتفاقاً [2]	فضائل اعمال کے بارہ میں حدیث ضعیف پر بالاتفاق عمل کیا جاتا ہے۔

علامہ محی الدین یحییٰ بن شرف النووی نے کتاب الاذکار میں اس کو تفصیل سے لکھا ہے۔ فرماتے ہیں:-

قال العلماء من المحدثین و الفقہاء وغیرھم یجوز ویستحب العمل فی الفضائل والترغیب والترھیب بالحدیث الضعیف مالم یکن موضوعاً واما الاحکام کالحلال والحرام والبیع والنکاح والطلاق وغیر ذلک فلا یعمل فیھا الا بالحدیث الصحیح او الحسن الا ان یکون فی احتیاط فی شیء من ذلک کما اذا ورد حدیث	تمام فقہا و محدثین وغیرہم نے کہا ہے کہ فضائل اور ترغیب و ترہیب کے سلسلہ میں ضعیف حدیث پر عمل کرنا جائز بلکہ مستحب ہے تاوقتیکہ وہ موضوع کے حکم میں شامل نہ ہو البتہ احکام کے بارے میں مثلاً حلال وحرام۔ خرید و فروخت اور نکاح وطلاق وغیرہ میں صرف حدیث صحیح یا حدیث حسن ہی لی جائے گی، ہاں بطور احتیاط اگر کہیں ضرورت پڑ جائے تو حدیث ضعیف پر بھی عمل کر سکتے ہیں۔

---

[1] الاجوبۃ الفاضلۃ للاسئلۃ العشرۃ الکاملۃ از مولانا عبدالحی لکھنوی ص ۳۶ (طبعۃ السوریۃ)

[2] الموضوعات الکبیر ص ۹۳ (مجتبائی دہلی ۱۳۴۶ھ)

ضعیف مثل احتمال بعض البیوع او الانکحۃ، فان المستحب ان یتنزہ عنہ، ولکن لا یجب [1]

مثلاً بیع و شرا یا نکاح کے بارے میں حدیث ضعیف میں کوئی ممانعت ہو تو اس ممنوع شئے سے پرہیز کرنا بطور احتیاط مستحب ہوگا لیکن اس کا ماننا واجب نہیں ہوگا۔

حافظ عراقی نے یہ اصول تقریباً انہی الفاظ میں بیان کرنے کے بعد لکھا ہے :-

و ممن نص علی ذلک من الائمۃ عبدالرحمن بن مھدی واحمد بن حنبل وعبداللہ بن مبارک وغیرھم [2]

اور جن علماء نے یہ اصول بیان کیا ہے ان میں سے عبدالرحمن بن مہدی، امام احمد بن حنبل اور عبداللہ بن مبارک وغیرہم ہیں۔

اس ڈھیل کی وجہ: علماء اسلام نے جو اس سلسلہ میں نرمی برتی ہے اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے علامہ عبدالحی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

لانہ ان کان صحیحا فی نفس الامر فقد اعطی حقہ من العمل والا لم یترتب علی العمل بہ مفسدۃ تحلیل ولا تحریم ولا ضیاع حق الغیر [3]

اس لیے کہ اگر وہ حدیث واقعۃً صحیح ہوگی تو اس پر عمل کرکے اس کا حق ادا کردیا گیا اور اگر بالفرض حقیقت کے لحاظ سے وہ صحیح نہ تھی تب بھی کوئی حلال یا حرام کا نقصان نہیں ہوا اور نہ کسی کا حق ہی مارا گیا ہے

یعنی بہت سے بہت یہی اندیشہ ہو سکتا ہے کہ واقعۃً وہ فرمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ ہو تو ایسی صورت میں کبھی زیادہ سے زیادہ یہی تو ہوا کہ ایک کام کو جتنا بہتر سمجھ کر کیا گیا تھا وہ اتنا بہتر نہ تھا اور ظاہر ہے کہ اس سے دین و شریعت میں کوئی خرابی نہیں آتی اور اس کے

---

[1] کتاب الاذکار ص (مطبعۃ حجازی قاہرہ)
[2] الاجوبۃ الفاضلۃ ص ۳۹
[3] ظفر الامانی

برخلاف اگر واقعہ کے لحاظ سے وہ فرمان رسول تھا تو اجر و ثواب یقینی ہے۔ اس سلسلہ میں محقق جلال الدین دوانی نے انموذج العلوم میں بڑی اچھی بحث کی ہے۔ فرماتے ہیں:

اذا وجد حدیث ضعیف فی فضیلۃ عمل من الاعمال ولم یکن ھذا العمل مما یحتمل الحرمۃ او الکراھۃ فانہ یجوز العمل بہ و یستحب لانہ مامون من الخطر ومرجو النفع اذھو دائر بین الاباحۃ والاستحباب فالاحتیاط العمل بہ رجاء الثواب [1]

اعمال صالحہ میں سے جب کسی عمل کی فضیلت کے بارے میں کوئی ضعیف حدیث مل جائے اور یہ عمل ایسا نہ ہو جس میں حرمت یا کراہت کا احتمال ہو تو ایسی صورت میں اس حدیث ضعیف پر عمل کرنا جائز بلکہ مستحب ہے اس لیے کہ اس میں خطرہ تو کچھ ہے نہیں اور نفع کی امید پوری ہے کیونکہ معاملہ (حلال یا حرام کا نہیں بلکہ) جائز اور مستحب کا ہے لہذا احتیاط اسی میں ہے کہ ثواب کی نیت سے اس پر عمل کر لیا جائے

وجہ اس کی یہ ہے کہ بالفرض حقیقت کے لحاظ سے یہ حدیث قول رسول صلی اللہ علیہ وسلم نہ بھی ہوئی تو جائز کام ہوا اور اگر اس کے برخلاف اس کا فرمان رسول ہونا صحیح ہو تو اس کا حق ادا ہو ہی گیا یعنی اس کے مطابق عمل کر لیا گیا۔

اسی اصول کو اگر ہم از روئے عقل و مشاہدہ جانچ کر دیکھیں تو اس کی معقولیت بالکل واضح ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کے معاملات میں کہیں تو ایک بچہ کا اطلاع دینا بھی کافی سمجھا جاتا ہے اور کہیں یقین کرنے کے لیے کسی بڑے اور سمجھدار آدمی کا ہونا ہی ضروری قرار دیا جاتا ہے اور اس سے بھی ترقی کرکے عدالتی معاملات کو دیکھئے تو وہاں صرف ایک سمجھدار آدمی کا ہونا بھی کافی نہیں بلکہ وہاں گواہی دینے کے لیے کئی سمجھدار اور معقول آدمیوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ اب اگر ایک شخص اپنے شب و روز کے معمولی معمولی کاموں میں بھی وہی عدالتی معیار شہادت کو ضروری قرار دینے لگے تو نہ صرف یہ کہ اہل عقل کے نزدیک وہ دیوانہ قرار پائیگا

---

[1] الاجوبۃ الفاضلۃ ص ۵، ظفر الامانی ص

بلکہ خود اس کی اپنی زندگی دشوار ہو جائے گی۔

ٹھیک اسی طرح شرعی معاملات میں بھی مختلف درجات ہیں اور اسی لحاظ سے ہر درجے کے لیے ایک مخصوص معیار کی نصوص درکار ہیں۔ بس جس درجہ کا حکم شرعی ثابت کرنا ہوگا اسی درجہ کی نص تلاش کی جائے گی۔ اگر کوئی متشدد و غالی ہر معاملہ میں حکم قرآنی یا حدیث متواتر یا حدیث صحیح ہی تلاش کریگا۔ اور حدیث ضعیف کو بالکل ناقابلِ اعتبار قرار دے گا تو علماء اسلام کے یہاں ایسا آدمی خارق اجماع اور خبطی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ علامہ عبدالحی لکھنوی نے حدیث ضعیف کے مقبول یا غیر مقبول ہونے کے متعلق تین مذہب نقل کیے ہیں اور سوائے مذکورہ بالا مذہب کے باقی دو کو ناقابلِ اعتبار قرار دیا ہے لکھتے ہیں:۔

(۱) فمنھم من منع العمل بالضعیف مطلقا وھو مذھب ضعیف۔	(۱) کچھ لوگ تو وہ ہیں جو حدیث ضعیف پر عمل کرنے کو مطلقاً ناجائز کہتے ہیں۔ یہ مذہب ضعیف ہے۔
(۲) ومنھم من جوزہ مطلقاً وھم توسع سخیف۔	(۲) اور کچھ لوگ اس کی عام اجازت دیتے ہیں۔ اور یہ غیر دانشمندانہ توسع اور ڈھیل ہے۔
(۳) ومنھم من فصّل وقیّدَ وھو المسلک المسدّد [۱]	(۳) اور ایک مسلک یہ ہے کہ اس میں کچھ فرق کیا جائے اور حدود متعین کی جائیں۔ یہ رائے سب سے صحیح اور حق ہے

اس تیسرے مسلک میں جو حدود متعین کرنے کا ذکر ہے اس سے مراد وہی ہے جو اوپر ذکر ہوا کہ حلال و حرام اور معاملات وغیرہ میں حدیث ضعیف ناکافی اور فضائل اعمال

---

[۱] الاجوبۃ الفاضلۃ ص۵۳

میں مقبول ہے۔

حدیث ضعیف کے قبول کرنے کی چند ضروری شرطیں

حدیث ضعیف کے رد و قبول پر جب بحث کی جائے تو سب سے زیادہ اہم اور قابلِ لحاظ یہ چیز ہے کہ اہلِ علم نے جہاں حدیث ضعیف کو قبول کیا ہے وہاں کن شرائط کے ساتھ قبول کیا ہے اور اس کے بغیر اہلِ علم کی طرف سے یہ نقل کرنا ان کے مسلک کی ادھوری اور ناقص ترجمانی ہو گی۔ علامہ جلال الدین سیوطی نے تدریب الراوی شرح تقریب النواوی میں اور علامہ سخاوی نے القول البدیع فی الصلاۃ علی الحبیب الشفیع میں شیخ الاسلام حافظ ابن حجر عسقلانی کے حوالے سے لکھا ہے کہ حدیث ضعیف پر عمل کرنے کے لیے یہ شرط ہے کہ:۔

(۱) احدھا فقدان دلیل آخر قوی منہ معارضاً لہ فان دل حدیث صحیح او حسن علی کراھۃ عمل او حرمتہ والضعیف علی استحبابہ وجوازہ فالعمل یکون بالاقوی والقول بمفادہ اخری

(۱) اس کے مقابلہ میں اس سے زیادہ قوی کوئی دلیل موجود نہ ہو۔ کیونکہ اگر کسی حدیث صحیح یا حدیث حسن سے ایک عمل کی کراہت ثابت ہو رہی ہو اور حدیث ضعیف اسے مستحب قرار دے ایسی صورت میں عمل قوی دلیل پر ہی کیا جائے گا اور اسی کے مقتضیٰ کو مقدم رکھا جائے گا۔

(۲) وثانیھا ان لایکون الحدیث شدید الضعف بان تفرد براویتہ شدید الضعف کالکذاب او فاحش الغلط والمغفل وغیر ذلک او کثرت طرقہ لکن لم یخل طریق من طرقہ عن شدۃ الضعف وذلک لان یکون السند شدید الضعف مع عدم ما یجبرہ

(۲) اس حدیث کا ضعف زیادہ شدید نہ ہو جیسے مثال کے طور پر کوئی حدیث ایک ہی سند سے منقول ہے اور اس میں کوئی راوی ایسا ہے جو بہت ضعیف ہے مثلاً کذاب ہوتا، فاحش الغلط ہوتا یا مغفل ہوتا وغیرہ یا یہ کہ حدیث کی سندیں تو کئی ہیں۔ لیکن کوئی بھی سند شدید ضعف سے محفوظ نہیں ہے۔ ایسی

نقصانہ یجعلہ فی حکم العدم ویلحقہ الی الموضوع والمخترع الذی لا یجوز العمل بہ بحال۔

میں اس حدیث کے غیر معتبر ہونے کی) وجہ یہ ہے کہ کسی سند کا شدید ضعیف ہونا جبکہ اس کی اس کمی کی تلافی بھی کسی اور ذریعے سے نہ ہو رہی ہو اس کو کالعدم بنا دیتا ہے، اور موضوع و من گھڑت حدیث کے قریب پہنچا دیتا ہے جس پر کسی طرح بھی عمل کرنا جائز نہیں ہے

(۳) وثالثھا ان یکون ما ثبت بہ داخلاً تحت اصل کلی من الاصول الشرعیۃ غیر مخالف للقواعد الدینیۃ لئلا یلزم اثبات مالم یثبت شرعاً بہ فانہ اذا کان ما دل علیہ داخلاً فی الاصول الشرعیۃ غیر مناقض لھا فنفس جوازہ ثابت بھا والحدیث الضعیف الدال یکون مؤکداً لہ

(۳) حدیث ضعیف پر عمل کرنے کی تیسری شرط یہ ہے کہ جو مضمون اس سے ثابت ہوتا ہے وہ شریعت کے عام قواعد کے خلاف نہ ہو بلکہ ان کے تحت آتا ہو تاکہ جو چیز شرعاً غیر ثابت ہے اس کا اثبات لازم نہ آئے، پس جب اس حدیث کا مضمون عام قواعد شرعیہ کے منافی نہ ہو بلکہ انھی کے تحت آتا ہو تو (گویا) نفس جواز تو اس کا پہلے سے ثابت ہے ہی۔ حدیث ضعیف نے صرف اتنا کیا کہ اس کے جواز ہی میں ذرا تاکّد واہتمام پیدا کر دیا۔

(۴) ورابعھا ان لا یعتقد العامل بہ ثبوتہ بل الخروج عن العہدۃ بیقین وانہ ان کان صحیحاً فی نفس الامر فذاک والا لم یترتب علی العمل بہ فساد شرعی

(۴) اور چوتھی شرط یہ ہے کہ عمل کرنے والا اس حدیث پر عمل کرتے وقت اس کے ثبوت کا عقیدہ نہ رکھے بلکہ اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو کر ایک یقینی کیفیت پر پہنچنے کی نیت ہو۔ یعنی یہ کہ اگر حقیقت[1] میں اس حدیث کا مضمون صحیح ہوا تو عمل کر ہی لیا گیا ہے اور اگر صحیح نہیں ہے تو کوئی شرعی برائی پیش نہیں آئی (اور اس کے برخلاف عمل نہ کرنے کی صورت میں یہ شبہ ہے کہ ہو سکتا ہے حقیقت کے لحاظ سے یہ حدیث صحیح ہو تو ہم ایک حکم شرعی کے تارک ہوں گے)

---

[1] حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا ہے نفس الامر اور حقیقت کے لحاظ سے تو وہ تمام کا تمام

بقیہ اگلے صفحہ پر

ان مفصل شرائط سے یہ بات واضح ہوگئی کہ حدیثِ ضعیف میں جب تک یہ تمام باتیں ملحوظ نہ ہوں اس وقت تک اس پر عمل کرنا جائز نہیں اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ مطلق یہ کہہ دینا کہ فضائلِ اعمال میں حدیثِ ضعیف پر عمل کرنا جائز ہے صحیح نہیں۔ تا وقتیکہ اس میں یہ شرطیں نہ دیکھ لی جائیں۔

حافظ زکی الدین المنذری پر ایک اعتراض اور اس کا جواب

رہا یہ اعتراض کہ پھر حافظ منذری نے اپنی کتاب میں ایسی روایات شامل کیوں کرلیں جو ان شرائط پر پوری نہیں اترتیں؟ تو اس کا جواب اوّل تو یہ ہے کہ وہ خود اس بات کو مقدمہ میں واضح کر چکے ہیں کہ جو حدیثیں میں نے لفظ "رُوِیَ" سے شروع کی ہیں وہ تمام ایسی روایات ہیں جن کے کسی نہ کسی راوی کے متعلق محدثین نے "کذاب" یا "وضاع" وغیرہ الفاظ کہے ہیں۔ اور گزشتہ سطور میں آپ

بقیہ صفحہ گذشتہ[۱۱]: برابر درجہ کی اہمیت رکھتا ہے اس میں صحیح اور ضعیف کا کوئی فرق نہیں ہے لیکن جن واسطوں سے وہ نفس الامری اور حقیقی ارشادات ہم تک پہنچے ہیں ان میں چونکہ فرق ہے اس لیے ان ارشادات میں بھی درجات کا فرق ہوگیا ہے۔ ہمارے پاس چونکہ سوائے سند کے کوئی اور ذریعہ نہیں جس سے ہم یہ جان سکیں کہ یہ بات آپ نے فرمائی ہے یا نہیں اس لیے ہم اسی بات کے مکلف اور اسی کے لیے مجبور ہیں کہ جس درجہ کی سند سے کوئی بات ہم تک پہنچے اس بات کا وہی درجہ قرار دیں خواہ نفس الامر کے لحاظ سے اس میں اور ایک حدیث متواتر میں کوئی فرق نہ ہو۔

یہی وجہ ہے کہ صوفیائے کرام اپنے نورِ باطن سے بعض دفعہ کسی ضعیف حدیث کی صحت و واقعیت کا حکم صادر کردیتے ہیں مگر محدثین اس کو اپنے قواعد کے تحت ضعیف ہی قرار دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر حافظ زکی الدین المنذری نے اپنی کتاب الترغیب والترہیب میں حدیث ازھد فی الدنیا یحبک اللہ الخ کے متعلق لکھا ہے:۔ لکن علی ھذا الحدیث لامعۃ من انوار النبوۃ (ج ۴ ص ۱۵۶) یعنی اگرچہ اس کا فلاں راوی ضعیف ہے۔ لیکن اس پر انوارِ نبوت کی جھلک محسوس ہو رہی ہے۔ لیکن یاد رہے کہ حکم شرعی اسانید کے باضابطہ قواعد ہی کے تحت ثابت ہو سکتا ہے اور بس۔ احکام شرعیہ کے لیے حدیثوں کی پرکھ کا کوئی اور ذریعہ معتبر نہیں۔

علوم کر چکے ہیں کہ جس حدیث کے کسی راوی کے متعلق ایسے الفاظ کہے جائیں وہ نا قابلِ اعتبا تی ہے۔ اور مصنف نے ایسی روایات کو عام حدیثوں سے الگ ایک امتیازی نشان کے ساتھ بیان کیا ہے۔ لہذا مصنف رحمۃ اللہ علیہ اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔ اب سی شخص کا الترغیب سے اس امتیاز کو ملحوظ رکھے بغیر کوئی حدیث نقل کرنا ہرگز جائز نہیں۔ وہ ترغیب کا حوالہ دے کر بری الذمہ نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ حال کے بہت سے مولفین و واعظین کا لقہ ہے، فاضل محترم الشیخ عبدالفتاح ابو غدہ حلبی نے ایسے ہی لوگوں پر اظہار افسوس کرتے ےے لکھا ہے کہ:

من المؤسف جداً ان اغلب الوعاظ والخطباء لمذكرين والمدرسين اذ يقرؤن كتاب لترغيب والترهيب هذا او ينقلون منه ينسون او يغفلون عن اصطلاح مؤلفه فيه فيوردون الحديث الذي في سنده كذاب او وضاع او متهم بكل جزم ارتياح واطمينان كجزمهم بالحديث الذي يقول الامام المنذري فيه رواه البخاري ومسلم، سواء بسواء[۱]

سخت افسوس ہے کہ اکثر واعظین خطبا اور مدرسین جب اس کتاب الترغیب والترہیب کو پڑھتے ہیں یا اس سے نقل کرتے ہیں تو اس کے مصنف کی مطلح کو یا تو بھول جاتے ہیں یا غفلت برتتے ہیں اور جن احادیث میں کوئی راوی کذاب یا وضاع یا متہم ہے ان کو بھی بالکل اسی طرح پورے اطمینان اور کامل یقین و اعتماد کے ساتھ نقل کرتے ہیں جس طرح ان روایات کو نقل کرتے ہیں جن کے متعلق منذری نے "رواہ البخاری ومسلم" کہا ہے۔

اور فاضل موصوف نے بھی مؤلف رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے دفاع کرتے ہوئے وہی کہا ہے جو ہم ابھی اوپر لکھ چکے ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

الامام المنذري رحمه الله تعالى سالم من التبعة اذ صرح باصطلاحه في فاتحة

امام منذری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اس ذمہ داری سے بالکل بری ہیں کیونکہ وہ اپنی کتاب کے مقدمہ میں

---

[۱] التعلیقات الحافلۃ علی الاجوبۃ الفاضلۃ ص۱۲۱

کتاب لیکون القاری منه علی بصیرة ولکن اولئك الذین اشرت الیھم لم تفدھم تصریحات المنذری وتفرقته بین الحدیث الصحیح والضعیف فساقوا جمیع ما فیه مساقاً واحداً [۱]

اپنی اصطلاح صفائی سے بیان کر چکے ہیں جس کا مقصد یہ ہے کہ پڑھنے والا اسے بالبصیرت دیکھے لیکن میں نے جن لوگوں کی طرف اشارہ کیا ان کے حق میں منذری کا بیان اور ان کا صحیح وضعیف حدیثوں میں امتیاز کرنا سب بے نتیجہ رہا اور انھوں نے کتاب کی تمام روایات کو ایک ہی درجہ دے ڈالا۔

دوسرے اس طرح کی (بہت ضعیف) روایات کو محض ذکر کر دینے کی تو اور بھی بہت سی مصلحتیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ:۔

(۱) فن حدیث کا مشہور اصول ہے کہ الضعیف یشد بعضه بعضاً (ایک ضعیف حدیث سے دوسری ضعیف حدیث کو قوت ملتی ہے) اس غرض سے بہت ضعیف حدیث۔ اس کی شدت ضعف کی تصریح کر کے۔ بیان کر دی جاتی ہے تاکہ اس کے ہم معنی اور بھی چند حدیثیں خواہ کمزور درجہ ہی کی سہی اگر مل جائیں تو فی الجملہ تقویت حاصل ہو جائے گی اور اس وقت میں اس کا ہونا بھی مفید ہوگا۔

(۲) امام ابوعبداللہ الحاکم نے "المدخل فی اصول الحدیث" میں اس کی ایک وجہ بیان کی ہے کہ "جرح و تعدیل میں اختلاف کی گنجائش ہے۔ ممکن ہے ایک امام ایک راوی کو مجروح سمجھے اور دوسرا امام اسی راوی کو عادل قرار دے۔ اسی طرح "ارسال" مختلف فیہ ہے [۲] ایک کے نزدیک حدیث مرسل حجت ہے دوسرے کے نزدیک ضعیف اور ناقابل اعتبار ہے۔

(۳) ایک عام طبعی اصول ہے "الاشیاء تعرف باضدادھا" یعنی چیزیں اپنے مقابل چیزوں ہی کے ذریعہ صحیح طور پر سمجھی جاتی ہیں۔ اسی لیے محدثین صحیح حدیثوں کی جانچ پڑتال میں مدد لینے کی غرض

---

[۱] التعلیقات الحافلة ص۱۲۱ [۲] ماخوذ از مضمون محترم مولانا عبدالرشید نعمانی۔ ماہنامہ برہان فروری ۱۹۴۹ء ص۴۴۔ گویا لکھنے والے اس لیے لکھ دیتے ہیں کہ جس کا جو مسلک ہو اس کے مطابق عمل کرے۔

سے بھی ضعیف اور شدید ضعیف بلکہ منکر و موضوع روایات تک نقل کر لیتے تھے چنانچہ مشہور امام حدیث حافظ یحییٰ بن معین فرماتے ہیں کہ:۔

لو لم نکتب الحدیث من ثلاثین وجها ما عقلنا	اگر ہم حدیث کو تیس طریقے سے نہ لکھیں تو ہم اس کو جان نہ سکیں۔

امام احمد بن حنبلؒ نے یحییٰ بن معین کو صحیفۂ معمر کی نقل میں مشغول دیکھا تو پوچھا کہ اس امر کے جاننے کے باوجود کہ یہ صحیفۂ "معمر عن ابان عن انس" سراسر جعلی ہے پھر بھی آپ اس کو نقل کر رہے ہیں جبکہ آپ ابان پر کلام بھی کرتے ہیں؟ جواب دیا "اس لیے کہ پہلے میں اس تمام کو از اوّل تا آخر حفظ کروں گا اور جب کوئی شخص آکر "ابان" کو بدل کر "ثابت" کا نام لے گا اور روایت کرنے لگے گا کہ ... "عن معمر عن ثابت عن انس"، اس وقت میں اس سے کہوں گا کہ تو جھوٹ بولتا ہے۔ اس روایت کا سلسلۂ سند "معمر عن انس" ہے نہ کہ معمر عن ثابت عن انس"

انہی امام ابن معین کا یہ بھی مقولہ ہے کہ:۔

کتبنا عن الکذابین وسجرنا به التنور واخرجنا به خبزا نضیجا [1]	ہم نے جھوٹوں سے روایتیں لکھیں اور ان سے تنور کو گرم کیا اور پکی پکائی روٹی نکالی۔

(۴) بعض علمائے تفسیر نے اپنی کتابوں میں جو اسرائیلی روایات لکھ دی ہیں ان کے سلسلے میں حافظ ابن کثیر نے ایک اہم بات لکھی ہے اپنی تفسیر میں ایک جگہ فرماتے ہیں:۔

وقد روی فی هذا آثار کثیرة عن السلف وغالبها من الاسرائیلیات التی تنقل لینظر فیها۔ [2]	اس کے متعلق سلف سے بہت سی روایات منقول ہیں جن میں سے اکثر اسرائیلیات ہیں جو صرف اس غرض سے نقل کی جاتی ہیں تاکہ ان میں غور و خوض کر لیا جائے۔

لیکن ظاہر ہے کہ یہ تمام ایک محدث کی محض فنی مصالح ہیں جن کے تحت وہ شدید ضعیف روایات

---

[1] ماہنامہ برہان۔ فروری ۱۹۴۲ء صـ۳۵ و صـ۳۶
[2] تفسیر ابن کثیر ج ۲ صـ۸۵ تفسیر سورۃ الکہف۔ آیت۔ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰئِکَةِ اسْجُدُوْا الخ

کو بھی اپنے سینے اور سفینے میں جگہ دیدیتا ہے لیکن جہاں تک عمل کا تعلق ہے اس کے لیے وہی تمام شرائط ملحوظ رکھنا پڑیں گے جو اہل علم کے یہاں مسلّم ہیں جن میں کسی بھی محدث کو کوئی اختلاف نہیں ہے۔

ایک اور خطرناک غلطی پر تنبیہ | مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر ایک اور خطرناک غلطی پر تنبیہ کردی جائے جس کا اسی موضوع سے تعلق ہے۔ جن لوگوں نے فضائل کے سلسلے میں مذکورہ بالا تصریحات کو پوری طرح نہ سمجھنے کی وجہ سے ضعیف حدیثوں سے بڑھ کر بہت زیادہ کمزور اور منکر روایات تک سے استدلال کیا تو وہ پھر نادانستہ ایک غلطی کا شکار ہوئے۔ لیکن سخت افسوس اور حیرت تو ان لوگوں پر ہے جنھوں نے دیدہ ودانستہ منکر و موضوع روایات کو اپنی کتابوں میں جگہ دی ہے۔ اور مزید برآں یہ کہ اپنے اس فعل کو انھوں نے جائز و مستحسن ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلہ میں جہاں تک ہمیں معلوم ہے علما اہلِ سنت میں سب سے زیادہ وضاحت کے ساتھ جس نے لکھا ہے وہ مشہور واعظ و مفسر شیخ اسماعیل حقیؒ (المتوفی ۱۱۳۷ھ) ہیں انھوں نے اپنی تفسیر روح البیان میں سورۃ التوبہ کے آخیر میں لکھا ہے کہ "یہ صاحب کشاف اور ان کے اتباع میں قاضی بیضاوی اور شیخ ابو السعود اور دیگر مفسرین نے جو حدیثیں اپنی کتابوں میں ذکر کی ہیں ان کے متعلق امام صغانی اور دوسرے بہت سے علماء نے گفت وشنید کی ہے اور ان کے موضوع ہونے کا خیال ظاہر کیا ہے۔"

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ اگر وہ روایات ضعیف ہیں تو علماء حدیث نے فضائلِ اعمال کے سلسلہ میں ضعیف احادیث کو قبول کیا ہے اور اگر وہ موضوع ہوں تب بھی ان سے شریعت کے بنیادی احکام کا ضیاع وفساد تو ہے نہیں بلکہ :۔

انہ الحث علی اتباع شریعتہ واقتفاء اثرہ فی طریقتہ   وہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت ہی کے

لہ یہ مسلک جیسا کہ آگے معلوم ہوگا کرامیہ اور بعض صوفیہ کا بھی رہا ہے لیکن ہم نے شیخ اسماعیل حقی کے کلام پر اہمیت کے ساتھ تبصرہ کرنے کی ضرورت اس لیے سمجھی کہ علماء اہلِ سنت میں ہماری معلومات میں ان کے علاوہ کوئی اور قابلِ ذکر مصنف اس باطل مسلک کا حامی نہیں ہے اور ان کی تفسیر چونکہ واعظوں کی دل چسپی کا خاص مرکز ہے اس لیے اس کے نتائج بھی دور رس ہیں۔

اتباع پر آمادہ کرنے اور آپ ہی کے نقش قدم پر چلنے کا شوق دلانے کے لیے ہیں اس کے بعد شیخ اسماعیل حقی نے شیخ عزالدین بن عبدالسلام کا قول نقل کیا ہے کہ:

الکلام[1] وسیلة الی المقاصد فکل مقصود محمود یمکن التوصل الیہ بالصدق والکذب جمیعا فالکذب فیہ حرام فان امکن التوصل الیہ بالکذب دون الصدق فالکذب فیہ مباح ان کان تحصیل ذلک المقصود مباحاً وواجب ان کان ذلک المقصود واجبا فهذا ضابطة[2] (تفسیر روح البیان آخر سورۃ التوبہ)

کلام اور گفتگو کی حیثیت صرف ایک ذریعہ اور واسطے کی ہے اصل چیز مقصد ہے پس جس اچھے مقصود تک رسائی سچ اور جھوٹ دونوں کے ذریعہ ہو سکتی ہو وہاں تو جھوٹ کا اختیار کرنا حرام ہے اور جس مقصود تک رسائی صرف جھوٹ ہی کے ذریعہ ہو سکتی ہے۔ اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر اس مقصود کا حاصل کرنا مباح ہے تو اس میں جھوٹ بولنا مباح اور اگر اس مقصود کا حاصل کرنا واجب ہے تو اس میں جھوٹ بولنا واجب ہے پس یہ عام قاعدہ ہے۔

راقم سطور کہتا ہے کہ علمائے اسلام نے باتفاق رائے سب سے بڑا کبیرہ گناہ اسی کو قرار دیا ہے کہ کوئی شخص صادق و مصدوق حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف قصداً کوئی ایسی بات منسوب کرے جو آپ نے نہیں فرمائی[3]

علامہ جلال الدین سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ کبائر میں سے کوئی کبیرہ بھی ایسا نہیں ہے جس کے مرتکب کو کسی نے کافر کہا ہو مگر اس کبیرہ کے مرتکب کو بعض علماء اسلام نے کافر تک کہا ہے[4]

امام غزالی لکھتے ہیں کہ:

---

[1] اور بالکل یہی الفاظ ان سے قبل امام غزالیؒ لکھ چکے ہیں (احیاء العلوم ج ۳ ص ۱۱۹) عزالدین بن عبدالسلام نے یہ مضمون غزالی ہی سے لیا ہے۔ [2] روح البیان ج ۳ ص ۵۲۴ (مطبوعہ استنبول ۱۳۳۰ھ) [3] شرح مسلم للنووی ج ۱ ص ۸ [4] الموضوعات الکبیر ص ۸

الکذب علی رسول صلی اللہ علیہ وسلم من الکبائر التی لایقاومھا شیٔ [۱]

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بولنا اتنا بڑا گناہ ہے کہ کوئی دوسرا گناہ اس کے برابر نہیں ہو سکتا۔

اب آپ غور کیجئے کہ کیا اس تصور سے زیادہ خطرناک اور گمراہ کن کوئی اور تصور ہو سکتا ہے جس کی رُو سے یہ اتنا بڑا کبیرہ جائز بلکہ مستحسن بلکہ واجب تک پہنچ جائے؟۔ نعوذ باللہ منہ ۔ تحسبونہ ھینا وھو عند اللہ عظیم ۔

خدائے غنی وکریم کا دین اور اس کے نبی امین کی لائی ہوئی شریعت اس بات سے بالکل بے نیاز اور اس سے بہت بلند ہے کہ دجل و فریب کے ذریعہ اس کی خوبیاں دلوں میں بٹھائی جائیں مُشک اپنی خوبی کے تسلیم کرانے میں کسی عطار کی ...... جھوٹی تعریفوں کا محتاج نہیں ہے ۔

زعشق ناتمام ما جمال یار مستغنی ست
بآب ورنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبارا

اور وضع حدیث کے لیے یہ تقسیم کہ اتباع شریعت پر ابھارنے کے لیے ہو تو جائز ورنہ ناجائز۔ یہ بھی عقلاً و نقلاً ہر طرح بے بنیاد، غلط اور علماء اسلام کے اجماع کے خلاف ہے۔ یہ دراصل دورِ قدیم کے فرقۂ کرامیہ کے مسلک کی صدائے بازگشت ہے اور یہی خیال بعض بے علم صوفیا بھی ظاہر کر چکے ہیں [۲] ان لوگوں کے نزدیک ترغیب و ترہیب کے لیے حدیثیں گھڑنا جائز تھا۔ علامہ نووی نے شرح مسلم میں اسی مسلک پر تفصیل سے بڑی سخت تنقید کی ہے۔

---

[۱] احیاء العلوم ج ۳ ص ۱۲۱

[۲] علامہ نووی لکھتے ہیں: وتابعھم علی ھذا کثیرون من الجھلۃ الذین ینسبون انفسھم الی الزھد (شرح مسلم للنووی ج ۱ ص ۸) اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی لمعات میں لکھتے ہیں وقد ینسب الی بعض المتصوفۃ ایضاً (لمعات ج ۱ ص ۲۵۳ طبع اوّل لاہور ۱۳۹۰ھ مطابق ۱۹۷۰ء)

نووی نے کرامیہ کی ایک دلیل کے متعلق (جو شیخ اسماعیل حقّی نے بھی بعض واعظوں کے حوالے سے نقل کی ہے) لکھا ہے:

ومن اعجب الاشیاء قولھم "ھذا کذب لہ" وھذا اجھل منھم بلسان العرب وخطاب الشرع فان کل ذلک عندھم کذب علیہ[1]	اور عجائبات میں سے ان کا یہ قول بھی ہے کہ یہ تو کذب للرسول (آپ کے حق میں کذب) ہے نہ کہ کذب علی الرسول (آپ پر کذب) حالانکہ یہ کلام عرب اور شریعت کے انداز تخاطب سے ناواقفیت

کی دلیل ہے اس لیے کہ یہ سب کا سب محاورۂ عرب اور اصطلاح شرع میں کذب علی الرسول ہی ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے شیخ زکریا کے حوالے سے لکھا ہے:

لیس للفظ علی مفھوم لانہ لا یتصور ان یکذب لہ اذ ھو منھی عنہ مطلقا، و نقل الابھری عن الکرمانی: کذب علیہ نسب الکلام الیہ کاذبا سواء کان علیہ اولہ۔ (لمعات ج ۱ ص۲۵۳)	یہاں لفظ علی کا کوئی مفہوم نہیں ہے اس لیے کہ کذب للرسول کے کوئی معنی ہی نہیں۔ کذب تو علی الاطلاق ممنوع ہے اور ابہری نے علامہ کرمانی سے نقل کیا ہے کہ لفظ کذب علیہ کا مطلب ہوتا ہے اس کی طرف جھوٹ کی نسبت کی خواہ وہ کذب علیہ ہو یا کذب لہ

ان لوگوں نے اپنے اس استدلال کی بنیاد لفظ علی پر رکھی ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہ استدلال محاورۂ عرب سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتا بلکہ ایک زبردستی کی کھینچ تان ہے۔ تاہم اب دو روایتیں ایسی نقل کی جاتی ہیں جن میں سرے سے لفظ علی کا وجود ہی نہیں ہے بلکہ مطلق کذب کی ممانعت کی گئی ہے۔

(۱) من حدث عنی حدیثا یری انہ کذب	جو شخص میرے حوالے سے کوئی حدیث بیان

---

[1] شرح مسلم للنووی ج ۱ ص۸

فھو احد الکاذبین۔ (رواہ مسلم والترمذی ومحمد عن المغیرہ بن شعبہ) ؎۱

کرے اور وہ جانتا ہو کہ یہ جھوٹ ہے تو وہ بھی جھوٹوں میں کا ایک جھوٹا ہے۔

ایک دوسری حدیث میں ہے:۔

(۲) والذی نفس ابی القاسم بیدہ لا یروی عنی احد مالم اقلہ الا تبوأ مقعدہ من النار (رواہ الدارقطنی فی الافراد عن انس رضی اللہ عنہ) ؎۲

اس ذات پاک کی قسم جس کے قبضہ میں ابوالقاسم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے جو بھی شخص میری طرف سے کوئی ایسی بات بیان کرے جو میں نے نہیں کہی وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے۔

ان حدیثوں کے الفاظ بالکل عام ہیں ان کی رو سے جس مقصد کے لیے بھی وضع حدیث کا ارتکاب کیا جائے گا وہی ناجائز اور حرام قرار پائے گا اس لیے کہ کذب وہ بہرحال ہے مقصد خواہ اس کا کچھ بھی ہو۔

اور علامہ نووی نے شرح مسلم میں واضح طور پر لکھا ہے کہ موضوع کا جان بوجھ کر نقل کرنا حرام ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں:۔

لا فرق فی تحریم الکذب علیہ صلی اللہ علیہ وسلم بین ما کان فی الاحکام ومالا حکم فیہ کالترغیب والترھیب والوعظ وغیر ذالک من انواع الکلام فکلہ حرام من اکبر الکبائر واقبح القبائح باجماع المسلمین الذین یعتد بھم فی الاجماع

حدیث و شریعت میں کذب مطلقاً حرام ہے بغیر اس فرق کے کہ وہ احکام کا معاملہ ہے یا ترغیب و ترہیب اور وعظ و نصیحت کا موضوع ہے۔ حدیث میں جھوٹ بولنا حرام اور سخت [illegible] کا کبیرہ گناہ اور نہایت قبیح قسم کی بدعملی ہے اور ان تمام اہل اسلام کا اجماعی فیصلہ ہے جن کا اجماع معتبر ہے۔

؎۱ الموضوعات الکبیر ص ؎۲ ایضاً۔

اس کے بعد علامہ نووی فرماتے ہیں :۔

وقد اجمع اھل الحل والعقد علی تحریم الکذب علی آحاد الناس فکیف بمن قولہ شرع وکلامہ وحی والکذب علیہ کذب علیہ تعالیٰ [1]

اور ارباب حل وعقد کا اجماعی فیصلہ ہے کہ جھوٹ بولنا عام لوگوں کے بارے میں بھی حرام ہے چہ جائیکہ اس ذاتِ گرامی کے بارے میں جن کا کلام شریعت و وحی ہے اور جس کے متعلق جھوٹ بولنا در حقیقت خدائے تعالیٰ کے بارے میں جھوٹ بولنا ہے۔

یہ علمائے اسلام کا وہ صاف و صریح فیصلہ ہے جس پر ہمیشہ سے اہلِ علم کا عمل رہا ہے اب جو کوئی اس کے خلاف کوئی رائے پیش کرے وہ ہرگز قابلِ التفات نہیں اور اگر اس طرح کی تھوڑی بھی گنجائش اہلِ علم نے دی ہوتی تو آج پورے ذخیرہ حدیث سے اطمینان اٹھ چکا ہوتا اس لیے کہ ہر حدیث کے بارے میں یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ یہ بھی شاید اسی قسم کی ہو۔ اور بقول امام غزالیؒ پوری شریعت مشکوک ہو کر رہ جاتی [2]

اور یہاں شیخ عز الدین بن عبد السلام کا جو قول نقل کیا گیا ہے اس کے متعلق یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ اس موقع کے لیے قطعاً نہیں ہے بلکہ جھوٹ بولنے کی یہ گنجائش علما محققین نے ایسے موقع پر دی ہے جبکہ کسی کا کوئی حق مارا جا رہا ہو یا دو بھائیوں میں جھگڑا ہو یا میاں بیوی میں نااتفاقی ہو اور جھوٹ بولے بغیر حق کی ادائیگی اور باہمی صلح و صفائی نہ ہو سکتی ہو چنانچہ امام غزالیؒ نے اس کی مثال دیتے ہوئے لکھا ہے :۔

مثل ان یاخذ ہ ظالم ویسألہ عن مالہ فلہ ان ینکرہ او یسألہ السلطان عن

اس کی مثال یوں سمجھو کہ کسی ظالم نے ایک شخص سے پوچھا کہ بتا تیرے پاس کتنا مال ہے۔ اور

---

[1] شرح مسلم للنووی ج ۱ صـ ۸ وعنہ علی القاری فی الموضوعات الکبیر صـ ۹

[2] احیاء علوم الدین للغزالی ج ۳ صـ ۱۲۱

فاحشة بينهٗ وبين الله تعالیٰ ارتكبها فله ان ينكر ما يقول ما زنيت اوما شربت مثلا وان يُسئل عن سرِّ اخيه فينكره ونحو ذلك [۱]

اس کا مقصد یہ ہے کہ جبراً اس سے چھین لے تو اس وقت اس شخص کو یہ کہنے کی گنجائش ہے کہ میرے پاس کچھ نہیں ہے یا یہ کہ حاکم وقت نے ایک شخص کی کسی ایسی بدفعلی کے متعلق سوال کیا جو اس کے اور خدا کے درمیان کا معاملہ ہے (یعنی کسی انسان کو اس کا علم نہیں ہے) تو یہ شخص انکار کرسکتا ہے۔ مثلاً یہ کہہ سکتا ہے کہ میں نے زنا نہیں کیا یا میں نے شراب نہیں پی۔ یا اس سے اس کے مسلمان بھائی کا راز پوچھا جا رہا ہے تب بھی یہ انکار کرسکتا ہے۔

اور ایسے موقع کے متعلق بھی علامہ نووی نے لکھا ہے کہ :-

والاحتياط فی هذا كله ان يورّی ومعنی التورية ان يقصد بعبارته مقصوداً صحيحا ليس هو کاذبا بالنسبة اليه وان كان كاذبا فی ظاهر اللفظ وبالنسبة الى ما يفهمه المخاطب [۲]

احتیاط اسی میں ہے کہ توریہ کیا جائے۔ اور توریہ اس کو کہتے ہیں کہ ایسے الفاظ میں گفتگو کی جائے کہ بولنے والے کے اپنے خیال کے لحاظ سے اس کی مراد صحیح ہو۔ اگرچہ ظاہر میں اور سننے والے کے خیال کی رو سے وہ صحیح نہ ہو۔

---

[۱] احیاء العلوم ج ۳ ص ۱۲۰ ونقل عنه النووی فی الاذکار ص ۳۲۸

[۲] ریاض الصالحین ص ۵۶۶ (مطبعة عیسی البابی الحلبی مصر) وکتاب الاذکار ص ۳۲۷ (مطبعة حجازی قاهرة)

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

بُرہان

مرتب

سعید احمد اکبرآبادی

مصباح اللغات

مکمل عربی اردو ڈکشنری

مرتبہ

ابوالفضل مولانا عبدالحفیظ بلیاوی

قیمت

اٹھائیس روپے

ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی

بُرہان

جلد ۷۰ | ربیع الاول ۱۳۹۳ھ مطابق اپریل ۱۹۷۳ء | شمارہ ۴

نظرات

۱۰ر۱۱ر مارچ کو دہلی میں "آل انڈیا مسلم یونیورسٹی کنونشن" جس شان و شوکت سے انعقاد پذیر ہوا اس سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ "مسلم یونیورسٹی علی گڑھ" کے مسئلہ نے ملت کے ہر طبقہ کو بے چین و مضطرب کر دیا ہے اور وہ کسی حالت میں بھی اپنے اس ملی سرمایہ سے دستکش ہونے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس اجتماع کے تاریخی فیصلوں سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ مسلم یونیورسٹی کا مسئلہ صرف مسلمانوں کا نہیں بلکہ تعلیم کی آزادی اور جمہوریت کی بقاء و تحفظ کا مسئلہ ہے یہی وجہ ہے کہ اس کنونشن میں ملک کی مختلف جمہوری پارٹیوں کے نمایندے اور آزادیٔ تعلیم کے حامی ذمہ دارانہ حیثیت سے شریک ہوئے۔ نہ صرف شریک ہوئے بلکہ اپنے خیالات کا بے باکی اور صفائی سے اظہار کیا قبرستان مہدیان کے روحانی تاریخی میدان میں جس پر دو روز کے لئے چمنستان کا گمان ہونے لگا تھا ملک کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے چھ سو کے قریب نمائندوں نے بھرپور حصہ لیا اور ایک آواز ہو کر سنجیدہ اور باوقار فیصلے کیے۔

صدر اجلاس جسٹس بشیر احمد صاحب کا فاضلانہ خطبہ اور مولانا سید ابوالحسن علی میاں کا افتتاحیہ بھی اس اجلاس کی خاص تاریخی دستاویزیں ہیں جن سے مسلم یونیورسٹی کے مسئلہ کا ایک ایک گوشہ واضح ہو جاتا ہے۔

اس خاص اجتماع کے علاوہ شہر میں ڈھائی عام اجتماعات بھی ہوئے جن میں باشندگان شہر ذوق و شوق سے شریک ہوئے اور کنونشن کے فیصلوں کی تصدیق کی یہ کنونشن دار الحکومت کے اجتماعات کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔

یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ میں "مسلم یونیورسٹی علی گڑھ" نے ایک عظیم جلیل دانش گاہ کی حیثیت سے جو بے مثال تعلیمی، علمی اور فکری کردار ادا کیا ہے تعلیمی درسگاہوں کی تاریخ میں وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس کے فیض یافتہ فرزندوں نے کم و بیش ایک صدی تک علم و تہذیب کی جو

ولولہ انگیز خدمت انجام دی دوسرے اسلامی ملکوں میں بھی اس کی نظیر مشکل ہی سے ملے گی اس لیے قدرتی طور پر مسلمان حکومت کے اس جابرانہ اقدام اور طرز عمل کے خلاف متحد ہو گئے ہیں جو اس نے یونیورسٹی کے متعلق اختیار کیا ہے بے شبہ ایک "آزاد مسلم یونیورسٹی" شروع ہی سے اس کے عالی ہمت بانی کا نصب العین تھا۔ اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے سرسید مرحوم کے جانشینوں نے تن من دھن کی بازی لگا دی لاکھوں روپے جمع کر کے برطانوی حکومت کی ایک ایک شرط کو پورا کیا اور بالآخر اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔

۱۹۲۰ء میں جب یونیورسٹی ایکٹ وجود میں آیا تو حکومت نے "ایم۔ اے۔ او کالج" کو یونیورسٹی کا شیپ اور روپ دیا اور مسلمانوں کے زیر انتظام و انصرام یونیورسٹی قائم ہو گئی، لیکن کیا یہ روپ اس لئے دیا گیا تھا کہ نصف صدی کے بعد محض اصطلاحی جھگڑوں اور پھندوں میں پڑ کر اس دانش گاہ کے پورے سرمایہ پر قبضہ کر لیا جائے اور اس کی روایات خاک میں ملا دی جائیں۔

سرسید اور ان کے ایثار پیشہ جانشین آج زندہ ہوتے تو حکومت کے دئے ہوئے اس عطیے کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیتے اور صاف کہدیتے کہ

ہمیں یک حرف از یونیورسٹی مدعا باشد ۔۔۔ کہ ایں سر رشتہ تعلیم مادر دست ما باشد

حکومت کو کان کھول کر سن لینا چاہیے کہ مسلمانوں کو ایسے جامِ جم کی ہرگز ضرورت نہیں ہے جس پر ان کا اختیار اور قابو نہ ہو۔ وہ اِس جامِ جم کے مقابلے میں اُس جامِ سفال کو محبوب رکھتے ہیں جس پر ان کا اختیار ہو اور جو ان کا اپنا ہو۔ افسوس ہے حاشیہ نشینوں نے حکومت کو غلط مشورے دے کر ایک ایسے جال میں پھنسا دیا جس سے نکلنا بھی اب آسان نہیں رہا ہے ہمارا مشورہ یہ ہے کہ حقائق کو سامنے رکھکر مدبرانہ قدم اٹھایا جائے! ایسا قدم جو اس ملک کی شاندار روایت کے مطابق ہو۔

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر ۔۔۔ تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریف سنگ

برادر عزیز مولانا سعید احمد مدیر برہان کا جنوبی افریقہ سے جو مکتوب آیا ہے اس کے جستہ جستہ حصے قارئین برہان کی خدمت میں پیش کئے جاتے ہیں۔ اس مکتوب سے مولانا کی سرگرمیوں پر ہلکی سی روشنی پڑتی ہے جس سے قارئین برہان کی معلومات میں اضافہ ہوگا۔

دو ہفتے سے صوبہ ٹرانسوال کے دورہ پر ہوں۔ دورہ کی صورت یہ ہے کہ ٹرانسوال کے مختلف علاقوں کے مسلمانوں کی خواہش اور دعوت کے مطابق دورہ کا پروگرام مرتب کر کے شائع کر دیا گیا ہے جس کے مطابق روزانہ تقریباً پچاس ساٹھ میل کار میں سفر کرتا ہوں۔ انتظامات کا انچارج بحیثیت سکریٹری میرے ساتھ رہتا ہے جس جگہ کا پروگرام ہوتا ہے وہاں سے کوئی صاحب کار لے کر آجاتے ہیں اور میں ان کے ساتھ معہ اپنے سکریٹری کے وہاں روانہ ہو جاتا ہوں بڑے بڑے استقبالیے ہوتے ہیں عشا کے بعد تقریر ہوتی ہے اللہ کا شکر ہے کہ تقریر سوا ڈیڑھ گھنٹہ انگریزی میں ہوتی ہے بوڑھے، جوان، مرد، عورت سب بڑی تعداد میں شریک ہوتے ہیں۔ تقریر کے بعد جب جائے قیام پر واپس آتا ہوں تو بہت سے بوڑھے اور جوان اپنی اپنی کاروں میں میرے پاس آجاتے ہیں میزبان کی طرف سے ان سب کی خاطر تواضع پھلوں، مٹھائیوں، کافی اور چائے سے ہوتی ہے ساڑھے گیارہ بارہ بجے تک یہ لوگ گفتگو کرتے ہیں اور پھر رخصت ہو جاتے ہیں۔ ان مصروفیتوں کے باعث معمولات میں بڑا فرق آگیا ہے آب و ہوا اچھی اور ماحول دل پسند اس لیے صحت پر کوئی ناگوار اثر نہیں۔

۱۸ اپریل سے ۱۰ مئی تک صوبہ نٹال جس میں ڈربن بھی ہے اس کا دورہ کرونگا۔ اس کے بعد ۱۱ مئی سے ۲۶ مئی تک کیپ ٹاؤن کا۔ آپ خط جوہانسبرگ کے پتہ ہی سے بھیجتے رہیں میں جہاں بھی ہوں گا وہیں تمام خطوط وقت پر مل جائیں گے۔ سوائے اس وقت کے جو سفر میں یا سونے میں گذرتا ہے اور کوئی وقت بالکل خالی نہیں ہے۔ ہر وقت لوگوں کا ہجوم رہتا ہے اس لیے برہان کے لیے تو کیا لکھتا خط لکھنے تک کی فرصت نہیں ہے۔ جوہانسبرگ میں مولوی محمد نانا صاحب اور مولوی اسماعیل گاروی صاحب دونوں سے روزانہ ملاقات ہوتی تھی دونوں نے بڑی محبت کا معاملہ کیا۔ مولانا محمد میاں مرحوم کا پورا خاندان پہلے ہی سے بڑا مہربان ہے۔ جنوبی افریقہ میں ڈابھیل اور علی گڑھ کے تعلق سے میرے شاگرد جگہ جگہ ملتے ہیں اور بڑی محبت سے پیش آرہے ہیں۔ یہاں کے لوگ اصرار کر رہے ہیں کہ میں اپنی کتابوں خصوصاً صدیق اکبر، مسلمانوں کا عروج اور زوال، وحی الٰہی وغیرہ کا انگریزی ایڈیشن شائع کراؤں ہر طرح سے یہ لوگ اعانت کے لئے تیار ہیں۔ یہ گفتگو ابھی ابتدائی منزل میں ہے۔

رسول شاہد و مشہود

(۸)

(از جناب قاری بشیر الدین صاحب پنڈت ایم اے)

زیرِ نظر مضمون "رسول شاہد و مشہود" میں اب تک یہودی، عیسائی، پارسی اور ہندو بھائیوں کو غور و فکر کی دعوت دی گئی تھی مقالہ کے اس حصہ میں سکھ بھائیوں کو دعوتِ فکر دی جا رہی ہے۔

تمہید اما بعد اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے پیارے حبیب جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تمام انبیاء کرام، وخشورا ور رشیوں منیوں سے از آدم تا حضرت عیسیٰ علیہم السلام روزِ ازل جو عہد لیا تھا کہ وہ جب دنیا میں تشریف لائیں تو تم ان پر ایمان لانا اور آں کی مدد کرنا اس عہد کو ان تمام واجب التعظیم اور واجب الاحترام برگزیدہ ہستیوں نے کس طرح پورا کیا اس کا اندازہ آپ کو اس ناچیز کی تازہ تالیف "شاہد و مشہود" سے ہو سکتا ہے۔ آج کی صحبت میں عرض کرنا یہ ہے کہ آپ کی بعثت کے بعد بھی جو بزرگ خدا رسیدہ اور صاحبِ کرامات ہوئے ہیں ان سب کے مدارجِ علیا پر فائز ہونے کا راز آنحضورؐ کی رسالت کا اقرار اور آپ کی ہدایات پر عمل کرنے میں مضمر ہے اس لئے کہ بقول حضرت شیخ سعدی علیہ الرحمۃ ؎

خلافِ پیمبر کسے رہ گزید　　　　کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید

یعنی آنحضورؐ کی اتباع کے بغیر کوئی بھی منزلِ مقصود تک نہیں پہونچ سکتا۔ مرحوم و مغفور الحاج

حضرت مولانا عبدالحامد صاحب قادری البدایونی ثم کراچوی نے بالکل صحیح فرمایا ہے ؎

نبی کو جہاں میں یہ عزت ملی ہے نبیؐ کے لئے ساری دنیا بنی ہے
یہ سب گل ہیں گلزارِ طیبہ کے حامد کوئی سنجری ہے کوئی قادری ہے

بالفاظ دیگر پاور ہاؤس مدینہ منورہ میں تاقیام قیامت قائم کر دیا گیا ہے، وہیں سے کرنٹ دوڑ رہا ہے اور تمام دنیا کے بلب اور راڈ حسبِ استطاعت اسی سے روشنی حاصل کر رہے ہیں۔ البتہ آسانی کی غرض سے جابجا "سب اسٹیشن" (Sub - Station) قائم ہیں کہیں قادری و سہروردی کے نام سے، کہیں چشتی، نظامی و صابری کے نام سے اور کہیں نقشبندی۔ و مجددی اور دوسرے ناموں سے، ننکانہ صاحب کا "سب اسٹیشن" بھی منجملہ ان میں سے ایک ہے یہ میرا یقین ہے جیسا کہ سطور ذیل سے ظاہر ہوگا۔ یہ دوسری بات ہے کہ امتداد زمانہ نے اس کی اصلی ہیئت و حیثیت کو کچھ اس طرح بدل دیا ہے کہ اصل حقیقت نگاہوں سے اوجھل ہوگئی جو مذہب کے نام پر سیاسی کھیل کے مرہونِ منت ہے جیسا کہ صاحب "تحفۃ الہند" کا خیال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شری گرونانک جی کی جماعت جو خدا پرستوں کی جماعت تھی اصل راستہ سے دور جا پڑی۔ کاش کہ ہمارے سکھ بھائی سنجیدگی کے ساتھ اس حقیقت پر غور کریں اور بابا نانک جی کی تعلیمات کو اپنا کر اُن کے رنگ میں رنگ جائیں کہ جو سراپا اللہ اور اس کے رسول کے عشق و محبت کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔

پیدائش و بچپن کا حال

بابا گرونانک جی تلونڈی (ننکانہ صاحب) کے ایک کھتری گھرانے میں پیدا ہوئے۔ والد صاحب کا نام مہتہ کالوچند اور ماتا جی کا نام شریمتی ترپتا جی تھا۔ ۱۵ر اپریل ۱۴۶۹ء تاریخ پیدائش ہے اور تاریخ وفات ۲۲ر ستمبر ۱۵۳۹ء یعنی ۷۰ سال ۵ ماہ اور سات دن اِس دنیائے فانی میں گذار کر حیاتِ جاودانی حاصل کی۔ بچپن ہی سے طبیعت کا ایک نرالا انداز تھا۔ دوسرے بچّوں کے ساتھ کھیل کود، دھینگا مشتی و شرارت کی بجائے سب سے الگ تھلگ اور خاموش رہتے تھے۔ فکر اور طلب حق کا مادہ شروع ہی سے پایا جاتا تھا بزرگ

اور نیکوں کی صحبت میں بیٹھنا اور یاد الہٰی میں وقت گذارنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ آپ کی محبت الہٰی اور ذکر اللہ میں محویت کا یہ عالم تھا کہ آپ کے والد بزرگوار نے جب آپ کو تجارت کے لئے کچھ رقم دی اور آپ کو سفر پر روانہ کیا کہ کچھ نفع کما کر لائیں تو راستہ میں اتفاق سے چوڑ کانہ مقام پر آپ کی ملاقات چند فاقہ کش درویشوں سے ہوئی۔ معاً دل میں خیال آیا کہ یہ میرے معشوق حقیقی کے بندے ہو کر بھوکے کیسے ؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرا مولیٰ مجھ سے سوال کر بیٹھے کہ اے نانک! تجھے میرے کچھ بھوکے بندے بھی ملے تھے تو کیا اس محبت کا جو میری تیرے دل میں ہے یہ تقاضا نہ تھا کہ تو میرے بھوکے انسانوں کی بھوک دور کرنے کی خاطر دنیاوی تجارتوں کی قربانی میرے حضور میں پیش کرتا ؟ اسی تصور کا یہ نتیجہ تھا جو تاریخ میں "سچا سودا" کہلاتا ہے۔ آپ نے اپنی تجارتی رقم سے اُن فاقہ کش درویشوں کی خورد و نوش کا انتظام کیا اور خالی ہاتھ گھر لوٹ آئے لیکن محبت الہٰی کی حقیقی دولت سے مالا مال ہو کر اور پر سکون قلب کے ساتھ اَلَا بِذِکۡرِ اللّٰہِ تَطۡمَئِنُّ الۡقُلُوۡبُ کا عملی نمونہ بن کر[1]۔ آپ کے والد بزرگوار مہتہ کالو جی نے جن کی نظر میں مادی منفعت ہی نفع کا سودا ہو سکتی تھی آپ کو خالی ہاتھ دیکھ کر غصہ کا اظہار کیا اور سختی سے پیش آئے تو اس پر تلونڈی کے نواب رائے بلار نے آپ کو اپنی پناہ میں لے لیا اور شری کالو جی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

> "جب تک نانک بچہ ہے تب تک اس کی خدمت ہم کریں گے ..... اس کا خرچ بھی (اپنی تنخواہ کے ساتھ ساتھ) ہم سے لے لیا کرو۔ جتنا روپیہ تیرے گھر کا نانک نے ضائع کیا ہے وہ بھی ہم سے لے لو۔"

(بحوالہ جنم ساکھی بھائی بالا صفحہ ۳۷)

---

[1] قلوب کے اطمینان کا حقیقی ذریعہ تو ذکر الہٰی ہی ہے۔ اس کے متعلق گرو نانک جی کے تصورات کے لئے ملاحظہ ہوں۔ سری راگ محلہ ۱، بسنت محلہ ۱، وار سارنگ محلہ ۱، آسا محلہ ۱ وغیرہ وغیرہ۔

مختصراً یہ کہ بچپن ہی سے آپ پر عشق الٰہی کا جو جذبہ طاری تھا اس کو صاحب نظر ہی پہچان سکتا تھا ورنہ عوام تو اسے خلل دماغ پر محمول کرتے تھے ۔ چنانچہ لوگوں کے کہنے سننے سے مہتہ کالوجی نے کسی وئید کو بلا کر دکھایا تو عشق الٰہی کے اس متوالے نے وئید کو مخاطب کرکے کہا :

ے　وئید بلایا وئید گی پکڑ ڈھنڈولے بانہہ
بھولا وئید نہ جانئی کرک کرتیجے مانہہ

یعنی طبیب کو علاج کے لئے بلایا گیا ہے جو نبض کو ٹٹول کر مرض تلاش کرنا چاہتا ہے مگر یہ سادہ لوح طبیب کیا جانے کہ کلیجہ میں عشق حقیقی کا درد ہے جس سے یہ دنیادار طبیب ناآشنا ہے اور اس کو اس کی خبر نہیں ۔

اس سلسلے میں یہ واقعہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے جو دوران ملازمت سلطان پور میں نواب دولت خاں لودھی کے مودی خانہ سے متعلق ہے ۔ ایک مرتبہ غلہ وزن کرکے لوگوں کو دے رہے تھے اور ہر تول پر حسب معمول اس کا شمار یاد رکھنے کے لئے بلند آواز سے ایک ہی ایک ، دوئی دو وغیرہ بھی کہتے جاتے تھے ۔ جب تیرہ عدد کا نمبر آیا تو اس عدد سے آپ پر خدائی عشق و محبت کا ایسا غلبہ ہوا کہ ہر اگلی تول پر زبان سے بس " تیرا ہے تیرا " نکلتا تھا یہاں تک کہ پورا ڈھیر تول کر ختم کر دیا ۔ اس عالم جذب یا عالم محویت میں جو مزہ گرو جی کو آیا وہ صرف اہل دل سمجھ سکتے ہیں یہ مطلب یہ تھا کہ اے خدا میں بھی تیرا ہوں یہ غلہ بھی تیرا ہے اور اس کا لینے والا یہ غریب انسان بھی تیرا ہی بندہ ہے اس لئے اس کی یاد میں ایسے مگن ہوئے کہ اگلا عدد ہی بھول گئے ۔ اس واقعہ کے بعد ملازمت ترک کردی ۔

ابتدائی تعلیم و تربیت

۷ سال کی عمر میں پنڈت گوپال سے ہندی پڑھنا شروع کی اور تین سال تک ہندی ہی سیکھتے رہے چونکہ ذہین و محنتی تھے اس لئے اب ساتھ ساتھ سنسکرت کا سبق بھی ہونے لگا ۔ سنسکرت کے معلم پنڈت برج لعل تھے ۔ غرضیکہ ۱۳ سال کی عمر تک ہندی و سنسکرت کا سلسلہ جاری رہا ۔ اس سلسلے میں مجھے ان لوگوں کی رائے سے قطعی کوئی اتفاق نہیں جو گرو جی کے متعلق یہ

کہتے ہیں کہ ان میں علمیت کچھ بھی نہ تھی، وہ وید آدی، شاستر اور سنسکرت کچھ بھی نہیں جانتے تھے...
ان گنواروں کے سامنے جنھوں نے سنسکرت کبھی سنی بھی نہیں تھی سنسکرتی ستوتر (گرنتھ صاحب) بناکر سنسکرت کے پنڈت بھی بن گئے ہوں گے یہ بات اپنی بڑائی، عزت اور شہرت کی خواہش کے بغیر کبھی نہ کرتے۔ ان کو اپنی شہرت کی خواہش ضرور تھی، نہیں تو جیسی زبان جانتے تھے کہتے رہتے اور یہ بھی کہہ دیتے کہ میں سنسکرت نہیں پڑھا.... ورنہ گرنتھ صاحب میں ویدوں کی تعریف اور مذمت کا معجون مرکب نہ ہوتا۔ اگر وہ ویدوں کی تعظیم کرتے تو ان کا فرقہ نہ چلتا نہ وے گرو بن سکتے تھے کیونکہ جب سنسکرت پڑھی ہی نہ تھی تو پھر دوسرے کو پڑھا کر اپنا شاگرد کس طرح بنا سکتے تھے (ملاحظہ ہو ستیارتھ پرکاش اُردو ترجمہ ص۳۷۹ تا ص۳۸۰ بحوالہ نانک شاہ ص۶۸ و ص۶۹)

اس کے بعد مولوی قطب الدین صاحب سے فارسی کی تعلیم پائی۔ مولوی صاحب کی اخلاقی و روحانی تعلیم سے آپ بہت متاثر ہوئے۔ بچپن میں "سچا سودا" کا واقعہ اسی اخلاقی تعلیم کے زیر اثر تھا جیسا کہ بتایا جا چکا ہے۔ آپ کے والد صاحب آپ کی افتاد طبع سے بہت بیزار و پریشان تھے اس لئے ان کی بہن نانکی جی انھیں اپنے ساتھ سلطان پور لے گئیں۔ جہاں وہ دولت خاں لودھی کے مودی خانہ کے منتظم مقرر ہو گئے۔ دس سال ملازمت کی۔ اٹھائیس سال کی عمر میں "تیرا ہے تیرا" کا واقعہ سرزد ہوا اور آپ نے حالتِ جذب سے مغلوب ہو کر ملازمت ترک کر دی اور ۶ سال تک خانگی زندگی گزاری۔

شادی گرو نانک جی ہندو سنت اور سادھوؤں کی طرح رہبانیت کے قائل نہ تھے۔ سمبت ۱۵۴۳ بعمر ۱۷ سال شری مولچند کی لڑکی شریمتی لکشمی دیوی کے ساتھ شادی ہوئی۔ رائے بولار اور دولت خاں لودھی دونوں نے شادی میں حصہ لیا اور روپیہ پیسہ سے کافی مدد کی۔ شادی نہایت ٹھاٹ باٹ کے ساتھ ہوئی۔ شریمتی لکشمی دیوی سے دو لڑکے تولد ہوئے ایک کا نام سری چند اور دوسرے صاحبزادے کا نام لکشمی چند تھا۔ ۶ سال ملازمت ترک کرنے

کے بعد گھر پر رہے اس کے بعد ۳۴ سال کی عمر میں عوام کی اصلاح و درستی کے لئے گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور طول طویل سفر اختیار کئے۔ ان سفروں کو "اُداسیاں" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ ان سفروں میں "مردانہ ربابی" جو مسلمان تھا آپ کا رفیق سفر تھا۔ بالا جی کے متعلق اختلاف ہے جس کو دوسرا ساتھی بتایا جاتا ہے[۱]۔

سیر و سیاحت

۳۴ سال کی عمر میں سیاحت شروع کی۔ پہلے دورہ میں کوروکشیتر، کرنال، پانی پت، دہلی، متھرا اور نانک متا ضلع نینی تال (جہاں آجکل نانک ساگر بن گیا ہے) کی سیر کی۔ وہاں سے آگے بڑھ کر بنارس، پٹنہ، آسام اور اُڑیسہ کا دورہ کیا۔ ہر جگہ ذات پات اور غلط رسم و رواج کے خلاف لوگوں میں بیداری پیدا کرنے کی انتھک کوشش کی۔ راجستھان ہوتے ہوئے پنجاب لوٹے۔

(۲) دوسرا دورہ ۳۹ سال کی عمر میں دکھن کی جانب بیکانیر، اجمیر اور اُجین ہوتے ہوئے لنکا تک کیا۔ واپسی میں دوارکا کے پنڈتوں اور سندھ کے صوفیاء کرام سے تبادلۂ خیال کیا۔ ملتان میں چلہ کشی کے بعد وطن واپس آئے اور ہندو مسلم ہم آہنگی و یکجہتی کے لئے کوشش کی

---

[۱] موجودہ زمانہ کے سکھ محققین کی یہ متفقہ رائے ہے کہ بھائی بالا جی کا وجود فرضی ہے اس لئے کہ گرد گرنتھ صاحب کی وار بھاگڑا میں تین اشلوک بھائی مردانہ کے متعلق درج ہیں لیکن بالا جی کے نام پر کوئی اشلوک درج نہیں (۲) بھائی گرو داس جی نے مردانہ کے علاوہ اپنی واروں میں کسی تیسرے ساتھی کا ذکر نہیں کیا جو سفر بغداد میں آپ کے ساتھ ہو (۳) ایک سکھ ودوان پروفیسر منکو جی کی بھی یہی رائے ہے کہ بالا جی آپ کا ہمسفر کبھی بھی نہیں رہا۔ (۴) ایک مشہور مورخ کرم سنگھ جی نے اپنی کتاب "کتک کہ وساکھ" میں قوی دلائل دے کر یہ ثابت کیا ہے کہ گورو بابا نانک جی کا ایک ہی ساتھی بھائی مردانہ تھا اور بھائی بالا ایک فرضی وجود ہے۔ (مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو اخبار اجیت جالندھر ۱۱ر اگست ۱۹۶۸ء نیز ہفت بدر قادیان صـ ۲۰ر نومبر ۱۹۶۹ء)

اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ایک مشترک لنگر خانہ جاری کیا جہاں ہر ملت و مذہب والے باہم اکٹھا بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ یہ ایک اصلاحی خانقاہ تھی جس میں دس سال تک اصلاح و تربیت کا سلسلہ جاری رہا۔ گرو نانک جی لوگوں کو تلقین کرتے تھے کہ وہ آنحضورؐ کے بنائے ہوئے معاشرہ کو اختیار کریں تاکہ آپس کی تفریق کو خیرباد کہہ کر لوگ ایک سیسہ کی پلائی ہوئی دیوار بن جائیں۔ اسلامی معاشرہ کے لئے اس ناچیز کی مولفہ کتاب "معلم اعظم" کا مطالعہ فرمائیں۔

(۳) آپ کا تیسرا دورہ ۴۷ سال کی عمر میں سکم، تبت اور چین کی طرف ہوا۔ اس سفر میں آپ نے مانسرور کے ان جوگیوں اور سادھوؤں سے ملاقات کی جو اپنے من کی شانتی کے متلاشی تھے اور جو گرہستی اور گرہستھ زندگی کو ترک کرکے عوام سے بالکل یکسو اور بے خبر تھے۔ انھیں آپ نے سمجھایا کہ عوام کو چھوڑ کر صرف اپنے نجات کی فکر کرنا انتہائی خودغرضی ہے۔ دنیا میں رہ کر گھر کی زندگی کو درست کرنا تاکہ عوام کی اصلاح ہو اصل دھرم ہے۔

(۴) چوتھا دورہ ۵۱ سال کی عمر میں بلاد اسلامیہ کی طرف تھا۔ بغداد اور حرمین شریفین کی زیارت کی۔ مصر اور ترکی کا دورہ کیا پھر ایران و افغانستان ہوتے ہوئے ۳ سال کے بعد ہندوستان واپس آئے اور ۱۵۷۹ سمبت بکرمی سے گروجی کرتار پور کو اپنا مستقر بنا کر رہنے لگے۔ اسی سال آپ کے والدین کا انتقال ہوا۔

شری گورو نانک جی اور مسلمان

گرو نانک جی کے پوتر جیون کا ایک روشن پہلو جو ہمیں نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ آپ بچپن سے لے کر وفات تک مسلمانوں کے اندر رہے۔ ان سے محبت کی اور ان کی محبت کو پایا۔ چنانچہ اتہاس کے مطالعہ سے مندرجہ ذیل حقائق روز روشن کی طرح عیاں ہیں:

(۱) گروجی نے ہندی بھی پڑھی اور سنسکرت بھی لیکن فارسی کی تعلیم سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے۔ مولوی قطب الدین صاحب آپ کے اخلاقی و روحانی معلم اول تھے۔ سید غلام حسین حسنی طباطبائی کی روایت کے بموجب "نانک در عہد طفلی حسنے و صباحتے باہم کہ مایہ استعداد ولیا قتے

خداداد داشت و سید حسن نام درویشے صاحب حال و قال بر نانک مذکور نظر توجہ داشتہ ہمت بر تربیت می گماشت، بفیضِ صحبت درویش حقیقت کیش فی الجملہ شعور و دانش بہم رسانیدہ و بر حقائق و معارف کہ کتب فقرائے اسلام و صوفیائے ذوی الاحترام بآں مشحون است اطلاع حاصل نمود و از تعصب کیش آبائی خود در گذشتہ مضامین اقوال آں بزرگواراں بزبانِ پنجابی کہ داشت در بحور اشعار ہندی[1] موزوں می نمود و اشعار و کلمات او فراہم آمدہ صورت کتابے گرفت و نام آں کتاب گرنت انتاد۔ بیشتر اوضاع او مشابہ اوضاع فقرائے مسلمانِ ہند بود۔"

(سیر المتاخرین جلد ۲ صفحہ ۴۰۱)

یعنی گرونانک جی اپنے بچپن میں حسین و ملیح تھے اور خداداد استعداد و لیاقت رکھتے تھے۔ سید حسن

---

[1] تشریح در بحور اشعار ہندی موزوں می نمود:

گورونانک جی کا گرنتھ صاحب گورمکھی اور پنجابی زبان میں ہے۔ اس کے اشعار کو جن ہندی بحروں میں موزوں کیا گیا ہے اس سے دو باتوں کا پتہ چلتا ہے (۱) یہ کہ ہندو سماج میں ترنم کو درجۂ عبادت حاصل تھا اس لئے عوام کے ذوق و شوق کو ملحوظ رکھ کر ان کی اصلاح کے لئے (۲) یہ کہ دن اور رات میں گائے جانے والے راگ اور راگنیوں کی بحروں کو منتخب کیا گیا تاکہ لوگ جس وقت بھی فارغ ہوں اس وقت میں گائے جانے والے راگوں کو گرنتھ صاحب میں پڑھ کر فیض اٹھائیں مثلاً:

گرنتھ صاحب کی ابتدا "سری[1] راگ" سے ہوتی ہے جس کے گانے کا ٹائم ۴ بجے سے ۶ بجے شام تک ہے۔ یہی وقت "ایمن[2] کلیان" کا بھی ہے۔ اس کے بعد مختلف اوقات کے راگ کی بحریں ہیں مثلاً "باگیشوری[3]" اور "جونپوری[4]" کے گانے کا وقت ۶ تا ۸ بجے شام، جیجاونتی[5] ۸ تا ۱۰ بجے بوقت شب، مالکوس[6] ۱۰ تا ۱۲ بوقت شب، "کمودراگ[7]" نصف شب گذرنے کے بعد ۱۲ تا ۲ بجے، "درباری[8]"۔ کانڑا[9]۔ اور "بہاگ[10]" تینوں راگوں کا وقت ۲ تا ۴ بجے شب، "آسا[11]" اور "آساوری[12]" کے گانے کا وقت ۴ تا ۶ بجے فجر کے وقت تک، "بلاول[13]" ۶ تا ۸ بجے صبح، "بھیروں[14]" صبح کے وقت ۸ تا ۱۰ بجے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

نام کے ایک صاحب حال وقال بزرگ و درویش نانک جی پر نظر خاص رکھ کر ان کی تربیت کی طرف توجہ فرماتے تھے۔ اس حقیقت شناس درویشِ کامل کے فیضِ صحبت سے کچھ شعور و دانش پیدا ہو گیا اور ان حقائق و معارف پر جن سے مسلمان درویشوں اور قابل احترام صوفیوں کی کتابیں بھری ہوئی ہیں واقفیت حاصل ہو گئی اور اپنے آبائی متعصبانہ رویہ کو چھوڑ کر ان بزرگوں کے اقوال و مضامین پنجابی زبان میں جو ان کی مادری زبان تھی ہندی زبان کی بحروں میں اشعار

(بقیہ صفحہ گذشتہ) "ٹوڈی"[۱۵] راگ کا بھی یہی وقت ہے۔ "رام کلی"[۱۶] ۱۰ تا ۱۱؛ "شدھ سارنگ"[۱۷] ۱۱ تا ۱ بجے۔ "بھیروین"[۱۸] راگ کا کوئی مخصوص ٹائم نہیں ہر وقت گا سکتے ہیں۔

مذکورہ بالا اٹھارہ راگوں کی مختلف راگنیاں ہیں اور ان سب کی مجموعی تعداد ۸۴ ہے۔ موسم کے لحاظ سے گرنتھ صاحب میں "بسنت" کو موسم بہار کے لئے اور "ملہار" کو موسمِ برسات کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ان راگ راگنیوں کے سلسلہ میں عوام کے ذوقِ ترنم کے ساتھ ساتھ "مردانہ ربابی" کے فنِ نغمہ گوئی کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہو۔

گورو گرنتھ صاحب میں گورو انگد[۲]، گورو امر داس[۳]، اور گرو رام داس[۴] اور گرو ارجن[۵] کا کلام بھی شامل ہے گورو ہر گوبند[۶] گورو ہری رائے[۷]، اور گورو ہری کرشن[۸] یہ تینوں گرو اپنے پیشرو پانچوں گوروؤں کی بانی پر عمل کرتے رہے۔ ان کے بعد گورو تیغ بہادر[۹] نے ویراگ مئی انداز پر اور گورو گوبند[۱۰] نے جوش پیدا کرنے کے لئے رجزیہ اشعار پر اپنے کلام کو ترتیب دیا جو "دشم گرنتھ" کہلاتا ہے۔ یہ گرنتھ صاحب میں شامل نہیں ہے۔

گرنتھ صاحب میں یہ معلوم کرنے کے لئے کہ یہ کلام کس گورو کا ہے "محلہ" پر نمبر ڈال کر ظاہر کیا گیا ہے مثلاً سلوک محلہ ۱ کا مطلب یہ ہے کہ یہ گورو نانک جی کی بانی ہے اسی طرح سلوک محلہ ۲ سے مراد گورو انگد کا کلام۔ وقس ہذا۔

"وار" مترادف ہے رجزیہ اشعار کے جو لڑائی کے وقت گائے جاتے ہیں "جپ جی بانی" بھی گرنتھ صاحب ایک جز ہے جو مناجات کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسکو "پوڑی" یعنی قطعات میں تقسیم کر دیا ہے اور مفہوم میں نیاز پیدا کرنے کے لئے نمبروار ترتیب دیا ہے۔ اس طرح "وار" سلوک، محلہ اور پوڑی پر مشتمل ہیں۔

موزوں کرتے تھے ۔ نانک جی کے کلمات اور اشعار کو اکٹھا کرکے کتابی شکل دی گئی۔ اس کتاب کا نام "گرو گرنتھ" پڑ گیا۔۔۔۔ ان کے بیشتر طریقے ہند کے مسلمان درویشوں کے طریقوں کے موافق تھے

(۲) بابا نانک جی تلونڈی میں پیدا ہوئے وہاں کا جاگیردار رائے بولار ایک بھٹی راجپوت مسلمان تھا۔ بابا صاحب کے والد محترم مہتہ کالوجی اس کے گماشتے اور زمین کے منتظم تھے۔ رائے بولار نے بچپن ہی سے آپ میں غیر معمولی باتیں دیکھکر اندازہ لگا لیا کہ یہ ہونہار بچہ ہے اس لئے وہ خود بھی آپ سے دلی محبت رکھتا تھا اور عزت کرتا تھا اور آپ کے والد ماجد کو بھی آپ کے ساتھ محبت و شفقت کا برتاؤ کرنے کی تلقین کرتا تھا جیسا کہ واقعہ "سچا سودا" سے ظاہر ہے۔

(۳) گرو نانک جی دور و دراز کے سفروں سے جب تلونڈی واپس آتے تو رائے بولار آپ کی ہر ممکن خدمت کرتا تھا۔ ایک مرتبہ تلونڈی واپس آکر پانی کی قلت کا ذکر کیا تو رائے بولار نے فوراً "نانک سر" تالاب بنوا دیا۔ یہ تالاب بال لیلا گوردوارہ کے ساتھ ملحق اب بھی تلونڈی (موجودہ ننکانہ صاحب) میں موجود ہے ۔ رائے بولار نے بہت سی زمین بھی گرو جی کی نذر کردی۔ بال لیلا گوردوارہ کو ۱۹۰ مربع گز زمین وقف کی اور ۵۰ روپیہ سالانہ کی جاگیر خرچ کے لئے دی۔ اس طرح گوردوارہ کیارہ صاحب کو بھی بہت سی زمین دی (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو گرو دھام دیدار صہ۱۲۶ نیز نانک پرکاش صہ۲۹۶ مصنفہ بھائی بہادر سنگھ) گویا کہ رائے بولار پہلا شخص ہے جو آپ کا از اول تا آخر معتقد رہا اور وہ مسلمان تھا۔

(۴) رائے بولار نے مہتہ کالوجی کی طبیعت کو سخت گیر دیکھکر نانک جی کو ان کی بہن نانکی جی ہمراہ ان کے بہنوئی جے رام داس کے پاس سلطان پور بھجوا دیا اور وہاں کے نواب دولت لودھی سے سفارش کی "یہ (گرو نانک جی) خدا کا پیارا ہے اس کا خیال رکھا جائے ۔ چنانچہ نواب صاحب نے آپ کو اپنے مودی خانہ کا منتظم بنا دیا۔ اس زمانہ میں یہ نہایت اہم تھی جو صرف معتبر سے معتبر ترین شخص کے ہی سپرد کی جاتی تھی ۔ دس سال کی ملازمت کے "تیرا ہے تیرا" کا واقعہ رونما ہوا اور آپ نے حالت جذب میں ملازمت ترک کر دی۔ غرضیکہ

دولت خاں لودھی کو بھی آپ سے بڑی محبت و عقیدت تھی اور وہ بھی ایک مسلمان تھا۔

(۵) گرونانک جی کی شادی کے موقع پر رائے بولار اور دولت خاں لودھی دونوں نے روپیہ پیسہ اور ضروری سامان سے پوری پوری مدد کی اس سے بھی دونوں کی محبت و عقیدت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

(۶) جب ۱۵۲۶ء میں شہنشاہ بابر نے ایمن آباد (سید پور) پر حملہ کرکے اس کو فتح کرلیا تو اس کے سپاہی نانک جی کو بھی پکڑ کر بابر کے پاس لے گئے۔ بابر آپ کے چہرۂ مبارک کو دیکھکر بہت متاثر ہوا اور آزاد کرنے کے بعد درخواست کی کہ آپ جو چاہیں مجھ سے طلب کریں اس پر آپ نے جو جواب دیا اس سے آپ کی شانِ بے نیازی اور توکل علی اللہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ آپ نے فرمایا:

ایمان دیا اک خدائے جس کا دیا ہر کوئی کھائے
بندے کی جو لیوے اوٹ دین دُنی میں تاکو ٹوٹ
کہہ نانک سُن بابر میر تجھ سے مانگے سو احمق فقیر

(بحوالہ نانک پرلودھ صفحہ ۱۶۶ ماخوذ از رسالہ بدر ۱۲ر نومبر ۱۹۶۹ء)

البتہ ایک نیک خواہش کا اظہار کیا جو بجائے اپنے مخلوق کے لئے فائدہ کی تھی یعنی یہ کہ قیدیوں کو چھوڑ دیا جائے چنانچہ خواہش کی تعمیل میں قیدیوں کو رہا کر دیا گیا۔ بادشاہ نے عدل وانصاف سے حکومت کرنے اور گدی کا احترام ملحوظ رکھنے کا وعدہ کیا۔ آپ نے بابر بادشاہ کو دعا بھی دی تھی کہ تیری سلطنت بہت دنوں تک چلے گی۔ غرضیکہ بابر بھی آپ کی بزرگی سے متاثر تھا۔

{ ملخص تاریخ گورو صاحبان صفحہ ۹۹
نیز گورومت سدھاکر صفحہ ۳۰۷ }

(۷) حضرت گرونانک صاحب کے سفر وحضر میں ہر وقت ساتھ رہنے والا بھی ایک مسلمان تھا وہ آپ کے بچپن کا ساتھی مردانہ میراسی تھا۔ بھائی گورو داس جی لکھتے ہیں:

؎ باباگیا بغداد نوں باہر جائے کیا استھانہ
اک بابا اکال روپ دوجا ربابی مردانہ

(وار بھا۔ پوڑی ۳۵)

بھائی مردانہ کا آپ کے ہمراہ سفر ہی میں انتقال ہو گیا اور اس طرح اس نے حق رفاقت و ارادت ادا کر دیا۔ آپ نے اپنے ہاتھوں سے اپنے جیون ساتھی کا گور و کفن کیا۔ غرضیکہ آپ کا ہمسفر بھی آپ کا ایک معتقد مسلمان ہی تھا۔

(۸) حضرت باباجی زندگی بھر مسلمان درویشوں اور فقیروں کے ہمنوا رہے۔ آپ کی صحبتیں جن مسلمان فقراء و صلحاء سے رہیں ان میں پیر جلال، میاں مٹھا۔ پانی پت کے شاہ شرف الدین، پیر عبدالرحمٰن، بابا بڈھن شاہ۔ تلونڈی کے سید شاہ حسن۔ ملتان کے درویش ولی قندھاری۔ بغداد کے پیر شیخ مراد۔ مدینہ کے بزرگ قاضی رکن الدین اور پاک پٹن کے فریدثانی شاہ ابراہیم نمایاں ہیں۔ آپ نے دوران سفر اجمیر شریف، ملتان اور بغداد میں چلہ کشی کی۔ ملتان میں گروجی نے جس جگہ چلہ کشی کی وہاں بطور نشانی لفظ اللہ اپنے ہاتھ سے لکھا جو اب بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ (ملاحظہ ہو چشمۂ معرفت ص۲۳۵) گروجی ایک عرصہ تک بغداد میں عبادت و ریاضت میں مشغول رہے۔ ان کی چلہ کشی کی یادگار وہاں ابھی بدستور قائم ہے۔ ایک معزز خاتون راحیل شروانیہ اپنے سفرنامہ میں لکھتی ہیں:

"ہم کاظمین سے واپس ہوتے ہوئے بغداد کے ایک قبرستان میں گئے وہاں ایک چار دیواری کے اندر تین گنبد ہیں۔ ایک گنبد میں حضرت جنید بغدادی اور سری سقطی استراحت فرما ہیں۔ گنبد کے باہر ایک چھوٹی سی مسجد ہے۔ دوسرا گنبد حضرت یوشع بن نون کا ہے اس کے قریب ہی تیسرا گنبد حضرت بہلول دانا کا ہے۔ اس میں مقبرہ کے اندر سے ایک حجرہ کا دروازہ ہے اس میں ایک عجیب چیز گرونانک کا چلہ ہے یہاں انھوں نے چار ماہ تک چلہ کشی کی۔ یادگار کے بطور یہاں ایک کتبہ موجود ہے جو شکستہ حالت میں ہے۔ بہت کوشش سے

میں نے اتنا نکالا "عبدالمجید گرونانک ۹۱ء"

(ملاحظہ ہو سفر نامہ راحیل شروانیہ ص۳۱، بابا نانک شاہ ص۷۶ از مولانا محمد احتشام الحسن مرحوم کاندھلوی)

اِس کتبہ سے گرونانک جی کے اصل نام کا پتہ چلتا ہے۔ اسلامی ممالک میں آپ اسی نام سے مشہور و متعارف تھے، ورنہ چلّہ کشی کے بعد خانۂ کعبہ تک نہ پہونچ سکتے اس لئے کہ غیر مسلم کے حرم محترم میں داخلہ پر سخت پابندی عائد ہے۔ مشہور ہے کہ مکہ مکرمہ پہونچکر گرونانک جی کعبہ شریف کی طرف پیر پھیلاکر سو گئے اس پر وہاں کے قاضی نے آپ کو ٹوکا تو آپ نے جواب دیا "قاضی جی میرے پیر ادھر کر دیجئے جدھر اللہ کا گھر نہ ہو" نادان لوگ اس کو بے ادبی پر محمول کرتے ہیں حالانکہ بابا جی کے متعلق ایسا خیال خود بے ادبی ہے۔ اگر اس واقعہ کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس سے گرو جی کے استغراق اور عالمِ جذب کی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ بیت اللہ شریف کے دیدار سے اس قدر سرشار تھے کہ آپ کو ہر طرف بیت اللہ ہی بیت اللہ نظر آرہا تھا اور خدا کے نور کا جلوہ چاروں طرف چھایا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ ایسی حالت میں انسان پاسِ ادب سے بے نیاز ہوتا ہے اور شرعی گرفت و مواخذہ سے آزاد۔

مدینہ منورہ سے واپس ہوکر آپ نے اس زمانہ کے مشہور بزرگ قاضی رکن الدین صاحبؒ سے ملاقات کی اور ان سے فیض حاصل کیا۔ بغداد کے پیر شیخ مراد سے ملے تو ان کی محبت و عقیدت میں اپنے کو بھول گئے۔ فرماتے ہیں:

ع　　من دیا گرو آپنے، پایا نرمل ناؤں

(گرو گرنتھ رام کلی محلہ ۱)

تاریخ شاہد ہے کہ پاک پٹن شریف کے سجادہ نشین حضرت ابراہیمؒ (فرید ثانی) کے آپ مرید و خلیفہ تھے۔ ایک مرتبہ اپنے مرشد شیخ فرید سے گلے مل کر بے خود ہو گئے اور بے ساختہ زبان سے نکلا ؎

آؤ رُ بہڑیں گل ملیئیں انک سہیلڑیاں　　आवोह भेहरो जल मिल्ह अंक सहेलड़ियाँ
مل کے کرہیں کہانیاں سمرتھ کنت کیاں　　मिलि के करहि कहाड़ियाँ संम्रथ कन्त कियाँ

साचे साहिब सब गुण अवगुण सब असाँह ساچے صاحب سب گن، اوگن سب اساہ

یہ کیسا محبت انگیز پیارا نظارہ ہے کہ گرو جی بابا فرید کو "بھنیں" کہکر بغلگیر ہو رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں "آؤ بہنیں ہم سب مل کر خدا کی حمد و ثنا کے گیت گائیں اس لئے کہ تمام خوبیاں اور سب اعلیٰ صفات اس سچے خدا ہی میں ہیں۔ ہمارے اندر تو ہر قسم کی خامیاں اور نقص ہیں"۔ گرو جی کے یہ تصورات وجذبات ہیں دراصل عبدیت کا صحیح نمونہ اور قابل تقلید۔ کاش کہ ہمارے سکھ بھائی اس پر غور کریں۔

(۹) گرو نانک جی کی وفات کے بعد آپ کی جو یادگاریں اب تک محفوظ ہیں ان میں دو قابل ذکر ہیں اول قرآن مجید کا وہ نسخہ جو حرمین شریفین کے مبارک سفر میں آپ کے ہمراہ تھا اور اب وہ گورو ہر سہائے فیروز پور کے گوردوارہ میں بجنسہٖ محفوظ ہے۔ اس کے متعلق آپ نے فرمایا ہے:

؎ کل پردھان کتیب قرآن پوتھی پنڈت پڑھیں پران

(گرو گرنتھ محلہ ۱)

یعنی اس کلجگ میں خاص طور پر کام آنے والی کتاب تو صرف قرآن ہے۔ پنڈت پوتھی پران بیکار پڑھ رہے ہیں۔

دوسری یادگار آپ کا وہ چولہ (یعنی چوغہ یا خرقۂ خلافت) ہے جو بغداد کے سفر میں آپ کو ملا۔ اس پر آیات قرآنی اور متبرک کلمات جابجا مرقوم ہیں۔ یہ چولہ بھی اپنی اصلی حالت میں محفوظ و موجود ہے۔ نقل ملاحظہ ہو۔ ڈیرہ بابا نانک میں کابلی مل کی اولاد (بیدی خاندان والے) اس کے محافظ و نگراں ہیں۔ اس کے عزت واحترام کا اندازہ اس میلہ کو دیکھنے سے ہو سکتا ہے جو ۲۱، ۲۲، ۲۳ پھاگن کی تاریخوں میں چولہ صاحب کے نام سے ضلع گورداس پور کے ڈیرہ بابا نانک نامی مقام پر لگتا ہے جہاں لاکھوں معتقدین جمع ہو کر ارادت وعقیدت کے پھول نچھاور کرتے ہیں۔ اسی چولہ کو زیب تن کر کے حق وصداقت کے اظہار اور حق کی تبلیغ کی خاطر شری گرو نانک جی نے

باباگرونانک کا چولہ

(خرقۂ خلافت)

ماخوذ از "سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم" یعنی جگت گرو ص ۳۶
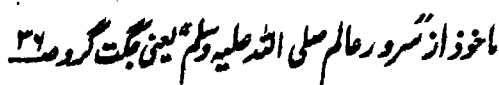
سفر کی صعوبتیں برداشت کیں اور لوگوں کو بتایا کہ:

ع دھات ملے پھن دھات کو لِو لِوے کو دَھاوے

یعنی محبت سے محبت پیدا ہوتی ہے۔ محبت کسی کی خوبیوں کو دیکھ کر اور اپنا کر پیدا ہوتی ہے اس لئے فرمایا:

ع سانچ کر ہیجے گر ٹھیں کیری چھوڑ اوگن چلئے

(سوہی محلہ ۱)

یعنی تمھیں چاہیئے کہ دوسروں کی اچھی صفات کو اپناؤ اور ان کی برائیوں کی طرف نظر نہ ڈالو۔ لفظ اسلام اور مسلم کی درحقیقت یہ نہایت جامع تعریف ہے۔ سچے مسلمان کی یہ امتیازی شان ہے کہ وہ اوروں کے بخلاف تمام مذاہب کے بزرگوں، مقدس کتابوں اور استھانوں کی عزت کرتا ہے اور ان کا احترام ملحوظ رکھتا ہے اور یہ باہمی اتحاد و اتفاق کے لئے ضروری ہے۔ ہمارے سکھ بھائیوں کو بھی گرونانک جی کی تعلیمات پر عمل کرنا چاہیئے۔ اتحاد و اتفاق کی اہمیت کو بابا نانک جی نے کتنے پیارے الفاظ میں ادا فرمایا ہے:

ع سیے (سیوا) کی مہان برن نہ سا کون نانک پرے پریلا

(گوجری محلہ ۱)

یعنی مخلوق کی خدمت از راہِ محبت اتنی بلند و اہم چیز ہے کہ میں اس کی تعریف (مہا) بیان نہیں کر سکتا۔ غرضیکہ شری گورونانک جی نے خلوص و محبت اور باہمی اتحاد و اتفاق نیز خالص خدا پرستی کا لوگوں کو سبق دیا اور اسلامی تعلیمات کو حسنِ تدبیر کے ساتھ لوگوں تک پہونچایا۔

گرونانک جی اور ان کی تعلیم کے بنیادی اصول

یہ بتایا جا چکا ہے کہ مولوی قطب الدین صاحب کی اخلاقی و روحانی تعلیم سے گرو جی نے اثر لیا اور حضرت سید شاہ حسن صاحبؒ کی صحبت اور نظرِ کرم نے ان کی دنیا بدل دی۔ آپ نے محبت الٰہی کے حصول کے لئے تن۔ من۔ دھن۔ عزت و راحت اور ہر قسم کی آسائشوں کو قربان کر دیا۔ نانک جی کا ظہور ایسے

وقت میں ہوا کہ جب ہندوؤں کی روحانی حیات بالکل بے حس وحرکت ہو چکی تھی بلکہ اس ملک میں مسلمانوں میں سے بہت سے لوگ صرف نام ہی کے مسلمان تھے۔ ظاہر پرستی اور باپ دادا کے غلط رسم ورواج میں مبتلا تھے۔ آنحضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دنیائے انسانیت پر سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ آپؐ نے دورِ جاہلیت کے سماج کے خلاف کہ جو رنگ ونسل، وطن پرستی اور فرقہ بندی وغیرہ کی لعنت میں گرفتار تھا تلقین کی اور اس سلسلے میں طرح طرح کے مصائب جھیلے۔ جہلار کی زبان سے بُرا بھلا سنا۔ کسی نے نعوذ باللہ من ذالک دیوانہ ومجنوں بتایا اور کسی نے جادوگر کا خطاب دیا لیکن آپ نے اپنا کام جاری رکھا۔ خالص توحید پرستی کا درس دے کر سماج کی اصلاح کی اور اس طرح معاشرہ ل پراگندگی وانتشار کو دور کر کے کلمہ گو انسانوں کو ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنا دیا۔ آپ کے بعد اجب الاحترام صوفیار کرام نے آپؐ کے کام کو جاری رکھا۔ شری گورونانک جی کا شمار بھی انھیں پاکباز ررگوں میں ہے کہ جو اللہ اور اس کے رسول کے سچے شیدائی وعاشق تھے اور جن کے عشقِ الٰہی کے اور ں کی تاب نہ لا کر ناسمجھ اور مورکھ انسانوں نے ہمیشہ طرح طرح کے نام رکھے ہیں۔ نانک جی کو بھی ںدا اور اس کے رسولؐ کے بتائے ہوئے کام کی خاطر سب کچھ سننا پڑا۔ اس کا اندازہ آپ کی پوتّر نی سے ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں :

سہ　کوئی آکھے بھوتنا کوئی کہے بے تالا
کوئی آکھے آدمی نانک وچارا
بھیا دیوانہ شاہ کا نانک بورانا

(سری گورو گرنتھ صاحب)

ا یہ (ناسمجھ لوگ) مجھے پاگل اور بھوت پرتیوں کے گروہ میں شامل کر رہے ہیں لیکن چونکہ حقیقت رہ نا آشنا ہیں اور انھیں اس کی خبر نہیں کہ میں اپنے مولیٰ حقیقی کا دیوانہ ہوں۔ اس انہ پن کو ایک دنیا دار انسان کیا سمجھے۔" گرونانک جی اپنے زمانہ کی حالت بیان کرتے ں :

؎ مایا موہ سکل جگ چھایا کامن دیکھ کام لو بھایا
ست گنجن ہیتوں بہتُ دُکھیا سب کچھ اپنا اک رام پرایا

(پربھاتی محلہ ا صفحہ ۱۳۴۳)

یعنی مایا کا موہ پوری دنیا پر چھایا ہوا ہے۔ دنیا کی ہر چیز پر جان دیتے ہیں اور اسے اپنی ملکیت تصور کرتے ہیں۔ ہاں اگر کوئی چیز پرائی ہے تو وہ ہے رام رحیم۔" ظاہر ہے کہ شری گورو جی کے ظہور کے وقت محبت الٰہی اور اللہ تعالیٰ کے ذکر کی جگہ جھوٹ، دغابازی، حیلہ وحجت، نفرت اور تعصب کی گرم بازاری تھی۔ مذہب اور اس کی قدریں برائے نام رہ گئی تھیں اور جیسے اماوس کی رات میں چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا چھا جاتا ہے ٹھیک اسی طرح انسانی قلوب پر مکر و فریب کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ آپ نے اس مایوس کن دور کا نقشہ ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

کل کاتی راجے قاصائی ، دھرم پنکھ کر اُوڈریا
کوڑھ اماوس سچ چندرما، دیسیہ ناہیں کہیں چڑھیا

(بحوالہ بدر صفحہ ۱۹ مورخہ ۲۰ نومبر ۱۹۶۹ء)

یعنی ضلالت و گمراہی کے ان گھٹاٹوپ بادلوں کے باعث انسان کا دل حیران و پریشان تھا اور اس کو صراط مستقیم نہیں مل رہا تھا۔ ایسے بھیانک دور میں گورو جی مہاراج نے جنم لیا اور مادی دنیا اور اس کے عیش و عشرت کو ٹھکرا کر آپ نے اللہ تعالیٰ کی محبت میں اپنے کو محو کر کے ذکر الٰہی کی شمع کو روشن کیا اور خدائے بزرگ و برتر کی محبت کے زندگی بخش نور سے دور مخلوق کو دوبارہ جلا بخشی یہ آپ کے زندگی بخش پیغام ہی کا نتیجہ ہے کہ آج پنجاب کی سرزمین "جو بولے سو نہال، ست سری اکال" کے فلک شگاف نعروں سے گونج رہی ہے۔ آئیے اب ان کی تعلیم کے بنیادی اصولوں پر غور کریں۔

انھوں نے ایک نازک دور میں پیدا ہو کر لوگوں کو ان کے خالق و مالک کی طرف دعوت دی اور پاکیزہ زندگی بسر کرنے کے لئے تین بنیادی اصول بیان کئے جنھیں آپ نے نام، دان اور

اشنان کے نام سے موسوم کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

ے نام، دان، اشنان نہ من کمھ
تت تن دھور دُھائی

(سورٹھ محلہ ۱ ص۵۹۶)

یعنی اس مادہ پرست لالچی انسان کے پاس نہ نام (ذکر الہٰی) ہے نہ دان (حق العباد ــــ اور بانٹ کر کھانا) اور نہ اشنان یعنی پاکیزہ جسم و جان۔ اس کے تن پر دھول اڑ اڑ کر پڑ رہی ہے۔

یہاں نام سے مراد حقوق اللہ، دان مترادف حقوق العباد، اور اشنان یعنی جان و تن کے حقوق اور پھر ان سب کی اس طرح تشریح کی ہے:

(۱) نام (حقوق اللہ): "اے انسان! نام یعنی حقوق اللہ کو سمجھ۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا اور اس کے حقوق کو ادا کرنا نسلِ انسانی کا اوّلین فرض ہے۔ جو لوگ اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور اس کے حقوق ادا کرنے کی طرف توجہ نہیں دیتے وہ اپنے لئے نجات کا راستہ بند کرنے والے ہیں اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے انکار کے نتیجہ میں ان کے پاس حلّت و حرمت یا اخلاق کا کوئی معیار باقی نہیں رہے گا کہ جس سے کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دیا جاسکے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کے ذریعہ ہمیں حلال و حرام میں امتیاز کرنا بتایا ہے اس لئے اس کے بتائے ہوئے راستہ کو ترک کر دینے سے انسان کی زندگی حیوانوں کی مانند ہوجائے گی اور وہ شتر بے مہار ہوجائیں گے۔ اسی بات کو پیش نظر گرو گرنتھ صاحب میں کہا گیا ہے:

ے دین بساریو رے دیوانے دین بساریو رے
پیٹ بھریو پشو آجیون سوئیو مانکھ جنم ہر ہاریو رے

(مارو کبیر ص۱۱۰۵)

دوسری جگہ فرمایا "شریعت (دین پر چلنا) سر پوش ہے سبھناں باتاں کا۔ شریعت کا کہا کریئے۔ چھوڑ دیئے ناہیں۔ شریعت قدرت کو پہونچتی ہے۔ شریعت چھوڑی قدرت کو ناہی پہونچتا۔

پار تو پڑے جو شریعت اوپر صدق رکھے۔" (ملاحظہ ہو جنم ساکھی شری گورونانک جی ص ۲۴ مؤلفہ سوڈھی میریاں؛ بدر ص ۲، ۶ نومبر ۱۹۶۹ء)

گورونانک جی نے نسل انسانی پر اللہ تعالیٰ کا دوسرا حق اس کا ذکر کرنا بیان کیا ہے۔ ان کا ارشاد ہے کہ:

؎ کھانا، پینا، ہنسنا باد جب لگ دِہ نہ آوے یاد

(آسا محلہ ۱ ص ۳۵۱)

یعنی کھانا پینا اور ہنسنا سب بیکار ہے جب تک انسان صدق دل سے اپنے رب کو یاد نہیں کرتا اس لئے گرنتھ صاحب میں بار بار تلقین کی گئی ہے کہ:

کر بندے توں بندگی جب لگ گھٹ میں ساہ (سانس)

(تلنگ محلہ ۵ ص ۲۴)

ساتھ ہی ساتھ یہ بھی چیتا ونی دی کہ اگر سب لوگ مل کر اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول ہو جائیں تو اس کے یہ معنی نہیں ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ کی شان میں کچھ اضافہ ہو جائے گا یا اگر اس کے ذکر سے روگردا ہو جائیں تو نعوذ باللہ اس کی شان میں کچھ کمی ہو جائے گی۔ ذکر الٰہی تو خود لوگوں کے لئے زندگی بخش جام ہے جس سے ابدی زندگی وابستہ ہے چنانچہ گرو جی فرماتے ہیں:

؎ جے سب مل کے آکھنڑ پاہیں وڈا نہ ہووے گھاٹ نہ جاہیں

(آسا محلہ ۱ ص ۹، ص ۳۴۹)

حقیقت در اصل یہ ہے کہ گرونانک جی کو دنیا کے تمام وہ انسان جن کے دل سوزشِ عشق سے خالی تھے اور جو دنیا کی مادی عیاشیوں میں مبتلا ہو کر اپنے پالن ہار ربّ کریم کو بھول گئے تھے دکھوں کی بھٹیوں میں جلتے نظر آ رہے تھے۔ فرماتے ہیں:

؎ نانک دکھیا سب سنسار منّ ناؤں سوئی جنٹر جائے

(گرو گرنتھ صاحب

اور یہ واقعہ ہے کہ حقیقی سکھ اور قلب کا اطمینان تو صرف اللہ کی محبت اور اس کے ذکر ہی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ قرآن حکیم نے اس حقیقت کو یوں آشکار کیا ہے "اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ" یعنی قلوب کے اطمینان کا ذریعہ تو حقیقتاً ذکر الٰہی ہی ہے۔

غرضیکہ گروجی مہاراج نے اللہ اور اس کے رسول کی محبت سے سرشار ہو کر اس حقیقت کو پا لیا تھا کہ انسان باوجود اشرف المخلوقات ہونے کے اللہ تعالیٰ کا صرف ایک ناچیز بندہ ہے۔ اس کی زندگی کا واحد مقصد مولیٰ کریم کی طاعت وعبادت ہے اور بس۔ گروجی کی یہ تعلیم قرآن کریم میں فرمانِ ربی وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ کی تعمیل ہے یعنی میں نے جن وانس کو پیدا کیا ہے صرف اپنی عبادت کے لئے لہٰذا اس کے احکام پر بے چون وچرا عمل کرنا ہی انسان کا مقصد حیات ہے۔ ایک مقام پر گروجی فرماتے ہیں: بندہ جو ہویا ہے سو بندگی کے واسطے ہویا ہے۔ جو بندہ ہوئے کے بندگی نہیں کردا..... سو حیوان دی نیائیں ہے۔" (جنم ساکھی بھائی منی سنگھ ص۴۶)

یعنی بندہ تو صرف بندگی کے واسطے پیدا ہوا ہے جو انسان محبت الٰہی اور اس کے ذکر واذکار سے تہی دامن ہے وہ انسان انسان کہلانے ہی کا مستحق نہیں بلکہ وہ جانوروں کی مانند ہے۔ دوسری جگہ گرونانک جی نے اس کی مزید وضاحت فرمائی۔ ارشاد ہے:

سہ
چٹے جن کے کپڑے — میلے چت کٹھور جیو
تن مکھ نام نہ اوبجے — دوجے دیاپے چور جیو
مول نہ بوجھے آپنا — سے پشوا سے ڈھور جیو

(سوہی محلہ ۱)

یعنی جو انسان کپڑے تو سفید پہنتا ہے لیکن اس کا دل گندہ اور پتھر کی طرح سخت ہے اور وہ کبھی بھی اپنے معبود حقیقی کا ذکر نہیں کرتا اور شرک وغیرہ میں پھنس کر زندگی گذارتا ہے اور اپنے وجود کو پہچاننے کی کوشش نہیں کرتا کہ خدا نے اسے کیوں پیدا کیا اور اس کی پیدائش کے اغراض کیا ہیں تو ایسا انسان حیوانوں اور پشوؤں کی طرح ہے ان میں اور انسان میں کچھ بھی فرق نہیں۔ اس کے بعد ایک جگہ خدا

کو پانے اور راضی کرنے کا کھلے الفاظ میں یہ طریقہ بتلایا ہے :

سُن من بھورے باوَرے گورو کے چرنی لاگ
ہر جپ نام دِھیائے توں ، یم ڈرپے دُکھ بھاگ

(ست بچن صفہ ۹۸ بحوالہ بدر صفہ ۱۵ نومبر ۱۹۶۹ء)

یعنی اے نادان دل ! مرشد کے قدم پکڑ لے اس کی اتباع کر۔ ہری (اللہ) کا نام جپ تو ملک الموت ڈر کر بھاگ جائے گا اور دُکھ بھی دور رہے گا۔ گرو جی کے نزدیک حقیقی مرشد کون ہے کہ جس کے چرنوں پر لگنے سے کام بنتا ہے اس کا ذکر اگلے سطور میں ملاحظہ فرمائیں :

اب ذرا اس معبودِ حقیقی کے سچے عاشق سری گورو نانک جی کی زبان سے اللہ تعالیٰ کی چند صفات بھی سنتے چلیئے ۔ اس کی قدرت کاملہ کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

ندیاں وِچ ٹِبّے دکھا لے ، تھلی کرے اَس گاہ
کیڑا تھاپ دے پاتشاہی لشکر کرے سُواہ

(وار ماجھ محلہ ۱ صفہ ۱۴۴)

یعنی اللہ تعالیٰ اپنی قدرتِ کاملہ کے ماتحت ندیوں کو ٹبّوں (ٹیلوں) کی شکل میں تبدیل کر سکتا ہے اور تھلوں (خشک زمینوں) اور ریاباؤں کو گہرے پانیوں میں بدل سکتا ہے ۔ معمولی انسانوں کو بادشاہی بخش سکتا ہے اور بڑے بڑے لشکروں کو لمحہ بھر کے اندر نیست و نابود کرنے کی قدرت رکھتا ہے ۔ اس طرح گرو جی نے اپنے الفاظ میں مخلوق کے سامنے قرآن حکیم میں پارہ ۳ کی سورہ آل عمران کے رکوع ۳ کی ہوبہو تفسیر بیان کر دی ہے ۔ ملاحظہ ہو قل اللھم مالک الملک سے لے کر انک علی کل شیئ قدیر تک ۔ آیتہ کا مطلب یہ ہے کہ " اے میرے پیارے حبیبؐ ! لوگوں میں میری قدرت کاملہ کا اعلان کر دو کہ تمام سلطنتوں کی حقیقی مالک و وارث تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے وہ جسے چاہتا ہے سلطنت کے انعام سے نوازتا ہے اور جس سے چاہتا ہے اس انعام کو چھین لیتا ہے ۔ اس طرح جسے چاہتا ہے عزتوں کا تاج پہناتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلتوں کے گڈھے میں دھکیل دیتا ہے ۔ تمام بھلائیوں کا وہی سرچشمہ ہے

اور حقیقت یہ ہے کہ وہ ہر چیز پر قدرت کاملہ رکھتا ہے۔"

دوسری جگہ باباجی نے اللہ کے رب العالمین ہونے کی صفت کو اپنی پوتر بانی کے ذریعہ بیان کیا ہے۔ ارشاد ہے:

گوراں اِک دیہہ بجھائی
سبھناں جیاں کا ایکو داتا
سو میں وِسر نہ جائی

(سری گرو گرنتھ صاحب)

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شانِ ربوبیت صرف ایک قوم اور ایک ملک کے ساتھ وابستہ نہیں ہے بلکہ وہ تو ساری سنسار کے جیوؤں کا جیون داتا ہے (اس کی ربوبیت کی صفت تمام جہانوں کو سبق دے رہی ہے کہ اسی کی حمد کے ترانے گائیں)۔ اے نانک کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی یاد رے دل سے نکل جائے۔

قرآن حکیم کی سورۂ مریم (پارہ ۱۶، رکوع ۳) میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تبارک تعالیٰ جب کسی امر فیصلہ کر لیتا ہے تو لفظ کُن سے تخلیق کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفت کن فیکون کو پرکرتی اور مادہ ضرورت نہیں وہ جب تخلیق چاہتا ہے تو اس کا صرف کُن (ہوجا) کہنا ہی کافی ہے۔ اس حقیقت نک جی نے یہ کہہ کر واضح کیا:

کیتا پساؤ ایکو کوا‌ؤ تِس تے ہوئے لکھ دریاؤ

(جپ جی بانی ۳)

للہ تعالیٰ نے تمام تخلیق "ایک کواؤ" یعنی کُن کہنے سے کی ہے جس کے بعد اس تخلیق کا لاکھوں دریاؤں میں پھیلاؤ ہوا اس طرح تخلیق کے لئے نہ وہ مادہ کا محتاج ہے اور نہ پراکرتی کا۔

(باقی آئندہ)

بزم اقبال

عارف مشرق کی ایک روحانی مجلس کا فیضان

(از جناب قطب الدین بختیار صاحب حیدر آباد)

یک زندہ دل نہ رفت سلامت زعیب جو کایں ماجرا بہ خضر علیہ السلام رفت

علامہ حمید الدین فراہی

اس ہیچ میرز کو ایک طویل عرصہ کے بعد، صبح کی ابتدائی ساعتوں میں، علامہ اقبالؒ کے حلقہ روح پرور میں شرف حاضری نصیب ہوا۔ وہی بے تکلف سادہ و آزادہ قلندرانہ انداز ــــ خندہ روئی، شگفتہ مزاجی، نادرہ گفتاری۔ اس دفعہ برصغیر کے مشاہیر اہل عرفان، اصحاب دل اور ارباب علم کا ایسا جھرمٹ نظر آیا، جس کی نظیر اس سے قبل کم دیکھنے میں آئی۔ علامہ اپنے معاصرین کے اس ہجوم میں کالبدر فی النجوم نظر آ رہے تھے۔ حاضرین میں جن حضرات سے اس واقعہ نگار کی شناسائی رہی ان کے اسماء گرامی بلا ترجیح و ترتیب پیش کئے جاتے ہیں۔ مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا عبد القادر گرامی، ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم، عبد اللہ یوسف علی، شیخ عبد القادر مدیر مخزن، ڈاکٹر رضی الدین، سید راس مسعود، ڈاکٹر میر ولی الدین، ڈاکٹر ظہیر الدین الجامعیؔ ڈاکٹر سید عبد اللطیف، سید سلیمان ندوی، عبد السلام ندوی، ڈاکٹر ظفر حسن، سید ابو الاعلیٰ مودودی، ڈاکٹر غلام دستگیر رشید، پروفیسر سلیم چشتی، ڈاکٹر عابد حسین، خواجہ غلام السیدین، ظفر علی خاں، رئیس الاحرار مولانا محمد علی، غلام احمد پرویز، بہادر یار جنگ، کیقباد جنگ، صبغۃ اللہ بختیاری، ڈاکٹر یوسف حسین خاں عبد المجید سالک، سید عبد الواحد، علی میاں، نواب بھوپال حمید اللہ خان اور سید نذیر نیازی۔ یہ جمگھٹ گویا سارے ہندوستان کا عطر تھا جو جاوید منزل میں کھنچ آیا تھا۔ دلدادگان و جوہر شناسان کلام اقبال کے

اس یکجائی سے ایک پرکیف سماں بندھ گیا تھا

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اور ڈاکٹر رضی الدین کے چند استفسارات پر علامہ مسئلہ زمان و مکان کے بارے میں کچھ توضیحات فرما رہے تھے۔ یہ حدیث قدسی جس کی روایت قدرے تغیّر کے ساتھ دو طرح پر کی گئی ہے موضوع بحث تھی ــــ (۱) لاتسبوا الدھر فان الدھر ھو اللہ (۲) لا تسبوا الدھر فانی انا الدھر موقع کی مناسبت سے علامہ نے گول میز کانفرنس کے سفر کے دوران برگسان سے ملاقات کی تفصیل بتلائی اور کہا کہ جب حقیقت زمان پر گفتگو ہوئی تو میں نے حضور اقدس ؐ کی یہ حدیث بیان کی۔ یہ مجرد سننے کے وہ اپنی کرسی معذوران (INVALID CHAIR) سے اچھل پڑا، اس کی روح بے انتہا مسرت سے لبریز اور چہرہ شادمانی سے تمتما اٹھا کہ ایک نبی امیؐ و اعلم کے قلب پر وہی حقیقت وارد ہوئی جسے وہ استدلال اور ذاتی وجدان کی بنا پر دنیا کے سامنے عمر بھر پیش کرتا رہا اس محل پر ڈاکٹر میر ولی الدین نے امام شعرانی کی تصنیفِ لطیف 'لطائف المنن' سے امام شافعی کا یہ تاثر پیش کیا کہ میں نے صوفیہ سے دو امر کا استفادہ کیا ہے۔ ایک الوقت سیفٌ قاطعٌ ان لم تقطعہ تقطعك، دوسرے ان لم تشغل نفسك بالخیر شغلك بالشر۔ اس پر علامہ نے مترنمانہ 'اسرار خودی' سے 'الوقت سیفٌ' کے زیرِعنوان اشعار سنائے، جس پر ساری محفل وجد و حال میں جھومنے لگی۔ قارئین کی ضیافتِ طبع کے لئے چند ابیات سپردِ قرطاس کئے جاتے ہیں:

سبز بادا خاکِ پاکِ شافعی — عالم سرخوش ز تاکِ شافعی
فکر او کوکب ز گردوں چیدہ است — سیفِ بُرّاں وقت را نامیدہ است
من چہ گویم سرّ ایں شمشیر چیست — آب او سرمایہ دار زندگیست
صاحبش بالا تر از امید و بیم — دستِ او بیضا تر از دستِ کلیم
سنگ از یک ضربتِ او تر شود — بحر از محرومیٔ نم بر شود
در کفِ موسیٰ ہمیں شمشیر بود — کار او بالا تر از تدبیر بود
سینۂ دریائے احمر چاک کرد — قلزمے را خشک مثلِ خاک کرد

پنجۂ حیدرِ کرّ خیبر گیر بود	قوتِ آواز نہیں شمشیر بود

زندگی دہر است و دہر از زندگیست	لاتسبوا الدہر فرمان نبی ست

اس نظریہ کے مطابق دہر خلاق ایک شمشیر ہے، جو خود اپنا راستہ کاٹتی ہوئی اور راہ کی مزاحمتوں کو دور کرتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ دہر کی یہ ارتقائی اور خلاقی قوت کبھی کلیم کے اندر کارفرما ہوتی ہے اور کبھی حیدر کرارؓ کے پنجۂ خیبر شکن میں۔

صدقِ خلیل بھی ہے عشق، صبرِ حسین بھی ہے عشق	معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق	اقبال

زندگی وقت میں نہیں گزرتی بلکہ وقت زندگی کی تخلیقی قوت ہے، جس انسان کے ہاتھ میں زمانہ کی تلوار ہو، وہی زندگی کے ممکنات کو نمایاں کر سکتا ہے ؎

خویشتن را وا نمودن زندگیست	ضربِ خود را آزمودن زندگیست	اقبال

اقبال نے ایسے انسان کامل کو 'سوار اشہب دوراں' کہا ہے۔ زمانہ کی نفسیاتی توجیہ کی جائے تو وہ ایک قسم کی تخلیقی فعلیت اور حقیقت کا جزء ہے۔ حقیقی زمان، متواتر زمان نہیں جسے ہم ماضی، حال و استقبال میں تقسیم کر سکیں۔ یہ خالص دوراں، محض مرور اور ایک آن واحد ہے، جو تغیر و تبدل کو آغوش میں لئے ہوئے تواتر سے دامن کشاں ہے۔ یہ شیونِ الٰہی سے ہے، اور ہر آن ایک نئی شان میں جلوہ گر ہے، 'وکل یوم ھو فی شان' اسی لئے کہا جاتا ہے کہ تجلی میں تکرار نہیں ؎

جلوہ اینجا ہر نفس جام دگر دارد بکف	محرم کیفیتِ آں حسن بے تکرار باش	بیدل

NOTHING IS THERE TO COME AND NOTHING PAST
BUT AN ETERNAL NOW DOES ALWAYS LAST

'ABRAHAM COWLEY'

جس ہال میں یہ محفل منعقد تھی وہ تقریباً حاضرین سے پُر ہو چکا تھا، واقعہ نگار ایک گوشہ میں ادباً ایستادہ، اس روح پرور اور ایمان افروز منظر و کلام کو جنت نگاہ اور فردوس گوش بناتا رہا۔ اس اثنا میں جاوید اقبال نے حاضرین کو چائے بسکٹ سے تواضع کی اجازت چاہی، علامہ کی نظر فیض اثر اس

عاجز پر پڑی، میں نے آداب بجالانے کی سعادت حاصل کی۔ مجھے قریب آنے کے اشارے سے نوازا جوں ہی میں آگے بڑھا، علامہ سروقامت کھڑے ہوگئے۔ میں نے نظیری نیشاپوری کا یہ شعر دہراتے ہوئے دست بوسی کا شرف حاصل کیا ؎

فریضہ است ترا آمدن بدرگہ دوست   اگر در دل ندہبار آستاں دریاب

علامہ نے ہمیشہ کی طرح بختیار سے مخاطب ہوتے ہوئے مجھے پہلو میں جگہ عنایت فرمائی۔ برہان کے دسمبر ۱۹۶۲ء اور جنوری ۱۹۶۳ء کے شمارے، جس میں اقبال اور تالہؒ زماں کے زیر عنوان جو مقالہ شائع ہوا ہے وہ میرے ساتھ تھا۔ دریافت فرمایا، کوئی خاص بات ہے، میں نے ان دونوں پرچوں کو جہاں یہ مقالہ درج تھا، کشادہ سامنے رکھ دیا۔ اسی عرصہ میں علی بخش نے چائے بسکٹ پیش کئے۔ علامہ نے ایک پیالی میری طرف بڑھائی، دوسری خود اٹھالی اور نوش فرماتے ہوئے اوراق گردانی کرتے رہے۔ ایک نظر میں پورا مضمون بھانپ گیا۔ علامہ ندوی سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ اس مضمون نگار نے آپ پر کتمانِ حق کا الزام عاید کیا ہے، اور مجھے تالہؒ زمان کی بدعقیدگی سے متہم کرکے کفر و الحاد کا فتویٰ جڑ دیا ہے۔ کیا غضب ہے کہ میری تحریرات اس کی نظر سے نہیں گذریں، میرے کسی لفظ اور مصرع سے بھی یہ شائبہ گذر سکتا ہے کہ میرے عروۃ الوثقیٰ مغربی علوم رہے ہیں، یا میں نے کوئی بات قرآن و حدیث سے ہٹ کر کہی ہے۔ کیا میرے یہ اشعار ان الزامات کی تردید نہیں کر رہے ہیں، کیا مضمون نگار نے 'رموز بے خودی' میں عرض حال مصنف بحضور رحمۃ للعالمین کے زیر عنوان یہ اشعار نہیں دیکھے یا ان سے دانستہ اعراض و اغماض کیا جا رہا ہے ؎

گر دلم آئینۂ بے جوہر است   ور بحرفم غیر قرآں مضمر است

خشک گرداں بادہ در انگورِ من   زہر ریز اندر مے کافورِ من

روز محشر خوار و رسوا کن مرا   بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانش فرنگ   سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

با مغربیاں بودم، بپرجستم و کم دیدم   مردے کہ مقاماتش ناید بکتاب اندر

تو غنی ہر دو عالم من فقیر روزِ محشر عذر ہائے من پذیر
ور تو میدانی حسابم ناگزیر از نگاہِ مصطفےٰ پنہاں بگیر

اس وقت عبداللہ انور بیگ نے وہ واقعہ یاد دلایا جبکہ علامہ، سید راس مسعود کو مخاطب کرکے یہ الفاظ فرماتے تھے:

HAVE BENIFITED VERY LITTLE BY MY VAST TUDIES, EASTERN OR WESTERN, BUT I HAVE DRIVED MMENSE BENIFIT FROM INVOCATIONS درود و سلام TO OUR OLY PROPHET, YOM PROGENITON"

علامہ نے فرمایا میں نے لاتسبوا الدھر فانی انا الدھر میں حضور کے ارشاد کو بلفظہ پیش کیا ہے یہ حدیث قدسی قرآن کی دیگر تمثیلی آیات ومارمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ اور ید اللہ فوق ایدیھم احدیث خلق آدم علی صورتہ اور خلق الانسان علی صورت الرحمن کی طرح پر محض تمثیل واستعارہ ہے۔ انسان و زمان ہر دو کے بدرجۂ اتم مظہر الٰہی ہونے کے باعث انھیں اپنی ذات سے نسبت دی گئی ہے۔ انسانیت کی یہ پرانی بیماری ہے کہ وہ اپنی کوتاہی سے مثال کو مثل کا درجہ دیتا ہے۔ جس طرح خدا کوئی چراغ نہیں، جنت کوئی باغ نہیں، ایسے ہی انسان رحمٰن نہیں اور زمان یزدان نہیں۔ فطرت کی اس زمانی قوت کو علامہ نے 'جاوید نامہ' میں 'زروان' کا لقب دیا ہے۔ یہ تجلیات وشیون الٰہی کا ایک مظہر اتم ہے ورنہ کائنات کی دیگر اشیاء کی طرح اس کی حقیقت بھی بجز نمود بے بود کے اور نہیں، جس کو زبورِ عجم اور بالِ جبریل میں واشگاف پیش کیا گیا ہے۔

زمانہ قاصدِ طیار آن دلآرام است چہ قاصدے کہ وجودش تمام پیغام است
خرد ہوئی ہے زمان ومکاں کی زناری نہ ہے زماں نہ مکاں لاالٰہ الا اللہ

ذات الٰہی جو حقیقت الحقائق ہے، ازلی ابدی ہے، اس لئے زمان مستمر کی حرکت وتغیر وتاخر کی اضافتوں سے پاک ہے، حدوث زمان کا اطلاق صرف عالم خلق تک محدود ہے۔ عالم

لطائف مستر زمان کے اثر سے وراء الوراہیں۔ نداں مستر کا رمز شناس صرف نفسِ انسانی ہوسکتا ہے۔

- یہ بوالعجبی ہے کہ کائنات یم ایام میں مچھلی کی طرح غوطہ زن اور خود زمان کے حدود ناآشنا سمندر کی ایک چھوٹے سے جام میں سمائی ہو جاتی ہے، جو مومن کا قلبِ صافی ہے سہ

جہانے ماکہ پایانے نہ دارد — چو ماہی در یم ایام غرق است
یکے بر دل نظر واکن کہ بینی — یم ایام در یک جام غرق است

گنجیدہ بہ جامے ہیں ایں قلزم بے ساحل

لا یسعنی ارضی وسمائی وانما یسعنی قلب العبد المومن (حدیث قدسی)

پرتوِ حُسنت نگنجد در زمین و آسماں — در حریم سینہ حیرانم کہ چوں جا کردۂ

روحِ انسانی چونکہ لازمانی ولامکانی ہے، اس لئے اس میں الٰہی صفات بحدِ توفیق اور بقدرِ فیض پائے جاتے ہیں۔ عالم میں خدا اس لئے سما نہیں سکتا کہ عالم اعراض کا مجموعہ ہے اور خود جوہر نہیں، یعنی خود بالذات اس کا وجود نہیں۔ عرش ہو یا فرش سب مکانی چیزیں ہیں، حقیقت لامکانی اس میں سما نہیں سکتی، چونکہ روح کی حقیقت لامکانی و زمانی ہے، اس لئے خدا اس میں سما سکتا ہے، روح خدا کی طرح حدود و ثغور سے ناآشنا اور ناسوتی قوانین کے اطلاقات سے ارفع و اعلیٰ ہے۔

خلیفہ صاحب نے عرض کیا کہ معترض آپ پر ایراد نہیں کر رہا ہے بلکہ آپ کے مصفیٰ آئینہ میں اپنی صورت دیکھ رہا ہے جیسا کہ رومی، نظیری اور بیدل نے اپنے اپنے انداز میں اس کو ثابت کیا ہے سہ

اے بسا ظلمے کہ بیں در کساں — خوئے تو باشد در ایشاں اے فلاں (رومی)
آنکہ بر ما زخم کیں زدہ از کینۂ ما — عکس آئینہ خود دید در آئینہ ما (نظیری)
ہر چہ از خلق عرض زشت ونکوست — عکسِ آئینۂ حقیقت اوست (بیدل)

ماہرین نفسیات کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ کسی شخص کا کسی دوسرے کے مزعومہ عیب پر شدید غم و غصہ کا اظہار اور کسی مخصوص عیب کا دوسروں میں جابجا نظر آنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ عیب

خود اس میں موجود، یا اس کے تحت الشعور میں انگڑائیاں لے رہا ہے دوسروں کے آئینہ میں اس کو اپنی ـــــ صورت دکھائی دے رہی ہے۔ جو شخص دوسروں میں رجز و توزیع کر رہا ہے دراصل وہ اپنی باطن کی کراہت سے گریزاں اور برسرِ پیکار ہے ؎

تیرہ طبعاں ز سینہ صاف بلاند ذوقِ آئینہ نیست بدگہر را
(رضا بیگاں یکے از وزرائے عالمگیر)

جیسا کہ ٹامس نے کہا ہے:

BASE ENVY WITHERS AT ANOTHER'S JOY,
AND HATES THAT EXCELLENCE IT CANNOT REACH.

ہر کور باطن کی اگر ٹوہ لگائی جائے تو تین علتیں سرگرم کار نظر آئیں گی، یا تو رشک و حسد ہوگا، یا سوء فہم، یا ستی شہرت حاصل کرنے کی تمنا۔ حاسد عیب چین ہوتا ہے ہنر بین نہیں کہ

ہر کہ بے ہنر باشد نظر بہ عیب کند

چشم اگر کور ست بیند ناصواب ہیچگہ شب را نہ بیند آفتاب (اقبال)

ز داماں نظر افشاندہ ام تا گرد خود بینی بہ ہر حالت کہ روی آورم گلزار می بینم (صائب)

دوسری عام بیماری جس میں انسانیت مبتلا نظر آتی ہے، وہ فہم درست کا کال ہے جیسا کہ رومی نے کہا ہے: مردم اندر حسرت فہم درست، کارلائل بھی انسانیت کی ذہنی صلاحیت کی تحقیق میں اسی نتیجہ پر پہنچا ہے:

FOR MEN ARE MOSTLY FOOLS — DEVOID OF KNOWLEDGE AND UNDERSTANDING.

غالب کی تحقیق بھی یہی ہے:

ہر چند زمانہ مجمع جہال است در جہل نہ حال شاں بیک منوال است
کودن ہمہ لیک از یکے تا دگرے فرقِ خر عیسٰی و خر دجال است

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ قائل نے کچھ کہا اور کوتاہ فہموں نے سوء فہمی سے کچھ کا کچھ سمجھ لیا۔

حروف کی حالت ظروف کی سی ہے، مظروف تک رسائی بہت کم کو نصیب ہوتی ہے۔ اہلِ دل حضرات اور ارباب صدق وصفا کی باتوں کے فہم و ادراک کے لئے فہمِ مستعد اور دلِ صافی مددگار ہے صرف مدرسوں کی دماغ سوزی اور تسبیح وسجادہ کی دکان آرائی کام نہیں دیتی ہے۔

ترا با خرقہ وسجادہ کارے   من از خود با نیم بوئے نگارے

میکدۂ تہی سبو حلقۂ خود فرامشاں   مدرسۂ بلند بانگ بزم فسردہ آتشاں

بیا ساقی بگرداں ساتگیں را   بیفشاں بر دو گیتی آستیں را

حقیقت را برندے فاش کردند   کہ ملا کم شناسد رمزِ دیں را

چو بشنوی سخنِ اہل دل مگو کہ خطاست   سخن شناس نۂ دلبرا خطا ایں جاست

اصحاب رمز و اشارات کو بڑی دشواری زمانِ آب وگل میں گفتارِ حال کے اظہار میں ہوتی ہے، معانی کی فراوانی اور الفاظ کی تنگ دامانی ان کو اپنے میں سمونے سے قاصر رہتی ہے۔ ناچار ہنگامِ تعبیر و بیان جو الفاظ روز مرہ استعمال میں آتے ہیں انھیں سے کام لینا پڑتا ہے۔ قصیر الفہوم کو بوجہ معانی ومطالب کے عسیر الفہم ہونے کے ایسے الفاظ فتنہ بن جاتے ہیں۔ معتقدین ومقلدین ان کو حجت گردانتے اور منکرین ومتعصبین آلۂ انکار وتکفیر۔ لیکن ارباب حق واقتصاد ان کی مناسب تاویل کرتے اور حقیقت حال کو اللہ کے علم کے حوالے کرتے ہیں ؎

در زمانِ آب وگل گفتارِ جاں   در قفس پرواز می آید گراں   (اقبال)

صد شیوہ یافتیم ز معشوق روزِ وصل   وز بہرِ نیم شیوہ بیانے نہ داشتیم   (عرفی)

ترے جلووں کے آگے ہمت شرح وبیاں رکھدی

زبانِ بے نگہ رکھدی، نگاہِ بے زباں رکھدی   (اصغر)

لارڈ بیرن کے الفاظ میں:

NO WORD SUFFICE THE SECRET SOUL TO SHOW,

FOR TRUTH DENIES ALL ELOQUENCE TO WOE.

اور پھر ہمارے ذریعۂ اظہار کی ٹینی سن کے الفاظ میں یہ حالت ہے:

S . THEMSELVES: THE SHADOWS OF SHADOWY

سستی شہرت حاصل کرنے کا آسان نسخہ کسی عظیم واقعہ کا انکار یا کسی عظیم المرتبت شخ
کر دینا ہے۔ گو ایسی شہرت لعن طعن کی حامل اور ناپائیدار ہوتی ہے، مگر بمصداق
تو کیا نام نہ ہوگا" ایک عادی مجرم کا علی الدوام ڈھنڈورا پیٹتی رہتی ہے
خطبات اقبال کے ترجمہ نگار، سید نذیر نیازی نے مضمون نگار کے ادھ
کو علمی دیانت کے خلاف قرار دیتے ہوئے، اسلامی الٰہیات کی تشکیل جدید سے وہ
سنایا، جس میں شیخ اکبر اور فخر رازی کے حوالوں کو بالکلیہ نظر انداز کر دیا گیا تھا
ان حضرات نے اسمائے حسنیٰ میں شمار کیا ہے، پورا اقتباس لکچرس اس طرح ہے

PROBLEM OF TIME HAS ALWAYS DRAWN
TION OF MUSLIM THINKERS AND MYSTICS.
S TO BE DUE PARTLY TO THE FACT THAT
TO THE QURAN, THE ALTERNATION OF
IGHT IS ONE OF THE GREATEST SIGNS
ND PARTLY TO THE PROPHET'S IDENTI-
F GOD WITH TIME IN A WELL-KNOWN
H. INDEED, SOME OF THE GREATEST
IS BLIEVED IN THE MYSTIC PROPERTIES
RD 'DHAR'. ACCORDING TO MOHIUDDIN
'DHAR' IS ONE OF THE BEAUTIFUL

NAMES OF GOD, AND FAKHRUDDIN RAZI TELLS US IN HIS EXEGESIS OF QURAN THAT SOME MUSLIM SAINTS HAD TAUGHT TO RECITE THE WORD 'DHAR' WITH OTHER ATTRIBUTES OF GOD.

شاید معترض اس بات کو سن کر ششدر ہو جائے کہ شیخ الدلائل ابو محمد عبداللہ، صاحب دلائل الخیرات نے حزب ہفتم میں اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کے ساتھ اس اسم مبارک کو بھی اس طرح دہرایا ہے، "یا ازلی، یا ابدی، یا دھری، یا دیموحی، یا من ھو الحی الذی لا یموت" ؎

نہ من تنہا دریں میخانہ مستم جنید و شبلی و عطار ہم مست

جس طرح کائنات کی ہر شے حکم الٰہی کی تابع فرمان ہے؛ اسی طرح زمانہ اللہ تعالیٰ کی کارفرمائیوں کا ایک محیط الکل منظر پیش کر رہا ہے۔ یہ عقیدہ اسلامی فکر میں اس طرح رس بس گیا ہے کہ ایک عامی سے لے کر ایک عالم تک اس کو تسلیم کرتا ہے، شعر و ادب میں اس کا اظہار تو ادبیات اسلامی کی ایک نمایاں خصوصیت بن گیا ہے، اور اس مضمون کے اشعار زبان و کلام میں ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں، جس کی چند مثالیں یہ ہیں:

آفتِ روزگار جب تم ہو شکوۂ روزگار کون کرے داغ

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

"نام ان کا آسماں ٹھہرالیا تحریر میں"

وقت کا مسئلہ ہمیشہ سے ایک معرکہ آرا موضوعِ بحث رہا ہے۔ عامۃ الناس اور نام نہاد عُبّاد وزُہّاد اس کو کوئی دینی مسئلہ نہیں سمجھتے، لیکن عرفاء و حکماء اس کی گتھیوں کے سلجھانے میں وقفِ تحقیق ہیں کہ وقت کی ماہیت کیا ہے، آیا اس کو کوئی شے بھی کہا جا سکتا ہے یا نہیں، دنیا میں یا تو اشیاء و اشخاص ہیں یا افعال و حوادث۔ وقت نہ کوئی شے ہے اور نہ کوئی شخص، نہ کوئی فعل نہ کوئی حادثہ۔ سب کچھ وقت میں واقع ہوتا ہے، لیکن وقت کوئی واقعہ نہیں۔ فلسفیوں کی زبان میں

یہ نہ جوہر ہے اور نہ عرض۔ کیا وقت ازلی و ابدی ہے، یا یہ بھی کسی وقت خلق ہ
مرد مومن بھی تھا اور مرد حکیم بھی۔ ناممکن تھا کہ ایسا اہم مسئلہ اس کے دماغ میں
کا روپ نہ دھارتا اور وہ اس کا اسلامی حل معلوم کرنے سے قاصر رہتا۔ اپ
خطبات میں اس مسئلہ زماں کو اتنی اہمیت دی ہے کہ اس کو وہ مسلمانوں اور
کے لئے موت وزیست کا سوال قرار دیتا ہے۔ یہ مسئلہ اتنا لطیف، نازک اور
اس کو سمجھا تو جاسکتا مگر سمجھایا نہیں جا سکتا۔ سینٹ آگسٹائن کا زمان کے بار
جملہ ہے اب بھی اسی طرح اپنی ساری حقیقت آفرینیوں کے ساتھ قائم و محکم ہے، ج
کہا گیا تھا۔ اس کو حضور سے ہم عہد ہونے کا شرف حاصل ہے۔ علامہ نے اس
اپنے تیسرے لکچر میں ان الفاظ کے ساتھ دہرایا ہے:

TINE'S PROFOUND WORDS ARE AS TRUE
THEY WFRE WHEN THEY WERE UTTERED.
E QUESTION ME OF TIME, I KNOW IT,
) EXPLAIN TO A QUESTIONER I KNOW

زمان و مکان، دونوں کا وجود نفسی اور اعتباری ہے۔

ماہیت ہستی میں نہ زماں ہے نہ مکاں — نہ ہے زماں نہ مکاں لا الٰہ الا
زمانہ کی یہ گردش جاودانہ — حقیقت ایک تو باقی فسانہ
کسی نے دوش دیکھا ہے نہ فردا — فقط امروز ہے تیرا زمانہ
بہر چہ میرسی از خود گذشتنی دارد — بہوش باش کہ امروز رفت

ARROW ISTHMUS TWIST TWO BOUNDLESS

THE PAST AND FUTURE, TWO EXTREMITIES.

'THOMAS MOORE'

ہرچہ دارد محفلِ تحقیق امروزست و بس   خاک بر فرقِ دو عالم دی و فردا کردہ اند (بیدل)

یہ امروز بھی اتنا دواں و براں ہے، ادھر زبان سے نکلا، سماعت کے پردوں سے ٹکرایا، اور ماضی کی زینت بن کر رہ گیا۔

عبداللہ یوسف علی نے کس حقیقت آفریں انداز میں اپنی انگریزی تفسیرِ قرآن میں اس کو پیش کیا ہے:

THE PRESENT IS ONLY A FLEETING MOMENT, POISED BETWEEN THE PAST & THE FUTURE, AND GONE EVEN WHILE IT IS BEING MENTIONED OR THOUGHT ABOUT.

کائنات کی ہر چیز خلاقِ فطرت کی آئینہ داری کر رہی ہے جس کو قرآن تسبیح خوانی سے تعبیر کرتا ہے، وان من شئ الا یسبح بحمدہٖ، جس کو سننے اور جاننے سے انسان قاصر و درماندہ ہے۔ کنتُ کنزاً مخفیاً فاحببت اَن اُعرفَ ، فخلقت الخلق ۔ محبت و حقیقت کا حسین ترین موصوف اگر عقل و دانش میں نہ آئے نورِ جمال اور دل و نگاہ میں سما جائے تو انسان ہے۔

درجستن مانند تو، نظارہ زبون است   در زادن ہمتائے من اندیشہ عقیم است (غالب)

ردائے لالہ و گل، پردۂ مہ و انجم   جہاں جہاں وہ چھپے ہیں عجیب عالم ہے (اصغر)

جلوہ و نظارہ پنداری کہ از یک جوہر است   خویش را در پردۂ خلقے تماشہ کردہ (غالب)

کفر دارم گر نشیم سپاسِ نعمتِ دیدار اوست   جلوہ در ہر رنگ دیدم، گردنے خم ساختم (صہبائی)

مرا در عرصہ آوردی کہ خود را جلوہ گر کردی   فگندی چشم بر آئینہ یا بر خود نظر کردی (درد)

از تقاضائے حب جلوہ گری   آمد اندر حصار شیشہ پری (نیاز)

"لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی"

امریکی فی شاعر ایڈورڈ ایمرسن نے کس وجد آفریں انداز میں کنت کنزاً مخفیاً

I WAS A GIM CONCEALED.

ME MY BURNING RAY REVEALED

عشق کی آفرینش حسن سے ہوتی ہے، یعنی خود حسن، عشق کا آفریدگار ہے اس ۔
عشق اور عاشق سے کیسے بے نیاز ہو سکتا ہے۔ حسن کی بے نیازی ایک غلط خیال ۔
جمال، عشق ہی کی خاطر داریاں ہیں۔ حسن و عشق ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ ا
کا وجود نا قابل تصور۔ حق کا عرفان اس کی ضد ہی سے ہوتا ہے۔ توانائی کے لئے نا
کے لئے غفاری، لطافت کے لئے کثافت، اپنے کو ساری ناتوانیوں اور خامیوں کے
کرنا کسی کی خدائی اور کمال کا ثبوت دینا ہے

"شکوہ صاحب حزیں ز خوشہ چیں پیداست"

ناتوانی خوی اساسیہاست　　　خودنمائی خداشناسیہاست

اس جامع حقیقت کی کنتُ کنزاً مخفیاً میں دعوت فکر دی گئی ہے۔

بلبل ز ادب پا نہ نہد در صف گلزار　　　تا گل بہ طلبگاری او لب نہ

شعاع مہر خود بے تاب ہے جذب محبت سے

حقیقت ورنہ سب معلوم ہے پروازِ ش

حسنت نیاز مند تماشائے ناز نیست　　　اما ز ذوق جلوۂ خود بے نیاز نہ

جلوہ مفت ست اگر دیدۂ بینائے ہست　　　ایں جہاں آئینہ آئینہ سیمائے

مہر و ماہ ارض و سما آئینۂ شکل اند ہمہ　　　میتواں یافت کہ در پردہ خود آ!

بہ فلک فروغ تو در نظر، بہ زمیں بہار تو جلوہ گر
بہ چمن سحاب و بہ گل سحر، ہمہ جا ظہور کرامتے

اس حدیث قدسی میں ارشاد ہے کہ میں پوشیدہ خزانہ تھا، اس کا آرزومند ہوا کہ پہچانا جاؤں
داعیہ تخلیق کائنات کی علت بنا۔ قرآن حکیم کا یہ فرمان کہ میں نے جن والنس کو عبادت کے لئے
پیدا کیا ہے، ان ہر دو میں کوئی تضاد نہیں۔ عبادت کا حقیقی جوہر عشق ہے۔ جو پرستش اس
سے خالی ہو وہ طاعت نہیں مزدوری واجرت ہے

تسبیح و خرقہ لذت مستی نہ بخشدت — ہمت دریں عمل طلب از مے فروش کن — حافظ

تم اس کافر کا ذوق بندگی اب پوچھتے کیا ہو
جسے طاق حرم بھی ابروئے خمدار ہو جائے — اصغر

آبرو از در میخانہ طلب کن زاہد — طاعت خشک شرابست تو ہم میدانی — علی

وحدۃ الوجود اور ہمہ اوست کے سمجھنے میں بہت سوں نے ٹھوکر کھائی ہے۔ گفتار رجال
زبان آب وگل میں بیان کرنے کا یہ لازمی نتیجہ ہے۔ جو بات سمجھانا چاہتے ہیں اس کے لئے
الفاظ نہیں اور جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں ان میں تمام معانی ومطالب کی سمائی دشوار۔
دشنہ وخنجر، بادہ وساغر کے بغیر کام نہیں چلتا۔ قائل نے ایک حقیقت کو الفاظ کا جامہ
پہنایا، سامع لفظ پرستی کا شکار ہو کر الوہیت کے پیچ وخم میں الجھ کر رہ گیا۔ زبان تمام تر
مادیت اور جسمانیت کے سانچوں میں ڈھلی ہوتی ہے۔ کیفیتیں ابھرتی ہیں کیتیں نہیں۔ کیفیت
بیان کرنا چاہو تو مکانیت کی اصطلاحات سے کام لینا پڑتا، جس کو حقیقت سے دور کا بھی
تعلق نہیں یہ ایسے ہی ہے کہ ایک طفل نوخیز کو جماع کی لذتوں سے آشنا کرنے کے لئے
ہم اللہ کے لڈو کہدیا جائے۔ انسان بحیثیت حیوان ناطق کے خود پر نازاں ہے، حالانکہ
بات یہ ہے کہ نفس انسانی ہنوز ایسی زبان ایجاد نہ کرسکا، جو واردات نفسی کا تشفی بخش
ذریعہ بن سکے۔ امام شاذلیؒ اس کے لئے دست بدعا ہیں، وھب لنا مشاھدۃ
تصحبھا المکالمۃ۔ الہٰی وہ مشاہدہ ارزاں فرما جو تکلم کی پرورش کرے۔

نزیب الکبیرؒ

مولانا روم بھی اسی کی خواستگاری کر رہے ہیں:

اے خدا بنما تو ما را آں مقام		کاندرو بے حرف میرو دکلام

فیضی بھی اسی کا رونا رو رہا ہے:

فریاد کہ دوریم ز مطلوب دل خویش		چنداں کہ دراز ست زبان طلب ما

حقیقت یہ ہے کہ کیفیات کو بیان کرنا تو در کنار ان کی درست نقش آرائی بھی نہیں کی جا سکتی:

گر مصور صورت آں دلستاں خواہد کشید
حیرتے دارم کہ نازش را چساں خواہد کشید

علامہ پر مقالہ نگار نے دھر کو الٰہ سمجھنے کا اعتراض کر دیا ہے۔ اس ایراد سے تصور بھی کانپ اٹھتا ہے۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ صفین میں حضرت عمار کی شہادت پر علی مرتضیٰ نے عمرو العاص اور معاویہ سے کہا کہ 'فئتہ الباغیہ' کی حدیث تمھیں یاد ہے، جس میں عمار کی شہادت اور گروہ باغی کے ناری ہونے کی پیش گوئی ہے۔ عمرو العاص اس حدیث کو سن کر سکتے میں پڑ گئے۔ معاویہ نے اس کی یہ تاویل کی کہ عمار کو قتل کرنے والے علی ہیں کہ انھیں میدان جنگ میں لے آئے۔ علی مرتضیٰ نے جواب دیا اس باطل استدلال سے حمزہؓ کے قاتل حضورؐ قرار پاتے ہیں۔ معاویہ گھبرا گئے اور بات بدل کر عمرو العاص سے کہا کہ تم خود اپنے پیشاب میں پھسل رہے ہو، مصر کی ولایت محفوظ ہے ان جھمیلوں میں نہ پڑو۔

زمانہ ذات واجب الوجود کی فعالیت کا اثر آفریں پرتو ہے۔ رہا تالٰہ زمان' یہ محض معترض کی افترا پردازی ہے۔ جس شخص کا یہ عقیدہ ہو کہ ــــ نہ ہے زماں نہ مکاں لا الٰہ الا اللہ ــــ وہ کیسے زمان کو الوہیت کا ہم پلہ قرار دے سکتا ہے۔ از روئے نص قرآنی، زمانہ شیون الٰہیہ سے ہے، وکل یوم ھو فی شان، جس کا کوئی صاحب ایمان انکار نہیں کر سکتا۔ پھر علامہ جیسا موحد، جس کی توحید پرستی میں یہ شعر جریدۂ عالم ثبت ہو کر مینارۂ نور کی صورت اپنی

تابانیوں سے اہل ایمان کو صراط مستقیم پر استقامت اور گم کردہ راہوں کو ہدایت بخش رہا ہے ؎

دل بہ کسے نہ باختہ، با دو جہاں نساختہ
من بہ حضور تو رسم روز شمار این چنیں

اس کائنات کا ذرہ ذرہ پرتو جمال الہٰی ہے ؎

چوں آفتاب ہر رخ ہر ذرہ ظاہرم — از غایت ظہور عیانم پدید نیست

شیخ سعد الدین حموی کس وجد آفریں انداز میں اپنی اس رباعی سے دل آگاہ کے قلب و دماغ کے لئے برد و تسکین کا سامان فراہم کر رہے ہیں:

حق جان جہاں است و جہاں جملہ بدن — اصناف ملائکہ حواس ایں تن
افلاک و عناصر و موالید اعضا — توحید ہمیں است و دگر حیلہ و فن

مولانا روم بھی اس دعوے کی حرف وصوت کے پردوں میں زمزمہ سنجی کر رہے ہیں:

او چو جان است و جہاں چوں کالبد
کالبد از وے پذیرد آلبد

ایک فرنگی شاعر بھی یہی راگ الاپ رہا ہے:

ALL ARE PARTS OF ONE STUPENDOUS WHOLE,
WHOSE BODY NATURE IS, AND GOD THE SOUL.

شیخ اکبر جو وحدۃ الوجود کے انتھک شارح اور زبردست علم بردار ہیں، ان کا یہ فتویٰ ماسوا دا عدا کے الوہیت کے رگ گلو پر کس طاقت سے خنجر پھیر رہا ہے، العالم ما شمہ سائحۃ الوجود اصلاً۔ ؎

غیر حق یک ذرہ کاں مقصود تست — تیغ لا برکش کہ آں مقصود تست

فتوحات مکیہ میں بڑی خوبی سے اس مسئلہ کی ماتل و دلائل وضاحت کی ہے۔

انہ لیس للعبد فی العبودیۃ نہایۃ حتی تصل الیہا ثم یرجع ربا کما انہ

لیس للرب حدٌ ینتھی الیہ ثم یعود عبداً، فالرب رب غیر نھایۃٍ والعبد عبد لا نھایۃ (فتوحات باب ۲۹۵)

عبد کے لئے عبودیت کی کوئی انتہا نہیں کہ اس کو پالے اور پھر رب بن جائے، جس طرح رب کے لئے کوئی حد نہیں کہ وہ ختم ہو جائے اور عبد بن جائے۔ اس لئے رب رب ہے بغیر نہایت اور عبد عبد ہے لانہایت۔

العبد عبد وان ترقی   والرب رب وان تنزل

"ما للتراب و رب الارباب"

نہ آن این گردد و نے این شود آن   ہمہ اشکال گردد بر تو آسان

چہ ممکن ست رود داغ زندگی بہ جبیں

زمیں فلک نشود، آدمی خدا نہ شود

اس چمنستان میں نیرنگئ گلشن مستقل اور گل و بلبل پا بر کاب، بوالعجب تر یہ کہ اس آئینہ خانہ میں جلوہ مقیم اور آئینے ٹوٹ پھوٹ اور شکست و ریخت سے دوچار ہو رہے ہیں۔

ہوا جدھر سینگ سمائے اور من بھائے چلتی ہے

THE WIND BLOWITH WHERE IT LISTETH.

مگر جس قانون کے تحت یہ تبدیلیاں و تنوع پذیر ہو رہی ہیں وہ اپنی جگہ اٹل۔

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

کیونکہ مرکزِ تغیر اور سرچشمۂ انقلاب لم یزل اور لایزال ہے۔

نیرنگئ گلشن نہ شود ہم سفرِ گل

آئینہ زخود می رود و جلوہ مقیم ست

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

عرب ملیالم

از جناب حامد اللہ صاحب ندوی ایم۔ جی۔ ایم ریسرچ سنٹر بمبئی

(۱)

ملیالم دراویڈی خاندان السنہ کی ایک شاخ ہے، یہ اور دراویڈی زبانوں کے مقابلے میں نسبتاً نئی ہے، بیسویں صدی کے نصف اول تک اس کے بولنے والوں کی تعداد ایک کروڑ چالیس لاکھ تھی اور یہ جنوبی ہند کے مغربی ساحل کیرالا کے علاوہ تامل ناڈو، اندھرا، مہاراشٹرا، میسور اور شمالی ہند کے بہت سے علاقوں میں پھیلے ہوئے ہیں[۱]۔

کہا جاتا ہے کہ لفظ "ملیالم" دو ٹامل لفظوں کی ترکیب سے بنا ہے، ملے (Malai) پہاڑ اور آلم (Alam) آدمی، رہنے والا، یعنی پہاڑی علاقہ کا رہنے والا، اس اعتبار سے یہ نام اس زبان کے اس علاقہ پر زیادہ صادق آتا ہے جہاں یہ زبان بولی جاتی ہے۔ یہاں کے رہنے والے ابتدا میں ایک خاص طرز کی ٹامل بولتے تھے جو "کوڈم ٹامل" (Koaum Tamil) کہلاتی تھی، یہی ٹامل صدیوں بعد بدلتے بدلتے ملیالم بن گئی[۲]۔

اس زبان کے ابتدائی نمونے یا تو کتبوں کی صورت میں ملتے ہیں یا رزمیہ نظموں

۱- Encyclopeadia Britonica Vol. 14, P. 676

۲- Grierson: Linguistic Survey of India Vol IV PP 348-54

(Ballads) اور لوک گیتوں (Folk Songs) کی شکل میں ایک مدت تک لوگوں کے سینوں میں محفوظ رہے۔ اس کا باقاعدہ رواج تیرھویں صدی عیسوی کے قریب ہوا اور راماچرتم (Ramačaritam) اس کا پہلا باقاعدہ نمونہ ہے۔ پھر مذہبی، اخلاقی اور دیگر موضوعات پر یکے بعد دیگرے متعدد کتابیں طبعزاد تخلیقات اور ترجموں کی شکل میں وجود میں آتی رہیں جن کا ذکر ملیالم ادب کی تاریخوں میں تفصیل کے ساتھ مل جاتا ہے، آج اس زبان میں ہر قسم کا ایک کثیر ادب موجود ہے جس کے پیدا کرنے میں ہندو مسلم عیسائی سب برابر برابر کے شریک ہیں۔

ملیالم ادب کی باقاعدہ ترویج میں دو بیرونی زبانوں نے زیادہ حصہ لیا ہے، سنسکرت جو وہاں کے علماء و فضلاء کی زبان تھی اور ٹامل جو ایک مدت تک دفتری زبان کی حیثیت سے وہاں رائج رہی۔ پہلے یہ زبان "وٹے لتو" (Vattelutttu) رسم خط میں لکھی جاتی تھی لیکن جب سنسکرت کی مقبولیت اور اس کی مذہبی ہمہ گیری نے اس کو اپنے حلقۂ اثر میں لے لیا تو پھر سترھویں صدی عیسوی میں تنجتوا ایروتچن (Tanjatta Eruttachchan) نامی ایک شخص نے آریا ایڑتو (Arya eruttu) کے نام سے ٹامل گرنتھا (Tamil grantha) پر مبنی ایک نیا خط ایجاد کیا، یہی خط آج رائج ہے اور اس میں دراویڈی زبانوں کے علاوہ سنسکرت میں مستعمل تمام آوازوں کے لئے بھی تحریری علامتیں موجود ہیں اور ٹامل حروف کے مقابلے میں زیادہ مکمل ہیں۔[۳]

(۲)

ہندوستان میں عربوں کی آمد و رفت زمانہ قدیم سے جاری تھی جو اشاعت اسلام کے بعد دوچند ہوگئی، عربوں نے سب سے پہلے جنوبی ہند کے مغربی ساحل مالابار اور کولم (ٹراونکور) میں قدم رکھا تھا اور جیسے جیسے ان کے تجارتی تعلقات بڑھتے گئے ویسے ویسے یہاں ان کی

۳۔ Nilakanta Sastri: A History of South India PP 417-20

آبادی میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا، یہاں کے راجا نہ صرف ان کی آمد سے خوش تھے بلکہ انھوں نے ان کے گھومنے پھرنے، اپنا مذہب پھیلانے اور آباد ہونے کی بھی پوری پوری آزادی دے رکھی تھی، خصوصیت کے ساتھ کیرالا کے زیمور (Zamorin) حکمران ان کی بڑی سرپرستی کرتے تھے جس کے نتیجے میں مالابار کے پورے ساحل پر ان کی آبادی بڑھ گئی تھی، ان کے اپنے قاضی تھے، ان کے اپنے مفتی تھے، ان کی اپنی مسجدیں اور خانقاہیں تھیں، مقامی سیاست میں بھی ان کا کافی عمل دخل تھا، بعض عرب، وزیر، سفیر، تعلقہ دار اور امیر البحر (Admirals) جیسے اہم عہدوں پر بھی فائز رہے[۴]۔

ان عرب مسلمانوں نے مقامی عورتوں سے شادیاں بھی کیں اسی لئے انھیں ماپلا (Mappilla) یعنی دولھا کے نام سے یاد کیا جانے لگا، اس خطاب کے علاوہ انھیں بعض مخصوص مراعات بھی حاصل تھیں مثلاً یہ کہ ایک مسلمان، نمبودری برہمن کے بازو بیٹھ سکتا تھا جب کہ نائر کو بھی اس کی اجازت نہ تھی، اسی طرح موپلاؤں کے مذہبی رہنما تھنگل (Thangal) کو اس کی اجازت تھی کہ وہ زیمور حکمران کے ساتھ پالکی میں سوار ہو کر جائے، بعض اوقات یہ حکمران خود ہی مذہبی تبدیلی کی کھلم کھلا ہمت افزائی کرتے تھے، مقصد یہ تھا کہ عربوں کے ان کے اپنے جہازوں کے لئے آسانی سے آدمی مل جائیں، یہ جہاز خود ان کی اپنی شان کو بڑھاتے تھے اور انھیں ہمعصر حکمرانوں سے ممتاز کرتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ جب ایک زیمور حکمران نے اپنے پڑوسی ملک "پالناڈ" پر چڑھائی کی اور اپنے زور بازو سے اسے فتح کیا تو اس کی حفاظت کی خاطر ویلاپورم (Velapuram) میں ایک قلعہ تعمیر کیا، اس قلعہ میں ایک مسلمان تاجر نے اپنی منڈی قائم کی جو بہت جلد ترقی پا کر پورٹ آف کالی کٹ کی صورت میں تبدیل ہو گئی۔ یہی تاجر بعد میں کالی کٹ کا "کویا" (قاضی) بھی بنا اور اس کے جانشین

۴- Lunia : Evolution of Indian culture P 367

زیمورراجاؤں کے شانہ بشانہ لڑتے اور دشمنوں سے اپنے ملک کو بچاتے رہتے تھے۔[۵] ۱۴۹۵ء میں جب
واسکوڈی گاما کالی کٹ کے قریب لنگر انداز ہوا اور پرتگیزیوں نے اپنی تجارتی منڈیوں کے لئے
مقامی لوگوں کی زمینیں زبردستی لینا شروع کیں تو اس وقت بھی یہ مسلمان اس عہد کے
زیمورحکمرانوں کنجالی مرکار اول و دوم (Kanjali MaraKKar I, II) کے دوش
بدوش نہ صرف لڑے بلکہ موپلا اڈمیرلز نے پرتگیزی حملہ آوروں کو بعض شرمناک شکستیں بھی
دیں۔

فی الحال کیرالا میں ان کی آبادی کا تناسب پندرہ فی صد ہے لیکن اگر پورے کیرالا کی بجائے
اس کے صرف ان تین اضلاع کنانور (Cananore) کوژیکوڈ (Kozhi Kode)
اور پالگھاٹ (Palghat) کو لیا جائے جس کا مجموعی نام مالابار ہے تو یہاں یہ اکثریت میں
ہیں اور ان اضلاع کی کل آبادی کا دو تہائی حصہ ہیں۔ یہ ہندوستان کے مختلف علاقوں کے علاوہ
بیرون ہند میں برما، سنگاپور، ملائشیا، انڈونیشیا، خلیج فارس (Persian Guef) اور
سعودی عربیہ میں بھی آباد ہیں۔ سنی مشرب اور شافعی مسلک کے پیرو ہوتے ہیں۔

تاریخوں سے پتہ نہیں چلتا کہ کیرالا کے یہ مسلمان ابتدا ابتدا میں کونسی زبان بولتے تھے، قرین
قیاس یہ ہے کہ وہ آپس میں تو عربی ہی بولتے رہے ہوں گے لیکن مقامی لوگوں سے رابطہ قائم کرنے
کے لئے انھیں ملیالم بھی سیکھنی پڑی ہوگی جس کو وہ یقیناً عربی رسم خط میں لکھتے تھے اور اس مقصد
کے لئے انھوں نے اپنے رسم خط میں تھوڑی بہت تبدیلیاں بھی کرلی تھیں، یہ روایت آج بھی ان
موپلاؤں میں باقی ہے، ایک طرف اگر وہ پورے ذوق وشوق سے عربی سیکھتے ہیں تو دوسری طرف
ملیالم کو بھی مادری زبان کی حیثیت سے برتتے ہیں اور اپنے عرب آباواجداد کی پیروی میں اس

۵- Tara Chand : Influence of Islam on Indian Culture, P. 36.

کو عربی حروف میں لکھتے ہیں، اسی عربی حروف میں لکھی ہوئی ملیالم کا نام "عرب ملیالم" ہے اور اس میں ان موپلاؤں کا ایک کثیر دینی اور سماجی ادب موجود ہے۔

وی۔ عبداللہ نے اپنے ایک مضمون "موپلا" (The Moplahs) میں لکھا ہے کہ موپلاؤں نے عرب ملیالم میں نظمیں اور گیت بھی کافی لکھے ہیں یہ ہیں تو ملیالم میں لیکن ان میں عربی، فارسی اور اردو الفاظ کا استعمال بھی کثرت سے کیا گیا ہے اور یہ عام طور پر موپلا گیت (Mapilla Pattu) کے نام سے جانے پہچانے جاتے ہیں، ان نظموں اور گیتوں میں اولیا اور شہدا کے واقعات کے ساتھ بعض اوقات عشقیہ مضامین کا بھی استعمال ہوتا ہے، یہ عشق زیادہ تر عشق مجازی ہوتا ہے اور اس میں عورت بڑے ہی جذباتی انداز میں پیش کی جاتی ہے۔ اس قسم کی نظموں کو کیشو گیت (Kessu Pattu) کہتے ہیں، یہ نظمیں محبت ناموں کی شکل میں ہوتی ہیں جو ایک دور افتادہ عاشق اپنے ماں باپ کی نگرانیوں میں جکڑی ہوئی محبوبہ کو لکھتا ہے، اس قسم کی نظمیں اور گیت لکھنے والے شاعروں میں معین کٹی ویدیار سب سے نمایاں ہے جو عرف عام میں "مہاکوی" کے نام سے مشہور ہے، اس کی ایک ایسی ہی بہترین نظم "بدرالمنیر" ہے جس میں ایک شہزادے اور شہزادی کی محبت، جدائی اور ملاپ کے ایک فرضی فارسی قصے کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ منظوم کیا گیا ہے۔[1]

اس وقت ہمارے پیش نظر عرب ملیالم کے دو نمونے ہیں ایک ۱۹۱۹ء کا اور دوسرا ۱۹۶۲ء کا، ۱۹۱۹ء کا جو نمونہ ہمارے سامنے وہ مجموعۂ قصائد و ادعیہ کی شکل میں ہے اور پی، کے ایم، بی، ایس کمپنی پونانی، ملابار کی طرف سے شائع ہوا ہے اس میں تقریباً ۵۴ مولود نامے اور دعائیہ قصائد ہیں، ابتدائی انیس۱۹ قصائد تو خالص عربی میں ہیں لیکن باقی سب عرب ملیالم میں۔

اسی طرح ۱۹۶۲ء کا جو نمونہ ہمارے سامنے ہے وہ حسب ذیل دینی رسائل کی صورت

---

[1] The Illustrated weekly of India Feb. 1, 1970

میں ہے:

۱۔ انام کبضاس	درجۂ اوّل
۲۔ ربدام کبضاس	درجۂ دوم
۳۔ مونام کبضاس	درجۂ سوم
۴۔ نالام کبضاس	درجۂ چہارم
۵۔ انچام کبضاس	درجۂ پنجم

یہ سارے رسائل پہلی سے پانچویں جماعت تک کے بچوں کی دینی تعلیم کے لئے کل کیرالا جمعیت العلمار کی ٹکسٹ بک کمیٹی کی منظوری سے کیرالا اسلام مت ودھیا بھیاسس بورڈ (All Kerala Muslim Education Board) کی طرف سے شائع ہوئے ہیں اور آج بھی رائج ہیں، ان نمونوں کی مدد سے عرب ملیالم کا ایک مختصر سا صوتی، صرفی اور نحوی مطالعہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

(۳)

مصوتے: ملیالم میں مصوتوں کے اظہار کے لئے کل اٹھارہ تحریری علامتیں ہیں، اس کثرت کی وجہ سنسکرت کا اثر ہے ورنہ عملاً تیرہ سے زیادہ مصوتوں کا استعمال نہیں ہوتا، باقی محض سنسکرت کے بعض مخصوص الفاظ کی ادائگی کے لئے وضع کئے گئے ہیں۔

عربی میں مصوتوں کی اس قدر بہتات نہیں ہے، تین اعراب ضمہ، فتحہ، کسرہ اور تین حروف علت و، ا، ی اور ہمزہ کی مدد سے نو مصوتے بنتے ہیں، اگر ان میں واوِ مجہول اور یائے مجہول کو بھی مقصور و ممدود دونوں آوازوں کے ساتھ شامل کرلیا جائے تو یہ پورے تیرہ ہو ہی جاتے ہیں اسی لئے عرب ملیالم میں مصوتوں کی حد تک عربی کی اس کی اپنی صوتی علامتوں کو جوں کا توں رہنے دیا گیا ہے، کوئی ترمیم نہیں کی گئی۔

مصمتے: مصمتوں کے معاملہ میں یہ مسئلہ اس قدر آسان نہیں کیونکہ ملیالم بنیادی طور پر

ایک دراویڈی زبان ہے اور پھر سنسکرت کے غلبہ نے اس کے مصتوں کی تعداد کو اس قدر بڑھا دیا ہے کہ ان سب کی ہو بہو ترجمانی مروجہ عربی مصتوں کی توسیع کئے بغیر اور ان کی تعداد کو بڑھائے بغیر ممکن نہیں، یہی وجہ ہے کہ عرب ملیالم میں ملیالم کی بعض مخصوص آوازوں کی ترجمانی کے لئے عربی کے مروجہ حروف میں کچھ ترمیمات و اضافے کئے گئے جو ذیل کے موازنے سے ظاہر ہوں گے۔

(الف) اگر اس موازنہ کے لئے خالص عربی حروف تہجی کو بنیاد بنایا جائے تو ان میں صرف چودہ حروف ایسے ملتے ہیں جو ملیالم آوازوں کی بھی ترجمانی کا کام انجام دے سکتے ہیں، چنانچہ عرب ملیالم میں ان حروف کو ان آوازوں کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ اس تصرف کے ساتھ کہ [ک] بیک وقت کّ اور گ دونوں کی آوازیں دیتا ہے۔ وہ حروف یہ ہیں:

[ب] ، [ت] ، [ج]، [د] ، [ر] ، [س] ، [ش] ،[ک] ، [ل] ، [م]، [ن] [و]، [ہ] ، [ی]

(ب) جب ایران اسلام کے حلقۂ اثر میں آیا اور فارسی بھی عربی حروف میں لکھی جانے لگی تو فارسی کی بعض ایسی آوازوں کی ادائگی کے لئے جو عربی میں نہیں تھیں چار مزید علامتیں وضع کی گئیں، اگر اس موازانہ کے لئے خالص عربی حروف تہجی کی بجائے اس عربی فارسی حروف ہجا کو بنیاد بنایا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ ملیالم کی حسب ذیل تین آوازوں کی ادائگی کی بھی گنجائش نکل آئی، چنانچہ عرب ملیالم میں یہ تین آوازیں بھی استعمال ہوتی ہیں:

[پ] ، [چ] ، [ژ]

(ج) جب ترکی سلاطین کے ساتھ فارسی ہندوستان پہنچی اور مقامی زبانوں کے ساتھ اس کے اختلاط نے اردو کو جنم دیا تو اس کو ضبط تحریر میں لانے کے لئے اسی عربی فارسی حروف تہجی کو کام میں لایا گیا اور اس ہند نشاد زبان کی بعض مخصوص آوازوں کی ترجمانی کے لئے جن میں کوزی آوازیں (Retro flexes) اور ہکاری آوازیں (Aspirated Sounds) خاص طور پر قابل ذکر ہیں، چند اور علامتیں وضع کی گئیں، ملیالم میں بھی یہ ساری آوازیں پائی جاتی

ہیں، چنانچہ ان کی ادائیگی کے لئے عرب ملیالم میں جن علامتوں کا اضافہ کیا گیا ان کی شکل وہ
اور کیفیت بھی اردو علامتوں سے ملتی جلتی ہے۔ صرف اس فرق کے ساتھ کہ اس میں کوزئی آوا
کی نشاندہی کے لئے بجائے ط کے زیریں نقطہ ب کا استعمال کیا گیا ہے اور [ک] کی طر
[کھ] بھی مسموع وغیر مسموع دونوں آوازوں کے لئے مستعمل ہے، اور [پھ]، [ف] میں بدل گ
ہے جیسے

[بٹ]، [ڈ]

[کھ]، [چھ]، [جھ]، [تھ]، [دھ]، [تھ]، [دھ]، [ف]، [بھ]

(د) سنسکرت کی طرح ملیالم میں بھی صفیری آواز (ش) دو قسم کی ہے، ایک دندانی ا
دوسری تالوئی، عرب ملیالم میں بھی اس فرق کو باقی رکھا گیا ہے اور اس کے اظہار کے ـ
زیریں نقطہ ب کو کام میں لایا گیا ہے۔ جیسے

صفیری دندانی آواز [ش]

صفیری تالوئی آواز [ښ]

(ه) تامل کی طرح ٹھپکدار آواز [ر] کے لئے بھی ملیالم میں دو بلکہ تین علامتیں ہیں۔
تینوں کے لئے عرب ملیالم میں [ر] کا ہی استعمال ہوا ہے۔ اور فرق زیریں نقطہ ب کی مد
ظاہر کیا گیا ہے۔ جیسے [ر]، [ڔ]

(و) دو اور آوازیں ہیں جو ملیالم کو سنسکرت کی دین ہیں، [ञ] اور [क्ष] ان کے۔
عرب ملیالم میں کوئی نئی علامت وضع نہیں کی گئی، بلکہ ان کو [ن + ی] اور [ک + ش] کی تر
سے ظاہر کیا گیا ہے۔ بعض مثالوں میں [ञ + ج] بھی ہے

(ز) مذکورہ بالا علامتوں کے بعد ملیالم کی صرف تین ہی آوازیں رہ جاتی ہیں جن کے ا
کے لئے عرب ملیالم میں عربی کی تین قریبی علامتوں میں ذرا سا تصرف کیا گیا ہے۔ وہ آوازیں
علامتیں یہ ہیں:

غشائی انفی آواز [ڠ]، کوزی انفی آواز [ڹ]، کوزی پہلوئی آواز [ڞ]

اس طرح عرب ملیالم کی پوری صوتی تختی حسب ذیل ہوتی ہے :

[اَ] (a)، [آ] (a:)، [اِ] (i)، [اِی] (i:)، [اُ] (u)،
[اُو] (u:)، [اِ] (e)، [اِے] (e:)، [اُ] (o)، [اُو] (o:)،
[اَے] (ai)، [اَو] (au)، [ا] (ə)

[ک] (k)، [کھ] (kh) - - - - - - - - [ڠ] (ŋ)
[چ] (č)، [چھ] (čh)، [ج] (ǰ)، [جھ] (ǰh)، [ڃ] (ñ)
[ٹ] (ṭ)، [ٹھ] (ṭh)، [ڈ] (ḍ)، [ڈھ] (ḍh)، [ڹ] (ṇ)
[ت] (t)، [تھ] (th)، [د] (d)، [دھ] (dh)، [ن] (n)
[پ] (p)، [ف] (ph)، [ب] (b)، [بھ] (bh)، [م] (m)
[ي] (y)، [ر] (r)، [ل] (l)، [و] (w)، [ش] (š)
[ڜ] (ṣ)، [س] (s)، [ہ] (h)، [ڞ] (ḷ)، [کش] (kš)
[ژ] (ž)، [ڔ] (ṛ)

(۴)

عرب ملیالم کی ان صوتی خصوصیات سے گزر کر جب ہم اس کے نمونوں کا صرفی ونحوی نقطۂ نظر سے جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس زبان کا ڈھانچہ تو ضرور ملیالم کا ہے لیکن اس میں عربی الفاظ اس قدر زیادہ ہیں کہ اگر اس کی عبارتوں کو عربی خط کی بجائے ملیالم خط میں لکھ دیا جائے تو کسی غیر عربی داں کے لئے، ملیالم جاننے کے باوجود، اس کا پڑھنا اور سمجھنا مشکل ہوجائے گا۔ ان دخیل عربی الفاظ کا زیادہ ذخیرہ اسماء پر مشتمل ہے، ضمائر، افعال اور حروف وغیرہ ملیالم ہی کے ہیں، اس طرح عربی اسماء وصفات اور ملیالم افعال وحروف کے امتزاج سے اس زبان کا جو ہیولیٰ تیار ہوا ہے اس کی ایک ہلکی سی جھلک یہاں پیش کی جاتی ہے۔

۱۔ اسمار (الف) عدد (Number) : اور دراویڈی زبانوں کی طرح ملیالم میں دو ہی عدد ہیں، واحد اور جمع، واحد کی نشاندہی کے لئے تو کسی علامت کے اضافے کی نہیں پڑتی البتہ جمع کے لئے حسب ذیل علامات میں سے کسی ایک کا اضافہ کیا جاتا ہے
کبض (Kal)، مار (mār)، آر (ās) اَر (ar)
عرب ملیالم میں اِن میں سے پہلی دو علامات جمع کا عربی اسمار کے ساتھ استعمال
جیسے:

کبض:	انبیار	>	انبیاکبض	انبیار
	ملائک	>	ملائککبض	ملائک
	کتاب	>	کتابکبض	کتابیں
مار:	نبی	>	نبی مار	انبیار
	اصحاب	>	اصحاب مار	صحابہ
	استاذ	>	استاذ مار	اساتذہ

پہلی علامت جمع [کبض] تو محض جمع ہی کے لئے استعمال ہوتی ہے اور عربی اسم واحد دونوں کے ساتھ آئی ہے لیکن دوسری علامت [مار] کا استعمال زیادہ تر تعظیمی۔ اس کی مذکورہ بالا مثالوں کا مفہوم نبی اکرم، صحابۂ کرام اور استاذ محترم بھی ہوسکتا ہے۔
(ب) حالتیں (Cases) ملیالم میں اسمار کی جملہ سات حالتیں ملتی ہیں، فا (Nominative) مفعولی (Accusative) آلی (Instrumental) زمانی (Dative) استخراجی (Ablative) اضافی (Genitive) اور (Locative) اور اِن حالتوں کی نشاندہی کے لئے حسب ذیل لاحقوں (Suffixes) کو بہ طور علامت استعمال کیا جاتا ہے:
فاعلی حالت		صفر

مفعولی حالت	ای (ai) ، اے (e) = کو
آلی حالت	آل (al) = سے، ذریعہ سے
زمانی حالت	اُکُّ (ukku) اِنُو (innu) = کو، میں
استخراجی حالت	اِل نِنرُ (ilninru) = میں سے
اضافی حالت	اِن (in) ~ اُڈے (utai) = کا، کی، کے
مکانی حالت	اِل (il) ~ وِل (wil) ~ یِل (yil) = میں، پر[1]

عرب ملیالم میں بھی عربی اسماء کے ساتھ تقریباً ان سارے لاحقوں کے اضافے کی مثالیں ملتی ہیں۔ جیسے

مفعولی حالت	نبیّے (نبی کو) رسولے (رسول کو)
آلی حالت	نبیال (نبی سے) ، قرآنال (قرآن سے)، رسولال (رسول سے)
زمانی حالت	عشارکّ (عشار کو) ، عصرکّ (عصر کو)
استخراجی حالت	قرآنلنرُ (قرآن میں سے) ، حدیثلنرُ (حدیث میں سے)
اضافی حالت	معاذِن (معاذ کا) ، دینِن (دین کا)، امانن (امان کا)،
ظرفی حالت	قبرل (قبر میں) دنیاول (دنیا میں) اللہ تعالیٰ یل (اللہ تعالیٰ میں)

۲۔ صفات (Adjectives) عرب ملیالم میں ایسی مثالیں تو عام ہیں جن میں صفت ملیالم لفظ ہے تو موصوف عربی لفظ جیسے اسلام مت (مذہب اسلام)، رمضان ماسم (ماہ رمضان) ، نبی نائک (نبی اکرم) وغیرہ لیکن اس کے علاوہ عرب ملیالم میں ملیالم صفت عددی (Nuomeral Adjective) جیسے اورو (oru) (ایک) نالو (nalu) (چار) پَلَ (pala) (بہت سے) چلَ (čila) (تھوڑے) اور صفت مجموعی (Adjective of Totality)

---

[1] Scichari A.C.: Evolution of Malayalam PP. 55-85

جیسے الآم (ellam) سب وغیرہ کا استعمال بھی عربی اسماء کے ساتھ عام ہے۔ جیسے اورونبی (ایک نبی)، نال اولیا کبض (چار ولی)، چِل نبی کبض (تھوڑے انبیاء) پَلَ اولیا کبض (بہت سے اولیا) وغیرہ

۳۔ انعال (Verbs) ملیالم میں حال، مستقبل اور ماضی بنانے کے لئے مادہ (Base) کے حسب ذیل لاحقوں کا اضافہ کیا جاتا ہے۔

حال　　النو　(Unnu)

مستقبل　　اُم　(Um)

ماضی　　دو ~ ا　(ا ~ du)

عرب ملیالم میں اِن ملیالم لاحقوں کا عربی مادوں کے ساتھ استعمال ملتا ہے، کہیں یہ لاحقے براہ راست عربی مادوں کے ساتھ آتے ہیں اور کہیں ملیالم کے ایک بے ضابطہ ذیلی فعل (Irregular auxiliary verb) [aga] (ہونا) کی انگلی پکڑ کر جیسے:

حال　　غروباکنّ (غروب ہوتا ہے) نبیانّ (نبی ہوتے ہیں)

مستقبل　غروباکم (غروب ہوگا) قبولاکم (قبول ہوگا) قبراکم (قبر ہوگی)

ماضی　　مرسلائ (مرسل ہوکر) حیاتائ (زندہ ہوکر) ادقائ (ادق ہوکر)

۴۔ علامت نفی (Negation Marker) ملیالم میں "الآ" (illai) علامت نفی ہے اور یہ اسماء اور انعال دونوں کے ساتھ استعمال ہوتی ہے، عرب ملیالم میں بھی اس کا استعمال عربی اسماء و انعال کے ساتھ ہمیں ملتا ہے جیسے:

نبی الآ (نبی نہیں)، رسول الآ (رسول نہیں)، قبولاکو الآ (قبول نہیں ہوا) وغیرہ

۵۔ حروف جار (Post - Positions) اوپر اسماء کی حالتوں کے سلسلے میں جن حروف کا بحیثیت علامت حالت ذکر ہو چکا ہے ان کے علاوہ بھی بعض ملیالم حروف جار عربی اسماء کے ساتھ بکثرت استعمال ہوتے ہیں جن میں حرف عطف "اُم" (Um) خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر

ہے، یہ حرف بیک وقت عطف اور تخصیص دونوں کا کام دیتا ہے جیسے :

سَهَلُمُ سَعَدُمُ زِيَادُمُ يَزِيْدِيَمُ سَالِمُمُ تَيْسُمُ قَتَادَةَ يَنُوَرُ

(سہل بھی، سعد بھی، زیاد بھی، یزید نامی بھی، سالم بھی، اور قتادہ کہلانے والے بھی)

۶۔ ترتیب الفاظ (Word Order) : عرب ملیالم کے جو نثری نمونے ملتے ہیں ان میں جملوں کی ساخت اور ان جملوں میں الفاظ کی ترتیب بھی ظاہر ہے ملیالم ہی جیسی ہے یعنی عربی کی طرح پہلے فعل اور پھر فاعل و مفعول نہیں بلکہ اردو اور دیگر دراویڈی زبانوں کی طرح پہلے فاعل و مفعول اور پھر فعل، علاوہ ازیں حروف جار بھی عربی کی طرح سابقوں (Prefixes) کی شکل میں نہیں بلکہ اردو وغیرہ کی طرح لاحقوں (Suffixes) کی صورت میں ہیں، جیسے:

اللہ تعالیٰ اُرُوَانَان اَوَنْ یَاتِرُکُودُ کَارُمِلَّ اَوَنْ اِلاّ رِنْتُمْ کَژوضونَان اَوَن اَلّامُ اَرِيَنُوْنَانْ اَلّامُ كَانُنُّوْنَمُ كَيْفِبلَنْتُوْنُمَانَ اِلاّ پدِیلِکْضِبِّمُ اَوَنَانْ يَدِجِتَّ اَوَنْ نُمَکَ اَهَارَمُتَّنَ جِيْوَپَّنَ اَوَنْ اَدِ يِشِكَنُوْضْ نَمَضْ مُرْيِکِمَّمُ چَیْتَمْ اللہ وَے نِی جُنَّفْنُ مُسْلِمَايِ مَرِيِکَيِنَمُ آمین

(اللہ ایک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، وہ سب کا خالق ہے، وہ سب جانتا ہے، سب کچھ دیکھتا ہے اور سب کچھ سنتا ہے، وہ ساری مخلوقات کا خالق ہے، وہ ہمیں رزق دیتا اور زندہ رکھتا ہے اور جب چاہتا ہے مارتا ہے۔ اے خدا تو ہم کو مسلمان ہونے کی حالت میں موت دے آمین)

اوزان (Metres) : ملیالم کے اوزان شعر اس کے اپنے مخصوص ہیں اور جیسا کہ اوپر موپلا گیت اور کیشو گیتوں کے سلسلہ میں بیان کیا جا چکا ہے، عرب ملیالم میں بھی ان اوزان پر طبع آزمائی کی گئی ہے اور یہ وہاں کافی مقبول بھی ہیں لیکن اس وقت عرب ملیالم میں لکھے ہوئے اشعار کے جو نمونے ہمارے سامنے ہیں وہ سب عربی اوزان میں ہیں اور ان میں

ردیف وقافیہ کی پابندی بھی موجود ہے۔ یہاں بہ طور نمونہ چند شعر نقل کئے جاتے ہیں۔

جِیوودُ دُنیا دِلْ نِکّنَ نَاصِنْ آکِیَ ۔۔۔ جکُوَرُ حُسَینْرِی کَاوَلْ اَنِیکَ اللہ

نوُفوُتَ مَوْتِنْ سَمَیتّلْ ۔۔۔ لَوَرُ حُسَینْرِی کَاوَلْ آنِیکَ اللہ

(جب تک میں اس دنیا میں ہوں تو اے خدا حضرت حسین کے صدقے مجھے اپنی حفاظت میں رکھ، اور جب موت آئے اور میں نزع کی حالت میں ہوں اس وقت بھی تو مجھے حضرت حسین کے طفیل ایمان سے اٹھا)

تلَّی سَلَوَاتُمْ نلّیَ سَلَامَیُمْ ۔۔۔ یِنکفنُ مُحَمَّدَنُ یِیکَنُمْ نِی اللہ

(اے خدا سارے درود اور سارے اچھے سلام) (ہمارے نبی محمد مصطفی پر نازل ہوں)

غالب اور معراج الخیال پر ایک نظر

از جناب پروفیسر مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی صاحب مدرسہ عالیہ کلکتہ

برہان شمارۂ نومبر ۱۹۷۲ء کا مضمون (غالب اور معراج الخیال) پیش نظر ہے۔ لائق مضمون نگار نے میرے ایک سہو قلم کی تصویب میں کامیابی حاصل کی اور معراج الخیال مؤلفہ میر وزیر علی عبرتی کے زمانۂ ترتیب کے بارہ میں مجھ سے جو فروگذاشت ہوئی، اس کی نشاندہی فرمائی ہے۔ میں دونوں باتوں کے لئے ان کا شکر گذار ہوں اور تہ دل سے ممنون۔ اور اسی جذبۂ خلوص کے تحت عرض کرنا چاہتا ہوں کہ معراج الخیال کے زمانۂ ترتیب کی تحقیق میں انھوں نے دراصل پوری بات بیان نہیں کی۔ مزید برآں تیز روی کے نتیجہ میں وہ لاشعوری طور پر کئی لغزشوں کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں۔ لہذا سطور ذیل کا پیش کرنا ضروری معلوم ہوا۔

۱۔ اس میں شک نہیں کہ عبرتی نے معراج الخیال کو پہلے مرتب کیا ہے اور ریاض الافکار کو بعد میں۔ خود عبرتی نے دیباچۂ کتاب میں اس کی ترتیب کا سنہ ۱۲۵۷ ہجری بتایا ہے۔ لیکن وہ قطعۂ تاریخ جس میں (نظم روانی) سے یہ سنہ برآمد ہوتا ہے۔ عبرتی نے نہیں کہا بلکہ خود اس کی تصریح کے بموجب یہ قطعہ اس کے شاگرد سید علی بخش ملقب بہ امیر جان فرقتی کا نظم کردہ ہے۔ بہرحال عبرتی کی صراحت اور فرقتی کے تاریخی قطعہ کے باوجود ۱۲۵۷ھ/۱۸۴۱ء کو کتاب کے مکمل ہونے کا سنہ قرار دینا خلاف واقعہ

۱۔ دیکھئے معراج الخیال: ورق ۸۴/ب - ۸۵/ط؛ ریاض الافکار کا بھی یہی حال ہے کہ اس کی تکمیل پر قطعۂ تاریخ فرقتی نے لکھا ہے۔

معلوم ہوتا ہے۔ غالباً مضمون نگار کے سامنے معراج الخیال کی پوری نقل یا فوٹو گراف کاپی موجود ہے۔ وہ بہ آسانی مراجعت کر کے معلوم کر سکتے تھے کہ اندرون کتاب جا بجا ۱۲۵۷ھ کے سنین مثلاً ۱۲۶۲ھ، ۱۲۶۳ھ، ۱۲۶۴ھ بھی درج ہیں[1]۔ ان اندراجات کی بنا پر یہ کہنا کہ معراج الخیال کو عبرتی نے ۱۲۵۷ھ میں مکمل کر لیا تھا غلط ہے۔ اگر اس نے ۱۲۵۷ھ میں کتاب مکمل کر لی تھی تو اس کی کیا وجہ ہے کہ بعد کے مندرجہ بالا سنین بھی ملتے ہیں۔ یا تو یہ اندراجات جعلی قرار دیئے جائیں یا یہ کہا جائے کہ عبرتی نے ۱۲۵۷ھ میں معراج الخیال کو مکمل نہیں کیا بلکہ زیادہ سے زیادہ اس کی ترتیب کا آغاز کیا ہوگا۔ ورنہ اس کی تکمیل ۱۲۶۴ھ/۱۸۴۷-۴۸ء سے پہلے نہیں ہوئی۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اپنے قلم کی معمولی لغزش کے نتیجہ میں مجھ سے ایک فاش غلطی سرزد ہوگئی کہ میں نے ۱۲۶۴ھ کی جگہ ۱۸۶۴ء لکھ کر معراج الخیال سے پہلے ریاض الافکار کو قرار دے دیا۔ حالانکہ معراج الخیال کی ترتیب کا زمانہ یقیناً ریاض الافکار سے پہلے ہے لیکن گیارہ سال نہیں بلکہ چار سال پہلے۔ معراج الخیال کی بابت مذکورۂ بالا مسئلہ پر فہرست نگار Waldimir Ivanow نے بھی روشنی ڈالی ہے اور بعد کے سنین کو خود مؤلف کی نظر ثانی کا نتیجہ قرار دیا ہے[2]۔

۲۔ غالب سے شائق کی ملاقات کے سلسلہ میں عبرتی کی عبارت[3] جیسا کچھ ثبوت بہم پہنچاتی ہے اس سے زیادہ واضح کوئی دوسری سند مضمون نگار پیش نہیں کر سکے۔ اس کے بعد صرف یہ طے کرنا باقی رہ جاتا ہے کہ دونوں کی ملاقات کہاں ہوئی، کلکتہ میں یا کہیں اور؟ میں نے صراحت نہ ملنے کی بنا پر قرینہ سے لکھا ہے کہ (بہ ظاہر اس کا موقع غالب کے قیام کلکتہ کے دوران آیا ہوگا[4]) لیکن مضمون نگار

۱۔ ملاحظہ ہو معراج الخیال: ورق ۴ر ظ، ۱۴ ر ظ، ۷۹ ر ب، ۸۲ ر ظ

۲۔ Concise Descriptive catalogue of the Persian in the Curzon collection Asiatic Society of Bengal (Calcutta-1926) P.67

۳۔ برہان شمارہ اکتوبر ۱۹۷۲ء: ص ۲۸۰ (حاشیہ)

۴۔ ایضاً: ص ۲۷۹ — ۲۸۰ (حاشیہ)

نے ایک قدم آگے جست لگاکر دونوں کی ملاقات کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے (... کہا جاتا ہے کہ شائق کلکتہ اور دہلی آئے تھے، اور کلکتہ میں ہی غالب سے ان کی ملاقات ہوئی)[1] حاشیہ پر تلامذۂ غالب ص۱۶۸ کا حوالہ ملتا ہے، جس کی عبارت جچے تلے الفاظ پر مشتمل ہے (غالباً دہلی اور کلکتے بھی آئے تھے اور ممکن ہے کہ غالب سے ان کے قیام کلکتہ کے دوران میں ملاقات بھی ہوئی ہو) ۔ بہرحال میں نے عبرتی کی عبارت مندرجۂ معراج الخیال سے جو نتیجہ نکالا ہے اس کی بنیاد پر غالب سے شائق کی ملاقات ایک حد تک طے شدہ مسئلہ ہے ۔ اور منشی رحمٰن علی طیش کی تواریخ ڈھاکہ کے ضمیمہ[2] میں خواجہ محمد افضل نے جو کچھ لکھا ہے وہ بھی غلط نہیں، ان کو عبرتی کے بیان یا اس کے ہم معنی کسی دوسری روایت سے واقفیت نہیں ہو سکی لہٰذا وہ غالب سے شائق کی ملاقات کا ذکر نہیں کر سکے ۔ لیکن یہ تازہ ترین دعویٰ کہ (کلکتہ میں ہی غالب سے ان کی ملاقات ہوئی) کسی صریح دلیل پر اگر مبنی ہے تو خیر، ورنہ (کہا جاتا ہے) جیسے الفاظ کی بنیاد پر اتنا بڑا دعویٰ تسلیم نہیں کیا جا سکتا ۔ میں نے اپنے مضمون میں جو محتاط انداز بیان اختیار کیا، اس کی وجہ اب ظاہر کر دوں کہ غالب سے شائق کی ملاقات کا مسئلہ ہزار طے شدہ سہی، یہ ضروری نہیں ہے کہ دونوں کی ملاقات کلکتہ میں ہی ہوئی ہو ۔ اگرچہ زیادہ تر قرائن کلکتہ کے حق میں ہیں اور یہی وجہ ہے کہ میں نے خود کلکتہ کا ذکر کیا ہے ۔ لیکن مرشد آباد بھی ایک جگہ ہے جہاں ان دونوں کی ملاقات کا ایسا امکان ہے جس کو کسی صریح دلیل کے بغیر یک لخت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔

۳۔ مضمون نگار نے آگے ارشاد فرمایا ہے :

چونکہ غالب کی کلکتہ سے واپسی کے صرف تین سال بعد عبرتی کلکتہ پہنچے تھے اور ممکن ہے

۱۔ برہان شمارہ نومبر ۱۹۸۲ء : ص ۲۴۶

۲۔ تواریخ ڈھاکہ کے آخری صفحات میں شعرائے ڈھاکہ کا تذکرہ ملتا ہے جس کو خواجہ محمد افضل مرحوم نے قلمبند کیا ہے لہٰذا میں ان چند صفحات کو ضمیمہ سمجھتا ہوں ۔

کہ شائق اس عرصہ تک کلکتہ میں مقیم رہے ہوں، اس لئے غالباً حیدرجان شائق سے عبرتی کی
ملاقات کلکتہ میں ہوئی تھی[۱]۔"

راقم کے خیال میں (ممکن ہے) کا سہارا لے کر شائق کے قیام کلکتہ کو طول دینا اپنے اندر کوئی
معقولیت نہیں رکھتا۔ یہ محض قیاس آرائی ہے جس کی تائید دلائل تو کیا کسی قرینہ سے بھی نہیں
ہوتی۔ لطف یہ ہے کہ اس اختراع فائق کو بنیاد بناکر یہ تحقیق پیش کی گئی ہے کہ (غالباً حیدرجان شائق
سے عبرتی کی ملاقات کلکتہ میں ہوئی تھی) گویا میں نے جو لکھا ہے کہ:

"شائق سے عبرتی کی ملاقات جہانگیرنگر ڈھاکہ میں ہوئی تھی[۲]"

وہ مضمون نگار کو مسلّم نہیں۔ وجہ اس کی کچھ اور ہو تو میں کہہ نہیں سکتا، ورنہ بظاہر مجھ کو ایسا معلوم
ہوتا ہے جیسے ان کو عبرتی کے سفر جہانگیرنگر سے انکار ہے یا پھر اس کا مطلق علم نہیں۔ چونکہ میرے
مضمون کو اس مسئلہ سے راست تعلق نہیں تھا لہذا میں نے اپنی تحریر کے ثبوت میں مفصل طور پر
دینے کی ضرورت نہیں سمجھی تاہم عشقی سے شائق کے تلمذ کا ذکر کرتے ہوئے اخیر میں معراج الخیال
(ورق ۹۴ ب) کا جو حوالہ میں نے دیا ہے[۳]، اس کا مقصد یہ بھی تھا کہ نہ صرف عشقی سے تلمذ کا حو
بہم پہنچا دیا جائے بلکہ شائق اور عبرتی کی ملاقات جو جہانگیرنگر میں ہوئی، اپنے بیان کا یہ جزو بھی بے سن
نہ رہ جائے۔ مضمون نگار کے سامنے معراج الخیال کی منقولہ کاپی کا ہونا قرینہ سے ثابت ہے،
وہ زحمت فرما کر اس میں عشقی کا تذکرہ دیکھ لیتے تو عبرتی کا یہ بیان ان کو ضرور ملتا:

من راقم معنی شناس را اتفاق دیدن دیوان آن مرحوم بجہانگیرنگر ڈھاکا پیش یکے از مخلصان
شیریں زبان خواجہ حیدرجان متخلص بہ شائق کہ از شاگردان آن نازک تلاش

۱۔ برہان نومبر ۱۹۷۲ء : ص ۳۴۶

۲۔ برہان اکتوبر ۱۹۷۲ء : ص ۲۸۰ (حاشیہ)

۳۔ ایضاً : ص ۲۸۰ (حاشیہ)

باشد[1] ... افتادہ"

(معراج الخیال : ورق ۹۴ ب)

میں نہیں سمجھتا کہ اس کے بعد بھی عبرتی کے سفر جہانگیر نگر کے بارہ میں کسی کو شک و شبہ ہو سکتا ہے اور جب یہ بات بلاشبہ ثابت ہے تو شائق سے عبرتی کی ملاقات کے مسئلہ میں کوئی کیوں مفروضات پر چلنا گوارا کرے۔

اب جبکہ بات یہاں تک پہنچ چکی ہے اور عموم بلوی کا یہ حال ہے کہ ژرف نگاہی کی جگہ صرف طول و عرض کی پیمائش مرتبۂ بحث و تحقیق حاصل کرتی جارہی ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سفر جہانگیر نگر کے سلسلہ میں عبرتی کی دیگر تصریحات کی زبانی اس کی دلچسپ روداد ہم اپنے قارئین کے گوش گذار کریں۔

(۱) آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ دیوان عشقی کا نسخہ، عبرتی نے ڈھاکہ میں شائق کے پاس دیکھا تھا۔ شائق کے علاوہ اور کن لوگوں سے عبرتی کی دید و شنید رہی اور جب تک ڈھاکہ میں قیام رہا عبرتی کو اپنے ذوق مطالعہ کی تسکین کا سامان کس حد تک میسر آیا اور بعد میں جو کتابیں مرتب کی ہیں ان کے لئے مواد کی فراہمی کے سلسلہ میں جہانگیر نگر کے کن شخصی ذخیروں سے خوشہ چینی کرنے کا موقع ہاتھ آیا، یہ سب کچھ بالتفصیل عبرتی ہی کے الفاظ میں سن لیجئے:

(۲) خان زمان مرزا احمد طاہر آشنا (م ۱۰۸۱ھ) عہد شاہجہانی میں منصب ہزار و پنجصدی رکھتا تھا۔ ابوطالب کلیم اس کے بے تکلف دوستوں میں تھے۔ عبرتی کو اس کا دیوان ڈھاکہ ہی میں دستیاب ہوا تھا، لکھتے ہیں:

"دیوان آن کامل العیار من مکرر اوراق را جہانگیر نگر دیدہ بودم بہ چشم در آمدہ بزعم خود خالی از کیفیت نیافتہ" (معراج الخیال : ورق ۶ ر ظ)

۱۔ غیر متعلقہ جملوں کی ضرورت نہیں تھی لہذا حذف کر دیئے ہیں

(۳) فدائی جو بقول آزاد بلگرامی شیخ محمد لاہجی کا لڑکا تھا، اس کے دیوان کی بابت ہمیں یہ اطلاع ملتی ہے:

"دیوان آں سخن رس شیریں خیال رابس جستجو کردم، مگر دو سہ غزلے بر بیاض مشفق مرزا محمد صاحب کہ از روسائے ڈھاکہ باشد، البتہ بچشم فقیر در آمدہ، خالی از کیفیت نیافتم"

(معراج الخیال: ورق ۵۴/ب)

(۴) قاسم خان مخلص، اصلاً ایرانی تھا، پیدائش کشمیر میں ہوئی اس کی صرف چند غزلیں اسی سفینہ میں عبرتی کو مل سکی تھیں:

"اگرچہ دیوان آں معنی یاب، من مسود اوراق راکہ بجان جویائش بود، بچشم درنیامدہ مگر غزلے چند کہ در دلفریبی بر غزال چشم جادو نگہاں پیش دستیہا می ربود و بر دیدہ محو تماشائے نظارگیاں برنگ آئینہ ابواب حسرت می کشود، بر کہنہ بیاض میر محمد صاحب کہ یکے از رؤسائے جہانگیر نگر باشند البتہ اتفاق دیدن افتادہ"

(معراج الخیال: ورق ۶۶/ب)

(۵) مدہوش لاہوری عہد عالمگیری میں کسی عہدہ پر مقرر تھا۔ اس کی چند غزلیں شائق کے پاس تھیں:

"فقیر در زمانیکہ ہمرکاب محتشمی وارد دیار جہانگیر نگر ڈھاکہ بودم، غزلے چند از خواجہ حیدر جان شائق بدست افتادہ"

(معراج الخیال: ورق ۷۶/ظ)

(۶) مرزا محمد رفیع واعظ قزوینی طائفہ امامیہ کے مشہور واعظ و مصنف کے مجموعہ کلام کے متعلق لکھتے ہیں:

"ہیچ مدان را دیوانش بنظر درنیامدہ، مگر غزلے چند بر بیاض مشفق آغا عبدالعلی صاحب ہمدامن نواب سہراب جنگ بہادر دام شوکتہ، کہ از بزرگ زادگان جہانگیر نگر ڈھاکہ باشد، بدست افتادہ"

(معراج الخیال: ورق ۸۰/ب)

(۷) بینش کشمیری جس کا مندرج ذیل شعر نقل کئے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا :

نیم بسمل بگذارید کہ پرواز کنم
چشم دارند براہم قفس و دانہ ہنوز

اس کے دیوان کے بارہ میں لکھتے ہیں :

"دیوانش را خیلے جستجو داشتم، از اتفاقات یکے از ہم رحلان فقیر کہ شیخ ببر علی نام داشت از جائے بہم رسانده، بزمانیکہ بنده مقیم جہانگیرنگر دہاکہ بودم، بنشتہ فرستاده، قریب ده دوازده جز خواہد بود۔" (معراج الخیال : ورق ۱۶ ار ظ)

(۸) سلیم طہرانی، محمد قلی کے تذکره میں لکھتے ہیں :

"راقم در زمانیکہ مقیم شہر دہاکہ جہانگیرنگر بود، دیوان و مثنوی آن نازک خیال در کتب خانہ مشفق مرزا محمد صاحب برادر زن نواب سہراب جنگ بہادر دام شوکتہ، کہ جوانے است بس شگفتہ مزاج و رنگین طبع، دیده بود۔" (معراج الخیال : ورق ۵۷ ب)

منقولۂ بالا اقتباسات کے باوجود، آپ فرما سکتے ہیں کہ یہ احتمال اب بھی باقی رہتا ہے کہ شائق سے عبرتی کی ملاقات سفر جہانگیرنگر سے پہلے کبھی کلکتہ میں ہو چکی ہوگی، ان اقتباسات سے اس کی نفی نہیں ہوتی، نہ اس بات کی ان میں صراحت ملتی ہے کہ جہانگیرنگر پہنچ کر ہی شائق سے عبرتی پہلی بار ملے ہوں۔ لہٰذا ذیل کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے یہ آپ کے شکوک دور کرنے کے لئے کافی ہوگا۔

(۹) خواجہ اسد اللہ کوکب کے تذکره میں، کئی اہم باتوں پر مشتمل یہ بیان ملتا ہے :

"در زمانیکہ من محرر اوراق برکات[1] نواب بامروت و فرہنگ نواب سہراب بہادر جانب بقعۂ دلکشای دہاکہ شتافتہ بودم، بدولت خانۂ مکرمی خواجہ علیم اللہ صاحب دام اشفاقہ کہ دولتمندے است مردم شناس، و خیلے بخلق و کرم آراستہ، وصیت جوانمردی در آن ناحیہ انداختہ،

۱۔ اصل نسخہ : ببرکات

باایں نیکو سرشتان ہمہ اخلاق مثل خواجہ حیدر جان متخلص بہ شائق، وبدیں سخن سنج نغز کلام اتفاق ہمزبی دست داد، اگرچہ در ابتدائے ملاقات نوعی در سر ہوائے سخن سنجی داشتند مگر بعد از انکہ مایۂ مخالطت بمیان آمد و از استعداد راقم اوراق بمعیار ادراک ورزدند، بس سطفہا آن ہر دو وفا پرستان شیریں خیال بحال من فرا دمشرب مبذول داشتند، خصوصاً مشفقی خواجہ حیدر جان۔" (معراج الخیال : ورق ۶۲ ر ظ)

میرزا محمد جن کا ذکر کئی جگہوں میں آچکا ہے غالباً میرزا محمد خاں ہیں جو شہر ڈھاکہ کے قدیم آبائی زمینداروں میں سے تھے۔ان کی زمینداری پرگنہ بردہ کھادمیں پڑتی تھی اور اس کی ماہانہ آمدنی تین ہزار روپے کی تھی۔ جس سال نصرت جنگ نے انتقال کیا (۱۲۳۷ھ/ ۱۸۲۳ء) ٹھیک اسی سال مرزا محمد خاں کے والد مرزا محمد کاظم خان کشتی سے گر کر غرقاب ہوئے تھے۔ بقول منشی رحمٰن علی طیش ان کا مکان محلہ بچھارام کی ڈیوڑھی میں تھا۔ طیش نے مرزا کاظم خان کی لڑکیوں کے بارہ میں کچھ نہیں لکھا ہے۔اگر ہمارا قیاس صحیح ہے تو عبرتی کی تصریحات سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ نواب سہراب جنگ اور آقا عبدالعلی دونوں اسی میرزا محمد کاظم خان کے داماد تھے۔ میرزا محمد سے عبرتی کا تعلق ڈھاکہ سے واپسی کے بعد تک قائم رہا اور گاہ بگاہ خط و کتابت ہوتی رہی۔ جیسا کہ آیندہ معلوم ہوگا۔

نواب سہراب جنگ جن کی مصاحبت میں عبرتی نے جہانگیر نگر کا سفر کیا تھا، ان کا نام حسین قلی خان ہے۔ ان کی نشو و نما عظیم آباد میں ہوئی اور عبرتی سے ان کے تعلقات خاصہ بے تکلفی کے تھے۔ان کے والد نواب روشن الملک مبارک الدولہ محمد مہدی قلی خان بہادر شوکت جنگ تھے جن کی بارگاہ میں عبرتی نے پہلی بار ملازمت اختیار کی تھی۔ ریاض الافکار میں سہراب جنگ کا مستقل تذکرہ ملتا ہے۔[۳]

۱۔ تواریخ ڈھاکہ : ص ۱۸۸ ؛ آسودگان ڈھاکہ : ص ۱۴۷ ـ ۱۴۸ (۱۹۴۶ء)

۲۔ معراج الخیال ، ریاض الافکار (تذکرۂ عبرتی)

۳۔ ریاض الافکار (باب السین مہملہ)

آقا عبدالعلی کا ذکر طیش کی تواریخ ڈھاکہ میں ضمناً آتا ہے[1]۔ نائب ناظم جسارت خاں کی نسل سے آخری پنشن یافتہ نواب غازی الدین خان فیروز جنگ (م ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۳ء) نوعمری کے علاوہ اوباش مصاحبوں کے اثر میں عشرت کوشی کا شکار ہوکر رہ گیا تھا۔ آقا عبدالعلی ان چند خیرخواہوں میں سے تھے جو فیروز جنگ کو راہ راست پر لانے کی سعی و تدبیر میں پیش پیش رہے۔ غالباً یہ وہی آقا عبدالعلی ہیں جن کے پوتے آغا احمد علی نے مرزا غالب کی قاطع برہان کا جواب مؤید برہان کے نام سے لکھا۔

خواجہ علیم اللہ جن کے دولت خانہ پر عبرتی کی ملاقات خواجہ اسد اللہ کوکب اور حیدر جان شائق سے ہوئی، نواب سر خواجہ عبدالغنی کے والد ہیں ان کا انتقال ۱۸۵۴ء میں ہوا[2]۔ یہ ملاقات گویا ابتدائی دور کی ملاقاتوں میں سے ایک تھی، اولین ملاقات نہ تھی۔ عبرتی سے شائق وغیرہ کی پہلی ملاقات جو ہوئی تھی اس میں کچھ ایسا حادثہ رونما ہوا تھا جس سے فریقین میں تلخی پیدا ہوگئی تھی مگر یہ تلخی بہت جلد دور بھی ہوگئی۔ بہر حال اس حادثہ کی طرف عبرتی کی منقولہ بالا عبارت میں کچھ اشارہ موجود ہے۔

ڈھاکہ میں عبرتی کا قیام سات آٹھ مہینے کے قریب ضرور رہا۔ ایک خط بچپن کے ساتھی شاہ بخش حسین وحشتی[3] (م ۱۲۶۲ھ) کو لکھتے ہیں جو ڈھاکہ پہنچ کر غالباً ایک آدھ مہینے کے اندر

۱۔ تواریخ ڈھاکہ : ۱۶۴، ۱۶۶، ۱۶۹، ۲۲۵

۲۔ تواریخ ڈھاکہ : ص ۲۴۹۔ ۲۵۰؛ نیز : F. B. Bradley-Birt Twelve Men of Bengal, (Calcutta-1910) pp 174-175

۳۔ وحشتی کا آبائی مکان تلاڑنہ مضافات عظیم آباد (غالباً موجودہ تلاڑھا) میں تھا۔ لیکن پیدائش شیخ پورہ میں ہوئی۔ ان کا پدری سلسلۂ نسب قاضی حمید الدین ناگوری سے اور مادری سلسلہ مخدوم شاہ شعیب (شیخ پورہ) سے ملتا ہے، لکھنؤ میں انتقال کیا اور وہیں مدفون ہوئے۔ سراج الخیال ورق ۹، رظ، ریاض الافکار (تذکرہ وحشتی)

ہی لکھا گیا ہے۔ اس میں کئی اہم اطلاعات ملتی ہیں جو درج ذیل ہیں :

(الف) عبرتی ۱۱ جمادی الاول کو ڈھاکہ پہنچے۔ کس سال پہنچے اس کی صراحت نہیں کی ہے۔ بہرحال یوں رقمطراز ہیں :

"پس از نیاز پاشیہائے خادمانہ حرفے کہ برزبان خامہ گذارد، اینکہ یازدہم ماہ جمادی الاولی اتفاق پیوستن دہاکہ گشت۔ البتہ سوادے دلکش دارد۔"

(ب) یہ سفر جیسا کہ اوپر کہیں مذکور ہوا رکاب محتشمی یا نواب سہراب جنگ بہادر کی مصاحبت میں پیش آیا تھا۔ سفر کی صعوبت مشہور ہے لیکن اس سفر میں جیسے عبرتی کے سنہرے خواب پورے ہوئے۔ وہ ڈھاکہ پہنچ کر مصروف گلگشت ہو گئے اور کھل کر داد عیش دیتے رہے۔ ملاحظہ فرمایئے کس قدر صاف لکھتے ہیں :

"باقی انچہ از حال خود تواں نگاشت، روزانہ مرغ پلاؤ خوردن است، و آب یخ پرورده نوشیدن، و شب صہبائے پرنگالی کشیدن ....[1] سوگند بدرازی شب فراق کہ نسبت بوطن صد مرتبہ بخوش حالی می گذرد۔"

(ج) ڈھاکہ کے اصحاب علم و ادب کے بارہ میں عبرتی کی رائے بھی سن لیجیے، لکھتے ہیں :

"دہاکثرے از خامہ کوبان ونثر نویسان ہم کہ اتفاق ہم بزمی افتاد بے اختیار این مصرع برزبان آمد مصرع :

خرس درکوه بوعلی سینا"

میرے خیال میں عبرتی نے اس رائے میں سخت بے انصافی کی ہے اور باشندگان جہانگیر نگر کی مہمان نوازی و وسیع القلبی کا صلہ جس انداز میں دیا ہے اس سے آپ عبرتی کا بھونڈا پن سامنے آجاتا ہے۔ خواہ اسے ہم کسی وقتی جوش غضب کا نتیجہ ہی کیوں نہ قرار دیں۔

۱۔ ایک جملہ دانستہ حذف کیا گیا۔

(۸) عبرتی کے اس خط کی تاریخ معلوم نہیں ہوسکی لیکن ڈھاکہ پہنچنے کی جو تاریخ درج ہے اس کے بعد وہ ماہ محرم سے پہلے ڈھاکہ سے واپس ہونے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ لکھتے ہیں:

"بخت سازگار اگر مساعدت کند انشاء اللہ تعالیٰ تا ماہ محرم ازایں دیار بری آیم رہ بمدمان خود رامی بینم زیادہ خدائے کریم شب مہاجرت رالبحر رسا ناد۔"

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عبرتی اگر ماہ محرم میں واپس بھی ہوئے ہوں گے تو ڈھاکہ میں ان کا قیام آٹھ ماہ کے قریب ضرور رہا ہوگا۔

ڈھاکہ کے زمینداروں میں شیخ عنایت علی بھی گزرے ہیں۔ بہ قول طپش ان کا انتقال ۱۲۹۳ھ ہجری میں ہوا[1]۔ عبرتی کا ایک رقعہ ان کے نام بھی ملتا ہے جو بزمانہ قیام ڈھاکہ ابتدائی ایام ہی میں لکھا گیا ہے اس خط کے دو جملے آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

"بشرط تقاضائے محبت عالم ازل بمن حلقہ زن در شوق، دستوری تواں داد تا من سر بدامن غربت انداختہ، برائے دمے چند فائز انجمن ارم محسود گشتہ، حظے از بہزی دہم سخنی بردارم ؎

آیم بسر کوئے تو پویان پویان
مشتاق صفت وصل تو جویان جویان"

دیکھا آپ نے ان الفاظ کو ماقبل کی منقولہ رائے سے کیا نسبت ہے! افسوس ان خطوط کی روشنی میں عبرتی کا جو شخص ہوتا ہے وہ انسانی قدروں پر پورا نہیں اترتا۔ بہرحال دوسرا فقرہ جو میں نقل کرنا چاہتا ہوں، وہ حسب ذیل ہے:

" واگر بلحاظ قیل و قال کہ باشفیق خواجہ اسد اللہ[2] و مخلص خواجہ حیدر جان برلفظ بخت و طالع

۱۔ تواریخ ڈھاکہ، ص ۲۰۰۔ ۲۰۱، ۱۷۰

۲۔ اصل: خواجہ سد اللہ (؟)

رفتہ موجب تامل بود، اختیار بدست آن سردفتر مہرپرستانست، من مشتاق غریب چنداں مصر ہم نیستم کہ پاس خاطر یاران وطن نفرمایید۔"

یہ جملہ صاف بتا رہا ہے کہ عبرتی کی معرکہ آرائی خواجہ اسد اللہ اور خواجہ حیدر جان سے ان دو لفظوں کے سلسلہ میں ہوئی تھی اور غالباً یہ ملاقات کا پہلا موقع تھا جس کے اثرات کی طرف عبرتی نے اسد اللہ کوکب کے تذکرہ میں بایں الفاظ اشارہ کیا ہے:

"اگرچہ در ابتدائے ملاقات نوعے درسر ہوائے سخن سنجی داشتند"۔

اس کے بعد خواہ عبرتی کی قابلیت و دستگاہ کا لوہا فریق مقابل نے مان لیا ہو جیسا کہ خود عبرتی نے لکھا ہے، خواہ اسے ہم ان بھلے مانسوں کی کشادہ قلبی و جذبۂ مہمان نوازی سمجھیں جنہوں نے عبرتی کے دیوانہ انانیت سے پنجہ آزمائی کرنے کے بجائے مخاصمت کا جواب محبت و آشتی سے دیا، ہمیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس معرکہ کی داغ بیل خود عبرتی نے ڈالی تھی لیکن خوش قسمتی سے وہ اس کا خمیازہ کھینچنے سے بال بال بچ گئے اور صرف ان میزبانوں کے طرح دے جانے کی وجہ سے بچ سکے ؎

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

تفصیل ان تمام باتوں کی ذیل کے الفاظ میں سن لیجئے جو اپنے ایک استاد لالہ پٹن لال کے نام مکتوب میں عبرتی نے لکھا ہے:

"بعالی خدمت رمز فہم دلہاے مستندان مکرمی لالہ پٹن لال صاحب زاد مجدہ تحریر یافت:

مہر مجسم جناب استادنا، خدا سایۂ شفقت از سرم کم مکناد، ہیچمدان شاگرد عبرتی، عنوان رقیمہ نیاز بہ بسم اللہ عقیدت، ہر رنگ مصحف روے بیان ساختہ، بدینسان شرح دہ از حال خویش است۔ کہ چوں دو سہ روز بر ورود دہاکہ بسر آمد، روزے ایں مذاق نشناس از وادید شیخ غلام پیر کہ از بہین دولتمندان ایں دیار باشد، رفت۔ بعد از معرفت یکدگر و استفسار زاد و بوم، ساطے بتکلف تمام درانداختہ، تکلیف دست بکاسہ بردن بدین جانب زیاد کرد۔

وہ چہ دستار خوانی کہ از ہر قسم خوردنی با حلاوت بر آن چیدہ و قریب بہ بست تن از ملیدا پن
شہر پیرامونش نشستہ۔ ہمینکہ از خوردن تمام فراغ یافتہ، آنجملہ والا دستگاہان بر آمدہ،
سر کرسی جا گرفتند۔ ازیں میان خواجہ حیدر جان نام شاعرے کہ ملک الشعرائے این شہر بود،
کلانۂ سخن بدیں ہیچمدان وا کرد۔ بعد از راندن از ہر درے حکایتے، فرمود، صاحب! چیزے
از افکار خود لطف فرمایند کہ خیلے مشتاقم۔ این نارسیدہ بزم فہیدگی از افکار خود خدمتش
خواندہ مورد تحسین شد۔

چوں نوبت بخواندن اشعار بخواجہ صاحب افتاد۔ سر مطلع بیافتن سقے در غزل آن
خوش تلاش لب ناطقہ اش دوختم دگر مبادرت بخواندن شعر نفرمود۔
یاران صحبت کہ بزعم خود در پے الزام فقیر بودند، چوں بدیں رنگ دیدند، بیشتر بدیں
کس ہیرس گرویدہ با مہر دوستانہ پیش آمدند۔
سوگند بجان راستی کہ ایں ہمہ بیشی دستیہا محض بفضل قادر تواناست، بہ برکت دعائے
تہ دل مخلصان ورنہ ایں ہیچمداں واین رنگ گوئے سبقت ربودن۔ زیادہ خامہ عذر
خواہ ۔"

یہ ہے خواجہ حیدر جان شائق سے عبرتی کی پہلی ملاقات اور اس کی دلچسپ روداد۔ کیا اس کے
بعد بھی آپ یہی فرمائیں گے کہ (غالباً حیدر جان شائق سے عبرتی کی ملاقات کلکتہ میں ہوئی)؟؟
شیخ غلام پیر جن کا ذکر آخری اقتباس میں آتا ہے بظاہر میرزا غلام پیر ہیں جو شہر ڈھاکہ کے خاندانی
زمینداروں میں سے ایک تھے۔ ۱۲۸۳ھ میں ان کا انتقال ہوا۔
ڈھاکہ کا سفر عبرتی نے ۱۲۵۵ھ/۱۸۴۰ء۔ ۱۸۴۱ سے پہلے کیا ہوگا جو معراج الخیال کے
رتب کرنے کا آغاز ہے۔ اس لئے کہ اس کی ترتیب شروع کرنے سے پہلے کوکب اور شائق

۱۔ تواریخ ڈھاکہ: ص ۱۹۸ ۔ ۱۹۹، آسودگان ڈھاکہ: ص ۵۵ (ضمنی تذکرہ)

سے عبرتی کی ملاقات ہو چکی تھی۔ جیسا کہ خواجہ اسد اللہ کوکب کے تذکرہ کی عبارت منقولۂ بالا سے ثابت ہوتا ہے۔ لیکن عبرتی کے خطوط کا مجموعہ اگر ۱۲۵۳ھ/۳۷-۱۸۳۶ء[1] میں ترتیب پا چکا ہوگا تو اس سفر کو اس سے بھی پہلے سمجھنا چاہیئے۔ مجموعۂ خطوط کے دیباچہ میں ہمیں مؤلف کی یہ صراحت ملتی ہے (مگر دریں ایام کہ سنہ یکہزار و دوصد و پنجاہ و سنہ (؟) از ہجرت نبویست حسب ارشاد...[1] نواب حسین قلی خان بہادر سہراب جنگ ...[2] ترتیب دادہ شد) اس عبارت کا ایک لفظ رسم اصل نسخہ میں کچھ اس طرح مرقوم ہے کہ اس کو (سہ) اور (نہ) دونوں ہی پڑھا جا سکتا ہے۔ سہ پڑھنے کی تقدیر پر کہنا یہ چاہیے کہ سفر ڈھاکہ ۱۲۵۳/۱۸۳۷ سے کچھ پہلے پیش آیا ہوگا اور اگر نہ پڑھا جائے تو لازماً معراج الخیال کی ترتیب کا کام شروع کرنے سے بہت پہلے اس سفر کو قرار دینا چاہیئے۔

بہر حال ڈھاکہ سے واپسی کے بعد شاید عرصہ تک عبرتی کے دل میں اس کی یاد چٹکیاں لیتی رہی۔ اور دوبارہ ان کو اس شہر مینو سواد کے سفر کی حسرت رہ گئی۔ اس سلسلہ میں صرف ایک اقتباس اور پیش کرنا چاہتا ہوں جو مرزا محمد کے نام ایک مکتوب سے ماخوذ ہے:

"اکنوں کہ ایام فصل بہار رسیدہ است و چمن جائے مرغان خوش الحان گردیدہ، چہ گویدکہ حسرت ہمبزمی عالی چہ قدر ناخن زن پردۂ دل است۔ بیشتر در دل میرسد کہ یکبار باز خود را بدہاکہ می توان کشید۔ تا دولت دیدار آں مصدر لطف و کرم میسر آید۔ مگر بعد مسافت زنجیر پا می گردد۔ ہر شام و سحر دست بدعا کہ خدا ہمچو سببے برانگیزد کہ یکبار دگر ہم در انجمن آں شفیق کہ حکم پرستان دارد، در رسد و دل پر آرزو را صد انشراح بخشد ؎

آمنی دل چہار نمی خواہد آرزو ہا خدا نصیب کند"

عبرتی کے خطوط کا اقتباس میں نے اپنے ذاتی منقولہ نسخہ سے پیش کیا ہے جس کی اصل ایک مجموعہ رسائل میں تقریباً دس سال پہلے محترم ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو کے ذریعہ، علی گڑھ کے ایک سفر میں نظر نواز ہوئی تھی میں نے ان کی اجازت سے ایک نقل بھی رکھ لی تھی اس وقت ان اقتباسات کو پیش کرتے ہوئے میرا فرض ہے کہ بار دگر ان کی عنایتوں کا شکریہ ادا کروں۔ فقط

۱۔ کچھ الفاظ دانستہ حذف کر دیئے گئے ۲۔ کچھ الفاظ چھوڑ دیئے ہیں۔

Registered No. D. [illegible]

APRIL 197

Phone : 262815

حکیم مولوی محمد ظفر احمد پرنٹر و پبلشر نے یونین پرنٹنگ پریس دہلی میں طبع کراکر دفتر برہان سے شائع کیا

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

مرتب

سعید احمد اکبرآبادی

مِصباحُ اللغات

مکمل عربی اردو ڈکشنری

مرتبہ

ابوالفضل مولانا عبدالحفیظ بلیاوی

قیمت
اٹھائیس روپے

مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی

جلد ۷۰ | ربیع الآخر ۱۳۹۳ھ مطابق مئی ۱۹۷۳ء | شمارہ ۵

نظرات

انسوس ہے ۱۶ ر، ۱۷ ر اپریل کی درمیانی شب میں ہمارے علاقے اور دہلی کے مشہور و معروف صاحب خیر
حاجی اقبال احمد صاحب ۶۲ ، سال کی عمر میں رحلت فرما گئے ، مرحوم ۱۹۴۷ء کے انقلاب سے قبل پھاٹک حبش خاں میں
انڈے ، مرغی کی تجارت کرتے تھے ، انقلاب کے بعد جامع مسجد کے علاقے میں آ گئے اور یہی کاروبار اور مچھلی
کاروبار وسیع پیمانے پر کرنے لگے ، ہر شہر میں بڑے بڑے تاجر ہوتے ہیں ، حاجی صاحب بھی ایک بڑے
کاروباری تھے لیکن ان کی غیر معمولی خصوصیت یہ تھی کہ اول درجے کے صاحب خیر تھے ، امور خیر کی جستجو او
تلاش میں رہتے تھے اور اجتماعی اور ملی کاموں میں ذوق و شوق سے حصہ لیتے تھے ، یہی وجہ ہے کہ دور دور تک
ان کی شہرت تھی ۔ رمضان المبارک میں مدارس عربیہ کے سینکڑوں سفیران کے یہاں آتے تھے اور مرحوم بڑ
حوصلے سے ان مدرسوں اور دینی درسگاہوں کی خدمت کرتے تھے ، سفیروں کے ہجوم اور کثرت کی وجہ سے گذ
کئی سال سے یہ معمول بنا لیا تھا کہ رمضان المبارک کی ۱۱ تاریخ سے زکاۃ کی تقسیم شروع کرتے تھے اور پھر آخ
یہ سلسلہ قائم رہتا تھا ۔ مسجد مچھلی والان میں چندہ لینے والوں کی لائنیں لگ جاتی تھیں اور حاجی صاحب صبر و برداش
بلکہ خندہ پیشانی سے ان سب کی مدد کرتے تھے ، پتے لکھے ہوئے سیکڑوں منی آرڈر فارم علحدہ آتے تھے ج
کے بعد روانہ کیے جاتے تھے ، بیواؤں اور نادار شریف گھرانوں میں بیٹھی ہوئی نوجوان لڑکیوں کی شادیو
امداد کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا ، ویران اور اُجڑی ہوئی مسجدوں کی تعمیر اور آبادی میں والہانہ انداز
حصہ لیتے تھے ، رنگ روڈ پر شاہ بڑے کی حسین و جمیل اور وسیع مسجد ان کی حرارت ایمانی کی زبردست
ہے ، وزرائے اعظم کی سمادھیوں کے درمیان اس خوبصورت مسجد کے سبک میناروں کی عجیب شان نظر آتی
انقلاب سے پہلے یہ مسجد زیادہ آباد نہیں تھی ، اب اس میں وسیع پیمانے پر نماز تراویح ہوتی ہے اور عید
کی نمازیں بھی ، پانچوں وقت کی نمازوں کا بھی اہتمام ہے اور حاجی صاحب کی طرف سے باضابطہ امام
ہے ، محلہ کی مسجد کی توسیع و ترقی کے علاوہ اس کی مستقل آمدنی کا انتظام بھی کر گئے ۔

مرحوم کئی سال [illegible] ضعیف النفس [illegible] [illegible] کرتا [illegible] کے غفور [illegible]

تھے، اس کے ساتھ دیگر عوارض بھی جمع ہو گئے تھے، پریشانی کی حالت میں ہمدرد نرسنگ ہوم میں داخل کئے گئے، بڑے بڑے ڈاکٹروں نے ہمدردی و غمگساری سے علاج کیا، آپریشن اگرچہ نازک تھا بلکہ متعدد عوارض اور غیر معمولی ضعف کی وجہ سے انتہائی نازک ہو گیا تھا لیکن کامیاب رہا اور مشکل مرحلے آسان ہوتے گئے یہاں تک کہ تقریباً صحتیاب ہو کر ہسپتال سے آ گئے ہم سب مسرور تھے کہ ایک اعلیٰ درجے کے صاحب خیر اور نیک دل شخص کو دوبارہ زندگی مل گئی، انتقال سے ایک روز قبل بلکہ کہنا چاہئے کہ چند گھنٹے پہلے نیچے دوکان میں ہشاش، بشاش بیٹھے ہوئے تھے اور ہر دن سے بہتر تھے کہ شب میں ۲ بجے کے قریب دل کا دورہ پڑا اور روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن، مرحوم آج دنیا میں نہیں ہیں لیکن ان کے اعمالِ خیر ہمیشہ زندہ رہیں گے، اللہ تعالیٰ ان کے اکلوتے صاحبزادے عزیز حاجی شیخ سلطان احمد صاحب کو توفیقِ صبر و رضا سے نوازے اور اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق مرحمت فرمائے، امورِ دینی میں بھی اور امورِ دنیاوی میں بھی۔

دوسرا افسوسناک سانحہ ۶ر مئی کی شام کو محترم حاجی محمد صالح صاحب کی وفات کا پیش آیا، حاجی صاحب کئی سال سے معذور ہو گئے تھے اور صاحبِ فراش تھے، یوں بھی عمر طبعی کی سرحد پار کر چکے تھے لیکن چل رہے تھے اور ان کے صاحبزادے حاجی خواجہ محمد سلیم صاحب دل و جان سے ان کی خدمت کر رہے تھے، اس طویل مدت میں کبھی کبھی حالت نازک بھی ہو جاتی تھی مگر سنبھل جاتے تھے، ۶ر مئی کی صبح کو آخری سانس لینے لگے اور شام کے ۵ بجے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے، حاجی محمد صالح صاحب اپنی گوناگوں اور غیر معمولی خصوصیات کی وجہ سے دہلی والوں میں ممتاز بلکہ لاجواب تھے اور اپنی ذات سے صحیح معنی میں ایک انجمن تھے، اجتماعات اور مجالس کی رونق اور جان۔ سوسائٹی کے ہر طبقے میں مذہب و ملت کے امتیاز کے بغیر مقبول تھے اور قدر و منزلت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، ان کی فرم "حاجی علی جان" نہ صرف دہلی کی بلکہ پورے ملک کی روایتی فرم تھی، ایک زمانے میں اس کا کاروبار نہایت وسیع تھا، اور دہلی اور حجاز دونوں جگہ بڑے پیمانے پر لین دین ہوتا تھا، فرم حاجی علی جان کی امانت و دیانت کا عام شہرہ تھا، اس فرم میں لاکھوں روپے کی امانتیں رہتی تھیں۔ حج کو جانے والے بے جھجک لاکھوں روپے اس فرم میں جمع کراتے تھے اور مکہ معظمہ میں صرف رقوم [illegible] مسلمان

کے لیے ریزرو بینک سے بھی زیادہ معتبر و مستند تھی، حاجی صاحب مرحوم اس تاریخی فرم کے مالک تھے،
قومی اور ملی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے، ایک وقت میں بڑے بڑے اہم اجتماعات کوٹھی
حاجی علی جان ہی میں ہوا کرتے تھے، حاجی صاحب کے والد محترم حاجی عبدالغفار صاحب جن کی ہم
نے بھی بارہا زیارت کی تھی حکیم محمد اجمل خاں اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے ندیم خاص تھے، امام
صاحب جامع مسجد، نواب ابوالحسن خاں، نواب فیض محمد خاں وغیرہ اصحاب کی ایک خاص مجلس
تھی اور دہلی کے اکثر مسلم مسائل اسی مجلس کے گرد گھومتے تھے، حاجی محمد صالح صاحب نے بھی اپنے
بچپن اور جوانی میں ان اکابر کی مجلس میں شریک ہو کر کسب فیض کیا تھا۔

مسلک کے اعتبار سے اہل حدیث سمجھے جاتے تھے لیکن ان کی پاک روح پر مذہبی گروہ بندیوں
کی پرچھائیں تک نہیں پڑی تھی، رواداری اور وسیع المشربی کا صاف وشفاف پیکر تھے اور حقیقی معنیٰ
میں قومی یک جہتی کی نشانی، راسخ العقیدہ قوم پرور تھے، ۱۹۴۷ء کے ہنگامۂ بربریت میں ماریں
بھی کھائیں جان کو خطرے میں بھی ڈالا لیکن اپنے طے شدہ مسلک پر چٹان کی طرح جمے رہے،
عین اُس وقت بھی دکان پر جاتے تھے جب نئی سڑک سے گزرنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں تھا۔

جب تک چلنے، پھرنے کے لائق رہے عید، بقرعید کے موقع پر ہم لوگوں کو ساتھ لے کر
جواہر لال جی، مولانا آزاد اور دوسرے حضرات کے یہاں بڑے اہتمام سے جاتے تھے
اور اس طرح دیرینہ روایات تازہ ہو جاتی تھیں، جواہر لال جی سے تو زبردستی معانقہ
کیا کرتے تھے، مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب مرحوم کے دور میں مغرب کے بعد سے رات کے
۱۰، ۱۱ بجے تک جمعیۃ علماء ہند کے دفتر میں مجلس گرم رہا کرتی تھی اور اس میں ہر طرح کے
مسائل زیر بحث آیا کرتے تھے، حاجی صاحب ہر مسئلے سے پوری دلچسپی لیتے تھے۔

اللہ تعالےٰ ان کے درجات بلند فرمائے، اب ایسے باوضع بزرگ تلاش کرنے
سے بھی نہیں ملیں گے۔

رسول شاہد و مشہود

(۹)

(از جناب قاری بشیر الدین صاحب پنڈت ایم، اے)

الغرض خدائے عزوجل کی قدرتیں اور اس کی حکمتیں اتنی بے شمار و لا تعداد ہیں کہ کسی کی یہ طاقت نہیں کہ اس کے تکوینی امور کی کنہ کو پا سکے۔ اس کی ذات تو ورار الورار ہے تو پھر اس کی لامحدود مخلوق کا انسانی عقلیں جو کہ محدود دائرہ میں مقید ہیں کیسے انتہا کو پا سکتی ہیں جو اس مضمون کو شری گورو جی نے کتنے سنہرے الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

انت نہ جاپے کیتا آکار   انت نہ جاپے پارا وار

(جپ جی بانی صـ۵)

نی اللہ تعالیٰ کی قدرت کی کوئی انتہا نہیں۔ اس کی قدرتوں کے آرپار کا احاطہ کون کر سکتا ہے؟ بہرحال مذکورہ بالا اقتباسات سے پتہ چلتا ہے کہ گرونانک جی مہاراج اللہ تعالیٰ کی صفات ے دلدادہ پرستار اور پرچارک تھے۔ ایسے خدا پر ایمان لانے کے بعد سکھ دھرم اور اسلام دونوں کسی رکھ یہ اجازت نہیں دیتے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مقدس ذات کے علاوہ کسی دیگر مخلوق کی پرستش کرنے ں اپنا وقت ضائع کرے۔ گرو جی مہاراج کا فرمان ہے کہ:

سے کوئی لیجے چندر سورج یہ کوئی دھرتی اکاس منا ے

پھوکٹ دھرمی بھرم بھلاوے

(وار محلہ ۱ پوڑی ۱۸)

میں جو لوگ چاند اور سورج کی پرستش کرتے ہیں یا زمین و آسمان کے پجاری ہیں وہ بیکار اپنا وقت برباد کر رہے ہیں۔ گروجی کا یہ فرمان قرآن پاک کی تعلیم کے عین مطابق ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ملاحظہ ہو:

"ومن آیاتہ اللیل والنہار والشمس والقمر۔ لا تسجدوا للشمس ولا للقمر واسجدوا للہ الذی خلقھن ان کنتم ایاہ تعبدون ۔ (پارہ ، رکوع) یعنی اس کے نشانوں میں رات بھی ہے اور دن بھی۔ سورج بھی ہے اور چاند بھی۔ تم نہ سورج کی پرستش کرو اور نہ چاند کی پوجا کرو بلکہ خدائے واحد ہی کی پرستش کرتے رہو جس نے ان دونوں کو پیدا کیا ہے اگر تم سچے موحد ہو۔" مختصراً یہ ہے خلاصہ گروجی کی بنیادی تعلیم کے پہلے اصول "نام" کا جو بعینہٖ عکس ہے اسلامی تعلیمات کا۔

دان (۲) شری گورونانک جی مہاراج کی بنیادی تعلیم کا دوسرا اصول ہے "دان" جس کو آپ نے زکوٰۃ کے نام سے بھی یاد کیا ہے۔ "دان" یا "زکوٰۃ" دونوں کا مقصد ایک ہے یعنی غریبوں، محتاجوں، مسکینوں، مسافروں، اپاہجوں اور بیواؤں کی دیکھ بھال۔ گروجی کے نزدیک ہر ایک انسان جو کچھ کماتا ہے یا جو بھی اسے اللہ کے فضل سے حاصل ہوتا ہے اس میں غریب انسانوں بلکہ جانوروں کا بھی حصہ ہے جو لوگ اپنی ساری کمائی خود ہی کھاتے ہیں اور اپنا ہی پیٹ بڑھاتے ہیں وہ لعنت کے حقدار ہیں فرماتے ہیں:

(ا) پھٹ او بہا جیویہ جت کھائے وَدھایا پیٹ (وار سوہی۔ سلوک محلہ ا ص۹)

(ب) لام لعنت برسے تنہاں جو زکواۃ نہ کڈھدے مال (جنم ساکھی بھائی منی سنگھ ص۱۰)

گروجی نے لوگوں کو بتایا کہ انسانی زندگی کا مقصد محض کھانا اور کمانا ہی نہیں ہے بلکہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کا ادا کرنا بھی ضروری ہے۔ جو لوگ محنت کی کمائی میں سے اللہ تعالیٰ کے نام پر غریبوں اور مسکینوں وغیرہ پر خرچ کرکے حقوق العباد ادا کرتے ہیں وہی اللہ تعالیٰ کے راستہ کو شناخت کر سکتے ہیں اور وہی اس کی بخششوں کے وارث ہوتے ہیں۔

ارشاد گرامی ملاحظہ ہو:

(ا) گھال کھائے کچھ ہتھوں دے + نانک راہ پہچانڑ ہیں سے (وار سارنگ سلوک محلہ ا ص۱۲۴۵)

(۲) جتھے پنچ سنبھالیے تیتھے ندرز (ندر) تری بخشیش (سری راگ محلہ ا صہ ۱۵)

اِس کے برخلاف جو لوگ غریبوں، مسکینوں، حاجتمندوں اور مسافروں وغیرہ کا حصہ ادا نہیں کرتے وہ مُردہ خور ہیں۔ غریبوں کا حصہ تلف کرنا اللہ اور اس کے حبیب جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند نہیں۔ قیامت میں وہ شفاعت سے محروم رہیں گے کیونکہ وہ مُردہ خور ہیں۔ فرماتے ہیں:

ع حق پرایا نانکا اس سؤر اس گا ئے
گور پیر حامد تاں بھرے جاں مردار نہ کھائے
گلیں بہشت نہ پائیئے چھوٹے سچ کمائے

(وار ماجھ سلوک محلہ ا صہ ۱۴۱)

اس بانی کا دوسرا اپد اس طرح بھی ہے:

"محمد حامد تاں بھرے جاں مردار نہ کھائے"

(ملاحظہ ہو جنم ساکھی از سوڈھی میرباں)

یہ جنم ساکھی خالصہ کالج امرتسر سے شائع ہوئی ہے۔ مذکورہ بالا بانی کی تشریح قاضی کو مخاطب کرتے ہوئے اس طرح کی ہے:

"ہے قاضی! مناہی کس کا ناؤں ہے؟ جے خدائے کی کلام ہے، سے حضرت رسول کہی ہے.... جے پرایا حق ہے سو بھی خدائے اور حضرت منع کیا ہے کہ جے مسلمان ہوئے کے پرایا حق کھائے گا سے مُردار کھائے گا، پرایا حق نہیں کھانا۔ حدیث حضرت وِچ لکھیا ہے.... اے قاضی! محمدؐ کس دی حامی بھرے گا، جے ایہہ مردار نہ کھائے گا حق پرایا، تس ہی کو کہے گا ایہہ میرا ہے اور میرے دین وِچ آیا ہے اس کو بخشے جی۔ پر جو یہ پرایا حق کھایا ہے ایہہ بھی مردار ہے تناں دی محمدؐ حامی نہ بھرے گا"

(جنم ساکھی گرو نانک جی صہ ۹۵، بیدمشک)

سکھ بھائیوں کی دوسری کتب میں اپنی کمائی کا دسواں حصہ لوگوں کی فلاح و بہبودی پر خرچ کرنے کی تلقین کی گئی ہے اور اس کے لئے "دسوندھ" کی اصطلاح مقرر کی ہے۔
چنانچہ مرقوم ہے کہ:

ے دس نکھ (دسواں) جو کار کماوے تان کر جو دھن گھر میں پاوے
اس لئے گورو "دسوندھ" جو دئی سنگھ سوجس وہ جگ میں لیئی

(خالصہ ریت پرکاش ص۱۵)

یعنی "گرو جی کا پیرو سکھ اپنی محنت کے نفع میں سے دسواں حصہ گرو کے لئے وقف کر دے اس طرح جو گورو دسوندھ" دے گا وہ اس دنیا میں شہرت کمائے گا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ ہدایت بھی کی ہے کہ دان دینا اور یہ خواہش کرنا کہ لوگ اس کی تعریف کریں ایک فعل عبث ہے۔ ریاکاری کا پن دان کرنے سے اور تیرتھوں پر اشنان کرنے سے کوئی شخص حقیقی پاکیزگی اور اللہ کی محبت کو حاصل نہیں کر سکتا۔ ارشاد ہے:

ے ہر پریت پیارے شبد وچارے تس ہی کا سو ہووے
پن دان انیک نہاوان تد کیوں انتر مل دھووے

(گوڑی محلہ ا ص ۲۴۳؛ بدر ص نومبر ۱۹۶۹ء)

حقوق العباد کی ادائیگی کے لئے گرو نانک جی مہاراج نے "لنگر کی رسم" جاری کرنے کا اپدیش دیا تاکہ اس کے ذریعہ غریبوں، مسکینوں، اپاہجوں اور یتیموں وغیرہ کو مفت کھانا کھلایا جاسکے اور اس کھانے میں ملک وملت اور مذہب وقوم کی کوئی تفریق نہ کی جاوے۔ تفصیل کے لئے گورو پرتاپ سورج گرنتھ راس ۹، انسو ۴ ملاحظہ فرمائیں۔

گورو نانک جی کی زندگی کا مندرجہ ذیل واقعہ اس امر کا شاہد ہے کہ آپ کے دل میں نسل انسانی کا ہی نہیں بلکہ بے زبان جانوروں کا بھی بہت درد تھا اور ان کی تکلیف کو دور کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ "ایک مرتبہ داؤد نام کے ایک جولا ہے نے گورو جی کے لئے

خوبصورت غالیچہ تیار کیا اور گوروجی سے عرض کیا کہ وہ اس غالیچہ کو بچھا کر اس پر تشریف رکھا کریں۔ گوروجی نے فرمایا کہ ہمارے لئے ہمارے رب العزت نے زمین کا ایسا غالیچہ بچھایا ہے جو کبھی پرانا نہیں ہوتا۔" جنم ساکھی میں اس کے آگے مرقوم ہے کہ " قریب ہی ایک کتیا نے بچے دئے ہوئے تھے جو سردی سے ٹھٹھر رہے تھے۔ گوروجی نے فرمایا اے داؤد یہ غالیچہ اس کتیا پر ڈال دو اور اسے چوری بھی کھلایا کرو۔" (جنم ساکھی بھائی بالا صفحہ ۵۸۸-۸۹)

اس واقعہ سے واضح ہے کہ گوروجی کے پاک دل میں جانوروں کے لئے بھی کتنی محبت تھی اور وہ ان کے دکھ کو بھی اپنا دکھ تصور کرتے تھے۔ یہی حقوق العباد کی بہترین تصویر ہے کہ خدائے تعالیٰ کی مخلوق کا خیال رکھا جائے۔

(۳) اشنان: گوروجی مہاراج کی تعلیم کا تیسرا بنیادی اصول یہ ہے کہ انسان کو اپنے جسم و جان کے حقوق کی ادائیگی کا بھی خیال رکھنا ضروری ہے۔ اسے رہبانیت پسند نہیں ہونا چاہئے بلکہ اسی دنیا میں دنیا والوں کے ساتھ رہ کر پاکیزہ زندگی بسر کرنا ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حدود کے اندر رہ کر ممکن ہے ورنہ پھر شتر بے مہار کی طرح زندگی بسر کرنا اپنے جسم و جان کے حقوق کو تلف کرنا ہے۔ گوروجی نے اپنی تعلیم کے اس اصول کا نام "اشنان" رکھا ہے۔ جس طرح اشنان کرنے سے جسم کی ظاہرہ گندگی و غلاظت دور ہو جاتی ہے اسی طرح اس "اشنان" سے یعنی اپنے جسم و جان کے حقوق کو اللہ کے بتائے ہوئے طریقہ سے ادا کرنے پر انسان ہر قسم کی جسمانی و روحانی بیماریوں سے محفوظ رہتا ہے جیسا کہ گوروجی نے فرمایا ہے:

ع کر اشنان سمر پربھ اپنا، من تن بھئے اروگا (سورٹھ محلہ ۵ صفحہ ۶۱۱)

اس جگہ لفظ "اشنان" کو اس کے محدود معنی کے بجائے گوروجی کے اصطلاحی معنی میں سمجھنے کی طرف دھیان دیجئے جیسا کہ ارشاد ہے:

سے سُچے ایہہ نہ آکھیئن بہن جے پنڈا دھوئیے (بہن بمعنی بیٹھنا)

سُچے سیئی نانکا جن من وسیا سوئے (وار آسا سلوک محلہ ۱ صفحہ ۴۷۲)

یعنی ؎ جسم کو مَل مَل کے دھونا یہ تو کچھ مشکل نہیں
دل کو جو دھو دے وہی ہے پاک نزدِ کردگار

دل کا دھونا یہی ہے کہ انسان اپنی خواہشاتِ نفسانی کی پیروی کے بجائے اللہ تعالیٰ کی مقررہ حدود کے اندر رہ کر صرف اسی کے احکام پر عمل کرے۔ اس سلسلہ میں شری گورو جی نے کھانا و خوراک، پوشش و لباس، آنکھ، کان، ناک، زبان، ہاتھ پیر وغیرہ کے استعمال کے متعلق جو ہدایات دی ہیں وہ سب کی سب وہی ہیں جو قرآن پاک میں درج ہیں۔ مثلاً آنکھ کا انسان پر یہ حق ہے کہ غیر محرم کی طرف نہ دیکھے۔ غیر محرم عورتوں کی طرف دیکھنے کو آنکھوں کی غلاظت بتایا ہے۔ گرو جی نے بھی یہی ہدایت کی ہے چنانچہ ارشاد ہے کہ:

؎ آکھی (آنکھیں) سوتک (ناپاک) دیکھناں پر تریہ پر دھن روپ
(وار آسا سلوک محلہ ۱ صفحہ ۴۷۲)

زبان اور کان وغیرہ کی غلاظت کے متعلق فرمایا ہے: ع

(۱) مَن کا سوتک لوبھ ہے، جِہوا (زبان) سوتک کوڑ جھوٹ بولنا
(۲) کنّی (کان) سوتک کنّ (کان) پَے لائے تباری (غیبت) کھائیں۔

یعنی حرص و آز سے انسان کا دل اور جھوٹ بولنے سے زبان گندہ ہوتی ہے۔ کان ناپاک ہوتے ہیں غیبت کی باتوں پر کان لگانے سے۔ گرو جی کی اس تعلیم سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو اعضاء آنکھ، کان، زبان وغیرہ دئے ہیں ان کا غلط استعمال نہ کیا جائے۔ ایسا کرنا جسم و جان کے حقوق کو تلف کرنا ہے چنانچہ آپ نے ایسی غذا و خوراک کے استعمال کی ممانعت کی ہے جو انسان کے اعضاء پر بُرا اثر ڈالتی ہے۔ اس سلسلہ میں آپ فرماتے ہیں کہ:

ع بِکھ کھانا، بِکھ بولنا، بِکھ کی کار کمائے (پربھاتی محلہ ۱ صفحہ ۱۳۴۳)

یعنی جو لوگ زہر کھائیں گے اس کا اثر ان کے کلام اور اعمال پر لازمی ہوگا۔ ان کی زبان

بھی زہریلی ہوگی اور عمل بھی زہریلے۔ لہٰذا ایسی خوراک اور پوشاک بھی استعمال نہ کی جائے جو اس کو جسمانی یا روحانی بیماریوں میں مبتلا کرنے والی ہو۔

المختصر انسان کی دینی و دنیوی زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے شری گورو جی مہاراج نے جو اصول بتائے ہیں وہ سب قرآنی اصول ہیں۔ ہمارے سکھ دوستوں کو سنجیدگی کے ساتھ اس پر وچار کرنا چاہیئے۔

یوم آخرت

اور ساتھ ہی ساتھ اس بات کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ اور دینی مسلکوں کے برخلاف گورو نانک جی نے اس بات کی بھی تلقین کی ہے کہ انسان کہیں غلطی سے یہ نہ سمجھ لے کہ اسے اپنی زندگی اسی دنیا میں گذارنا ہے یہ زندگی تو چند روزہ ہے۔ حیاتِ جاودانی تو مرنے کے بعد شروع ہوگی اور اس چند روزہ زندگی کے اعمال کا حساب یوم آخرت میں اپنے مالک و مولیٰ کو دینا ہوگا۔ گرونانک جی نے اس اسلامی عقیدہ کو اپنی پاکیزہ زبان سے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ:

سبھناں کا در لیکھا ہوئے   کرنی باجھوں تَرے نہ کوئے

(بحوالہ بدر صـ۱۲ مورخہ ۲۰ نومبر ۱۹۶۹ء)

یعنی ہر شخص سے اس کے اعمال صالحہ کا حساب لیا جائے گا اور بغیر اعمال صالحہ کوئی بھی نجات نہ پا سکے گا۔

الغرض شری گورو نانک جی نے اپنے مقدس کلام میں یہ تعلیم نہایت کھلے اور واضح طور پر بیان کی ہے کہ ہر شخص کو اپنی زندگی با مقصد اور کامیاب بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ نام، دان اور اشنان کی طرف کماحقہ توجہ دے۔ اس کے بغیر کسی شخص کا نجات پانا اور واصل الی اللہ ہونا مشکل ہی نہیں بلکہ ایک امر محال ہے۔

بزرگانِ دین اور مشائخ طریقت نے وصالِ خداوندی کے لئے پانچ منزلیں بیان کی ہیں۔ گرو جی نے بھی زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے ان کو ضروری قرار دیا ہے۔ وہ منزلیں

یہ ہیں:

(۱) دھرم کھنڈ یعنی اللہ و رسول (گرو) کا کلمہ پڑھ لینے کے بعد زندگی احکام خداوندی کے تحت گذارنا۔

(۲) گیان کھنڈ یعنی عرفان حاصل کرنے کی منزل من عرف نفسہ فقد عرف ربہ یہ عارفین کی منزل ہے۔

(۳) نرم کھنڈ یعنی کثرت عبادت و ریاضت کے ذریعہ راہِ مولیٰ طے کرنے کی جدوجہد۔ یہ سالکین کا درجہ ہے۔

(۴) کرم کھنڈ یعنی بفضل ایزدی اعمال صالحہ کا خوگر بن جانا۔ یہ ابرار و صالحین کی منزل ہے

(۵) سچ کھنڈ یعنی واصل الی اللہ ہونا۔ یہ صدق و صفا کی منزل ہے۔ یہ صدیقین کا مرتبہ ہے جو ہر وقت وصال خداوندی سے سرفراز اور بارگاہِ خداوندی میں باریاب ہوتے ہیں ان کی تمام تر توجہ اللہ کی طرف ہوتی ہے۔ یہ انسانیت کا سب سے بلند درجہ ہے جہاں "حسنات الابرار سیئات المقربین" بن جاتے ہیں۔ تو پھر اس منزل پر پہونچکر مقربین و صدیقین کا مرتبہ اللہ کے نزدیک کتنا ارفع و اعلیٰ ہوگا یہ وہی بہتر جانتا ہے۔ آخر میں گرو نانک جی نے زندگی کے اصل مقاصد پر روشنی ڈالی ہے اور اس کے حصول کے ذرائع بتائے ہیں جو سب اسلامی معیار کے مطابق ہیں۔ فرماتے ہیں کہ زندگی کو باکار بنانے کے لئے ضروری ہے کہ:

(۱) تقویٰ حاصل کرے اور اس پر استقلال سے کام لے۔ غور و فکر کی عادت ڈالے۔

(۲) عقل سے کام لے اور روحانیت کو سمجھنے کی کوشش کرکے عرفانِ حق حاصل کرے۔

(۳) زہد و ریاضت میں سرگرم رہے اور راہِ مولیٰ طے کرنے کی جدوجہد برابر جاری رکھے

(۴) خالق اور اس کی مخلوق سے محبت رکھے اور صالح اعمال کے ذریعہ اس کا عملاً ثبوت دے

(۵) خدائے تعالیٰ کے سچے نام کا ورد رکھے یہاں تک کہ "من تو شدم تو من شدی" کا مصداق بن جائے۔ یاد رکھو بطور ایک ٹکسال کے ہے جس میں تو خدا کے پاک نام کی مہریں بنا سکتا ہے

تو مہریں بنالے ورنہ تجھے خالی ہاتھ لوٹنا پڑے گا اور تیری زندگی اکارت جائے گی کیونکہ قیامت کے دن تجھے اپنے اعمال کا حساب دینا ہے اس لئے:

(۱) بھٹی لے کر تقویٰ کی — تو استقلال سنار بنا
(۲) عقل کو اپنی لیکر آیرن — گیان کا تو اوزار بنا
(۳) کھال خدا کے نام کی لیکر — تپ کا تاؤ تپاتا جا
(۴) پریم کٹھالی رکھ کر من کی — آگ ذرا بھڑکاتا جا
(۵) لافانی ہے اصل حقیقت — اس کو لیکر ڈھال یہاں
(۶) گڑھ لے سچے نام کی مہریں — رکھ سچی ٹکسال یہاں

(جپ جی بانی مٹ پوڑی ۳۷)

__شری گورو نانک جی کی تعلیم کا جائزہ اسلامی نقطۂ نظر سے__ شری بابت نانک جی کی بنیادی تعلیم پر آپ سنجیدگی کے ساتھ غور فرمائیں تو وہ از اول تا آخر اسلامی رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ گرو جی جو بلاشک وشبہ عارف باللہ تھے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ چکے تھے کہ اگر دنیا میں واقعی ہم آہنگی و یکجہتی کو پروان چڑھانا ہے اور بنی نوع انسان کو باہمی پریم و محبت کا درس دینا ہے تو پھر یہ اشد ضروری ہے کہ اسلام کے بنیادی اصولوں پر یقین کرکے انھیں عملی جامہ پہنایا جائے اور اس طرح عالم انسانیت کو جو رنگ ونسل اور قوم ومذہب کے غلط تصورات کے باعث تین تیرہ ہے ایک مرکز پر جمع کرکے انسان کو بین الاقوامی انسان (یعنی مسلم) بننے کی دعوت دی جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے جو تعلیم گورو جی مہاراج نے دی ہے وہ یقیناً اسلامی ہے جیسا کہ سطور ذیل سے ظاہر ہے۔

__توحید و رسالت پر ایمان لانا__ گرو گرنتھ صاحب کا پہلا اشلوک شعر ہے:

اول نام خدا دا، دوجا نام رسول
تیجا نام پڑھ لے نانکا درگاہ پوے قبول

اس شعر میں کلمۂ اسلام یعنی توحید ورسالت کا اقرار ہے اسی پر انسان کی نجات اور بارگاہِ خداوندی میں قبولیت موقوف ہے اور اس کے اقرار کے بعد آدمی اسلام میں داخل ہوجاتا ہے۔ مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کو نانک جی کے مسلمان ہونے میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ وہ روحانی طور پر بابا فرید گنج شکرؒ کے خلیفہ ہیں اور بابا صاحب کی خانقاہ عالیہ کے سجّادہ نشین شیخ ابراہیم (فرید ثانی) سے فیض پایا ہے (ملاحظہ ہو تذکرۃ الرشید ص۲۳۲ تا ص۲۳۸) اور ان کے ساتھ دس برس تک رہ کر لوگوں کو راہ راست پر لانے کی کوشش کی ہے (بحوالہ اخبار موجی ۱۸، جنوری ۱۹۳۹ء) حضرت بابا فرید ثانی محمد ابراہیم کے گروگرنتھ صاحب میں ۱۱۲ اشلوک اور چار شبد شامل ہیں۔ (The Big Five of India in Sufism PP 91 By Mirza waheed uddin Beg ملاحظہ ہو) گرو جی مہاراج کی پوتر بانیوں میں قرآنی تعلیمات کو دیکھ کر آپ کے موحّد ہونے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں مثلاً آپ کا یہ ارشاد

(۱) ایکو سمرو ناٹکا جو جل تھل رہیا سمائے دوجا کا ہے سمریئے جو جمّے تے مرجائے
(گرنتھ صاحب محلہ ۱)

(ب) اول اللہ نور اُپایا قدرت کے سب بندے ایک نور تے سب جگ اپجیا کون بھلے کون مندے
(گرنتھ صاحب محلا۔ وکبیر داس)

(ج) جانت پانت نہ پوچھے کوئی ہر کو بھجے سو ہر کا ہوئی
(ایضاً ایضاً)

اقرار رسالت اسی وحدانیت کے نتیجہ میں آپ کو مساواتِ انسانی نظر آئی جو اسلامی تعلیمات کا طرۂ امتیاز ہے۔ آپ کی سیرت میں ہم کو یہ بھی دکھائی دیتا ہے کہ توحید کے اقرار کے ساتھ ساتھ آپ کا رسالت پر بھی ایمان تھا اور آپ عشق محمدیؐ سے سرشار تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

(۱) صِق صلوٰۃ محمدی نِکھ تیں آکھو نت

(ب) تم محمد من تو کتیباں چار
من خدائے رسول نوں سچاے دربار

{بحوالہ جنم ساکھی سری گوبند سنگھ سبھا ص ۲۴۷
{اخبار بدر قادیان ص ۱۱ ۲۰ نومبر ۱۹۶۹ء}

(ج) پیر پیغمبر سالک صادق شہدے اور شہید
شیخ مشائخ قاضی ملّاں در درویش رشید
برکت تن کو اگلی پڑھدے دہن درود

(گرو گرنتھ صاحب)

(د) ڈٹھا نور محمدیؐ ڈٹھا نبی رسول
نانک قدرت دیکھ کر کھوئی سب بھول

(جنم ساکھی بھائی بالا ص ۱۴۱؛ بدر ایضاً)

ان شبدوں سے ظاہر ہے کہ گرونانک جی سرکار دوعالم جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق و محبت رکھتے تھے اور درود شریف پڑھنا یعنی آپ پر صلوٰۃ وسلام کے پھول نچھاور کرنا روحانی برکات کا موجب سمجھتے تھے۔ مسلمانوں کے نزدیک درود شریف کو تمام دوسرے ذکروا ذکار پر فضیلت حاصل ہے۔ گرو جی بھی یہی سمجھتے ہیں اس لئے آپ کے نزدیک حقیقی مرشد نبی کریمؐ ہی کی ذاتِ گرامی ہے۔

یوم آخرت پر ایمان یہ بتایا جاچکا ہے کہ شری گورونانک جی کا یوم آخرت پر ایمان تھا اور وہ قرآن کی صداقت وحقانیت پر یقین رکھتے تھے اور اس کو خدا کا آخری کلام سمجھتے تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

(۱) کل پردھان کتیب قرآن پوتھی پنڈت پڑھے پوران!

(گرو گرنتھ صاحب محلہ ۱)

یعنی کلجگ میں کام کرنے والی پردھان (خاص الخاص) کتاب صرف قرآن ہے یعنی قرآن کے علاوہ سب پوتھیاں اور پوران منسوخ ہو چکے ہیں لیکن پنڈت لوگ ابھی تک انھیں کا پاٹھ کر رہے ہیں یہ کتنے تعجب کی بات ہے۔

اسی طرح :

(۲) کل میں وید اتھربن ہوآ، نام خدائے اَلہُ بھیا
نیل بستر لے کپڑے پہرے ترک پٹھاڑیں عمل کیا

(آسا وار محلہ ۱، اشلوک ۱۴)

یعنی کلجگ میں وید اتھربن (یعنی قرآن پاک) اللہ تعالیٰ کی منظور شدہ کتاب ہے جو خدائے تعالیٰ کے نام سے بیان کر رہی ہے اور جس پر نیلے رنگ کے کپڑے پہننے والے ترک اور پٹھان عمل کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ گورو جی کے زمانہ میں نیلا لباس پہننے والے ترک اور پٹھان مسلمان تھے جو قرآن پر عمل کر رہے تھے۔ جنم ساکھی بھائی بالی میں گرو نانک جی نے قرآن مجید ہی کو اتھر وید بتایا ہے۔ (ملاحظہ ہو بابا نانک شاہ صہ ۲۹ مولفہ مولانا احتشام الحسن) اور اسی کے احکام پر عمل کرنے کو ذریعۂ نجات تسلیم کیا ہے بشرطیکہ رسمی اسلام اور رسمی مسلمان کے بجائے حقیقی اسلام کو اپنا کر حقیقی مسلمان بننے کی کوشش کی جائے۔ سچے مسلمان کی پہچان گروجی کے الفاظ میں یہ ہے کہ :

۵ (۱) مسلمان کہا ونٹر مشکل	جاں ہوئے تاں مسلمان کہاوے
(۲) اوّل اوّل دین کر مٹھا	مسکل مانا (معنیٰ) مال مُساوے
(۳) ہوئے مسلم دین مُہانے	مرن جیون کا بھرم مچکاوے
(۴) رب کی رضائے مَنّ سر اُوپَر	کرتا مَنّ آپ گنوا اوے
(۵) تُو نانک سرب جیاں ہیں رحمت	ہوئے تاں مسلمان کہاوے

(وار ماجھ شلوک محلہ ۱ صہ ۱۴۱)

طلب یہ ہے کہ سچا مسلمان کہلانا بہت مشکل ہے لیکن جہاں تک ہو سکے مسلمان بننے کی کوشش ینا چاہیئے۔ اور اپنے کو مسلمان کہنا چاہیئے کیونکہ مسلمان سب سے پہلے اولیاء اللہ کے دین کو میٹھا جانتا ہے، اس کا ایمان بالفاظ دیگر برخلاف اور مذاہب کے دنیا کے تمام انبیاء کرام پر ہے اور سب کی عزت کرتا ہے۔ وہ اپنی محنت کی کمائی کو اللہ کی راہ میں لٹا دیتا ہے صدقہ و زکواۃ ادا تا ہے اور مسلم بن کر غریبوں اور مظلوموں کے لئے ناخدا بن جاتا ہے اور موت وحیات کے رم سے بالکل بے نیاز ہو جاتا ہے یعنی نہ اسے زندگی کی خواہش رہتی ہے اور نہ موت کا خوف تا ہے۔ وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی رہتا ہے اور اسی کو اپنا خالق ومالک یقین کرتا ہے۔ رائے نانک باقی تمام مخلوق سے محبت آمیز ہمدردانہ سلوک کرتا ہے۔ یہ باتیں جس میں پائی جاتی یا وہی پکا و سچا مسلمان ہے۔ سچا مسلمان بننے کے سادھن گروجی بیان کرتے ہیں کہ:

ؔ (۱) مہر مسیت صدق مُصلےٰ حق حلال قرآن
(۲) شرم سنت شیل روزہ ہُوَ ہُوَ مسلمان
(۳) کرنی کعبہ سچ پیرے کلمے کرم نماج
(۴) تسبیح سا، تِس بھاوسی نانک رکھے لاج

(دار ماجھ سلوک محلہ ا ص۱۴۰)

بنی مسجد انسان کو مہر و محبت کا سبق دیتی ہے اور مصلیٰ صدق کی تلقین کرتا ہے اور حلال حرام کی نشاندہی قرآن پاک کرتا ہے۔ نبی کریمؐ کی سنت پر عمل کرنے سے شرم وحیا پیدا ہوتی ہے اور نفس کی شیطنت سے محفوظ رہتا ہے۔ روزہ صبر و شکر کا سبق دیتا ہے۔ ان باتوں کو ہن نشین کر کے سچے مسلمان ہو جاؤ۔ کعبہ شریف نیک اعمال کی طرف کھینچتا ہے اور پیر سچائی

ؔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہوں "صدق جدید، لکھنؤ" کے نسخے برائے سال ۱۹۷۱ء و ۱۹۷۲ء بعنوان "سچی باتیں" بسلسلہ احادیث شوق وطن مرتبہ مولانا عبد الماجد صاحب دریا آبادی

کی راہ دکھاتا ہے۔ کلمہ اور نماز پڑھنے سے اچھے اعمال کی توفیق ہوتی ہے۔ اے نانک تسبیح انھیں لوگوں کے لئے مفید ہے جن کی عزت کا خدا ضامن ہے۔ اس کے بعد متنبہ کرتے ہوئے گرو جی فرماتے ہیں: ؎

(۱) مت جان سہے گلیں پایا — مال کے مانے (ابھان گھمنڈ) روپ کی سوبھا
اِت بدِھی جنم گنوایا

(سری راگ محلہ ۱ صـ۲۴)

یعنی یہ مت خیال کرو کہ صرف باتیں کرنے ہی سے انسان اللہ تعالیٰ کو پا سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی دولت اور جوبن کے نشہ میں مست ہو ہو کر وقت گزارے گا تو وہ یاد رکھے کہ اس طرح کی زندگی رائیگاں جائے گی۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سمجھ لے کہ: ؎

(۲) خصم کی دَے پسندے — جنّی کر ایک دھیایا
تیہہ کر رکھے پنج کر ساتھی — ناؤں شیطان مت کٹ جائی
نانک آکھے راہ پہ چلنا — مال دھن کِت کو سنجیائی

(سری راگ محلہ ۱ صـ۲۴)

یعنی خدا کی راہ میں وہی مقبول ہے جو صرف خدائے واحد کی عبادت کرتا ہے (اور شرک سے بچا ہوا ہے) اور اس نے پانچ کو اپنا ساتھی بنا رکھا ہے یعنی کلمہ، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور جو نفس کے شیطانی فریبوں سے بچا ہوا ہے۔ نانک جی کہتے ہیں کہ یہ دولت جمع کرنے کی چیز ہے اس کو جمع کر لو۔ مال دھن کس کو راس آیا ہے۔ ایک دن تم کو دنیا سے کوچ کرنا ہے اور سب کچھ چھوڑ کر واپس لوٹنا ہے۔ صرف نیک اعمال کا خزانہ تمھارے ساتھ جائے گا۔

خلاصہ: بہر حال مختصراً عرض یہ ہے کہ جو شخص بھی قرآن مجید اور گورو گرنتھ صاحب پر نظر رکھتا ہے اور تقابلی مطالعہ کرتا ہے وہ اس امر سے کسی حال میں انکار نہیں کر سکتا کہ قرآن کریم کی بیشتر تعلیمات گورو گرنتھ صاحب میں موجود ہیں جو سکھ مذہب کا لازمی جز ہیں۔ اب ان

پر عمل کرنا اور ان کو عام کرنا سکھ ودوانوں کا کام ہے۔ جہاں انھیں گوردواروں کی عظمت قائم رکھنا ہے وہاں مسجدوں کی عظمت کو بھی بڑھانا ہے۔ اور جہاں انھیں گورو گرنتھ صاحب کا ادب واحترام کرنا ہے وہاں قرآن مجید کا ادب واحترام بھی ملحوظ رکھنا ہے۔ گرو نانک جی کی گوروبنی ایک ملی جلی تربیت گاہ تھی جہاں مشرکانہ اور راہبانہ رسوم کی اصلاح ہوتی تھی اور خدا پرستی کی دعوت دی جاتی تھی۔ آپ نے ہندومت کی اصلاح کر کے اسلام کے قریب کر دیا اور ملک کو ہم آہنگی ویکجہتی کا سبق سکھایا۔ یہ ان کا عظیم الشان کارنامہ ہے۔ اس کا اندازہ "جپ جی بانی" سے ہو سکتا ہے جس کو ہمارے سکھ بھائی روزانہ بطور مناجات وعبادت پڑھتے ہیں اور اس کے ورد کو ذریعۂ نجات سمجھتے ہیں۔ شری گورو جی مہاراج "آئی پنتھی" جوگیوں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ کانوں میں مندرے ڈالنے، کندھے پر جھولی لٹکانے، بدن پر راکھ بھبھوت ملنے، چولہ پہننے اور آئی پنتھی کہلانے سے اس وقت تک کام نہیں چلے گا۔ جب تک کہ زہد وریاضت صبر وشکر، اصلاح نفس کے لئے گیان دھیان اور مخلوق کے لئے دَیا ورحم حاصل کر کے اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا نہ کیا جاوے کہ جو سب ناتھوں کا ناتھ ہے۔ اگر جوگی بننا ہے تو اس طرح بنو۔ سب فرقوں کو ایک سمجھنا بھی تو "آئی پنتھی ریت" ہے۔ گرو جی کے شبدوں میں:

"مُندا سنتوکھ شرم پت جھولی، دھیان کی کرہیں بھبوت۔
کِھنتا کال کوّاری کایاں۔ جُگت، ڈنڈا پرتیت۔
آئی پنتھی" سَگل جماتی، مَن جیتے جَگ جیت
آدیش تِسے آدیش، آدِ انیرا نا دانا ہَت
جُگ جُگ ایکو دیس (۲۹)"

(گرو گرنتھ صاحب ص۶، جپ جی بانی پوڑی ۲۸)

اس کو دوسری طرح سے یوں نظم کیا گیا ہے:

(۱) مُندرے شرم قناعت کے ہوں تپسیا تیری جھولی ہو

(٢) راکھ بھبوت کے بدلے تن پر — دھیان کی خاکی جھولی ہو
(٣) گیان کو اپنے بھوجن کریئے — رحم ترا بھنڈاری ہو
(٤) ہر من کو جو ناؤں بھجے — وہ ناؤں تری کلکاری ہو
(٥) ناتھیں ہیں سب ناتھ میں جس کی — ناتھ وہی ہو ناتھ ترا
(٦) دولت، زور، کرامت اُن کے — ساتھی ہیں کیا ساتھ ترا
(٧) سب فرقوں کو ایک سمجھ لے — آئی پنتھی ریت ہے یہ
(٨) من کو تو نے جیت لیا — تو سارے جگ کی جیت ہے یہ

(بحوالہ بابا نانک شاہ ص ٢٥-٢٦)

شری گورو نانک جی نے نور ایمانی اور بصیرت عملی سے اس بات کو خوب سمجھ لیا تھا جذب وکشش اور جادو بیانی سے جذبات کو ابھار کر کام تو لیا جا سکتا ہے لیکن نتیجہ پا نہیں ہو سکتا جب تک کہ صحیح علم پر صحیح عمل کی بنیاد قائم نہ کی جائے یعنی صحیح نتائج اسی راسخ ہوں گے جب صحیح علم پر صحیح عمل کی بنیادیں قائم ہوں گی اس لئے اعمال صالحہ سے ایـ یعنی عقیدہ کا درجہ مقدم ہے۔ بالفاظ دیگر اگر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت و ربوبیت[کلہ] پر اعتقادِ

کلہ ربوبیت: اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر رحم وکرم کی بارش کرتا ہے۔ انھیں پالتا پوستا ہے۔ جماعت کا مخصوص خدا نہیں جیسا کہ ہمارے یہودی اور آریہ بھائیوں کا خیال ہے۔ وہ رب العالمین ہے وید مقدس: वसु ईयमान (رگوید منڈل ٣، سوکت ٤٣ منترا) بتا کر شہادت دیتا ہے کہ وہ رحمٰن و اسی لئے اس نے اپنے بندوں کو گمراہی سے بچانے کے لئے وقتاً فوقتاً ہر ملک میں، ہر نازک زمانہ میں اپنے بندوں کو جنھیں ہم رشی منی یا رسول ونبی کہتے ہیں مبعوث فرمایا ہے تاکہ وہ لوگوں کو قعر مذلت سے نکالیں یہ تمام انبیاء کرام اور رشی ومنی واجب الاحترام ہیں۔ انھوں نے اپنے اپنے وقت میں اپنی اپنی جماعت اندر اپنے زمانہ کے مناسب حال اخلاق عالیہ اور صفاتِ کاملہ کا بلند ترین نمونہ پیش کیا ہے۔

تو اس کے فرستادہ تمام انبیاء کرام پر بھی اعتقاد ہو گا خواہ وہ کہیں بھی مبعوث ہوئے ہوں
اور پھر اعمال صالحہ کے لئے ان انبیاء کرام میں اس نبی[ش] کا نمونہ سامنے رکھنا پڑے گا جس کی

ش اُس نبی کا نمونہ: آج اگر انسان اپنی زندگی کو بنانا چاہتا ہے تو اس کی صرف دو شکلیں ہیں ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ پاکیزہ تعلیمات کو بذریعہ مطالعہ ذہن نشین کر کے اس پر عمل کیا جائے یا پھر کسی برگزیدہ نبی کی زندگی کو سامنے رکھ کر اس کی ہر ہر قدم پر پیروی کی جائے۔ ان دونوں میں دوسری شکل نسبتاً آسان ہے لیکن ایک مشکل یہ ہے کہ از حضرت آدمؑ تا نبی کریمؐ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کرام میں سے کس کو نمونۂ عمل بنا کر سامنے رکھا جائے جو حقیقتاً آئیڈیل لائف کا کام دے۔ اس سلسلے میں جہاں تک ہم تاریخ سے مدد طلب کرتے ہیں تو اس انتخاب کے لئے ہمیں چار باتوں پر غور کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تاکہ انتخاب میں غلطی نہ ہو اور وہ انتخاب صحیح معنی میں معیاری انتخاب ہو۔

انتخابِ سیرت کے نقشہ میں ان چاروں مذکورۂ بالا باتوں میں سے پہلی بات ہے تاریخیت[۱] یعنی جس کامل و برگزیدہ ہستی کی ہم تقلید کرنا چاہتے ہیں اس کی زندگی کے حالات تاریخ کے معیار پر پورے اُترتے ہیں یا نہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وہ حالات محض افسانوی رنگ کے ہوں اور ان کی اصلیت کچھ نہ ہو۔

کاملیت[۲] کا نمبر دوسرا ہے یعنی اس بزرگ ہستی کی زندگی کے ہر لمحہ کا علم ہونا تاکہ اس کی زندگی کا چھوٹے سے چھوٹا واقعہ بھی نگاہوں سے اوجھل نہ رہنے پائے۔

جامعیت[۳] کی تلاش تیسرے نمبر کی چیز ہے یعنی یہ دیکھنا کہ مختلف طبقات انسانی کے مختلف انداز کی زندگیوں کو بنانے اور سنوارنے کے لئے جن فرائض و واجبات یا تعلقات و روابط کی ضرورت ہوتی ہے اُن سب کے نمونے اور مثالیں اس آئیڈیل زندگی کے نمونہ میں موجود ہیں یا نہیں۔

اسی طرح عملیت[۴] چوتھی کسوٹی ہے کسی کی بھی آئیڈیل زندگی کو پرکھنے کی یعنی جس کی پیروی کر کے ہم ایک بہتر انسان بننا چاہتے ہیں تو یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ اُس بانی مذہب (باقی اگلے صفحہ پر)

زندگی حیاتِ انسانی کے لئے آئیڈیل لائف بننے کی صلاحیت رکھتی ہو اور طبقات انسانی کے ہر گروہ کے لئے نمونۂ عمل ہو اور ساتھ ہی ساتھ تاریخیت، کاملیت، جامعیت اور

(بقیہ صفحہ گزشتہ) نے جو تعلیم پیش کی ہے اس پر اس نے خود بھی عمل کیا ہے یا نہیں؟ اور جو تعلیم پیش کی ہے وہ حالات حاضرہ کے تحت قابلِ عمل بھی ہے یا نہیں؟ کیونکہ کسی سیرت کے بہتر اور کامل ہونے کی دلیل اس کے اقوال، خیالات یا فلسفیانہ نظریئے نہیں ہوتے بلکہ اس کے کارنامے اور اعمال قابل ہوتے ہیں۔ اگر یہ معیار نظرانداز کر دیا جائے تو اچھے اور بُرے کی تمیز نہیں ہو سکتی اور اس طرح یہ صرف باتیں بنانے والوں کا مسکن ہو کر رہ جائے گی۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ دنیا میں نیک اعمال دو طرح کے ہوتے ہیں (۱) منفی (۲) اثباتی یا ایجابی مثلاً ایک شخص نے کسی کو مارا نہیں۔ کسی کو قتل نہیں کیا۔ کسی کے ساتھ بُرائی نہیں کی۔ کسی کا مال نہیں لوٹا اور نہ چوری کی، اپنے لئے گھر نہیں بنایا اور نہ کچھ جمع کیا یہ سب خوبیاں اور نیکیاں ہیں جو عملی زندگی کے لئے بیکار۔ عملی زندگی کے لئے اصل خوبی تو یہ ہے کہ بیشک نے کسی کو مارا نہیں لیکن کیا کسی غریب یا مظلوم کی مدد بھی کی یا ظلم سے بچایا بھی۔ کسی کو قتل نہیں کیا کسی کو قاتل سے بچایا بھی۔ کسی کا مال نہیں چھینا لیکن کسی محتاج کو کچھ دیا بھی۔ یہ سب اثباتی یا ایجابی خوبیاں ہیں اور انھیں کا نام "عمل" ہے۔

بہر حال سیرت سازی کے ان چار اصولوں پر ہر اُس محترم ہستی کی زندگی کو پرکھنے کی کوشش کہ جس کی زندگی کو آپ آئیڈیل زندگی سمجھتے ہیں تو آپ کو کہیں نہ کہیں ضرور خلا محسوس ہوگا۔ ان کی سیرت کو امتدادِ زمانہ نے محفوظ نہیں رکھا۔ اس سے میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ دیگر انبیاء علیہم السلام اور رشی کی زندگیاں ان کے عہد اور زمانہ میں ان خصوصیات سے خالی تھیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ ان کی سیرت جو اُن کے بعد عام انسانوں تک پہونچیں یا جو آج بھی موجود ہیں وہ ان خصوصیات سے خالی ہیں ایسا ہونا مصلحت الٰہی کے مطابق تھا اس لئے کہ پروردگار عالم نے انھیں محدود زمانہ [illegible]

معیار پر پوری اُترتی ہو۔ گورونانک جی کے متعلق نہایت وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ
ول نے رب العالمین کے فرستادہ "رحمۃ للعالمینؐ" جناب نبی کریم کی مبارک زندگی کو سامنے

یہ صفحہ گذشتہ) اور اپنی اپنی مخصوص قوموں کی اصلاح کے لئے بھیجا تھا لیکن چونکہ جناب محمد رسول اللہؐ
دنیا کی تمام قوموں کی اصلاح کے لئے قیامت تک کے لئے نمونۂ عمل بنا کر بھیجا گیا ہے اس لئے ان کی سیرت
ے کے ہر جز کو ہر حیثیت سے ہمیشہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے محفوظ کر دیا اور یہی وجہ ہے کہ آج ان کی زندگی
ئی مختصر سے مختصر زمانہ بھی ایسا نہیں ہے جو دنیا کی نگاہوں سے اوجھل ہو۔ آئینہ کی طرح ہر چیز روشن
۔ زندگی کا ہر گوشہ خواہ وہ عبادات سے متعلق ہو خواہ معیشت و معاشرت سے، خواہ اخلاقیات سے خواہ
املات سے، غرضیکہ اس کا تعلق رزم سے ہو یا بزم سے کوئی چھپی ڈھکی بات نہیں ہے۔ آپ ہی کی
باع کرنے کے لئے تمام انبیاء کرام نے اپنی اپنی قوموں کو ہدایت کی ہے جیسا کہ اس ناچیز کے اس مضمون
ے ابتدا میں ثابت کیا گیا ہے اور آپ کے بعد آپ ہی کی اتباع کر کے تمام پیر و فقیر اور درویش
راتب علیا پر فائز ہوئے ہیں۔ شری گورونانک جی کا شمار بھی انہیں مقدس بزرگوں میں ہے جو اللہ
رسول کے سچے عاشق و شیدائی تھے۔ بڑے خوش قسمت ہیں ہمارے وہ سکھ دوست جو گرو جی کی صحیح سیرت
سے واقف ہو کر ان کی پیروی کریں اور وہ بھی اللہ و رسول کے سچے عاشق و شیدائی بن جائیں۔ آمین
آمین۔

۵۔ رحمۃ للعالمین: حضرت بابا نانک جی کی تعلیمات کو دیکھ کر یقین ہوتا ہے کہ وہ اس حقیقت سے
یقیناً واقف تھے کہ اللہ تعالیٰ کی شان اگر رب العالمین ہے تو اس کے حبیب پاک جناب محمد رسول اللہ
لی اللہ علیہ وسلم کو رحمت للعالمین بنا کر بھیجا گیا ہے وہ لوگوں سے پیار کر کے ان کے دلوں کو جیتیں
ے چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ آنحضورؐ نے مبعوث ہو کر ان تمام دشمنوں اور ظالموں کو جنھوں نے آپ
پر مصائب کے پہاڑ ڈھائے تھے پیار و محبت کے ذریعے فتح پائی اور تمام آزار دینے والوں کو
ہمیشہ دعائیں دیں۔ ایک مرتبہ جناب خبابؓ نے ناقابل برداشت مصائب پر آپ (باقی اگلے صفحہ پر)

رکھکر ہم ہندوستانیوں کو ایک دوسرے کے من کو اپنانے اور جیتنے کا درس دیا اور یہی ان کا مقصدِ حیات تھا کہ ہندو و مسلمان دونوں مل کر رہیں اور ایک مرکز پر جمع ہو جائیں۔ ذات، پات،

(بقیہ صفحہ گذشتہ) سے بد دعا کے لئے عرض کیا تو آپ نے فرمایا کہ "اے خباب! میں اس دنیا کے لئے زحمت نہیں بلکہ رحمت بن کر آیا ہوں۔ بد دعا کے لئے نہیں بلکہ دعا کے لئے پیدا ہوا ہوں۔ کلمۃ الحق کی خاطر پہلے لوگوں کو آرے سے چیر کر ٹکڑے ٹکڑے کیا گیا ہے۔ فتح حق کی ہوگی تا آنکہ ایک شتر سوار صنعاء سے حضر موت تک سفر کرے گا اور راہ میں اسے بجز خدا کے اور کسی کا ڈر نہ ہوگا۔"

(بخاری شریف ملاحظہ ہو)

آنحضورؐ کے رحمت للعالمین ہونے کی پیشین گوئیاں بڑی صراحت کے ساتھ تمام انبیاء کرامؑ اور رشی منیوں نے کی ہیں جو امتدادِ زمانہ کے باوجود اب بھی تمام مذاہب کی کتبِ مقدسہ میں موجود ہیں مثلاً :

(۱) "اے زرتشت اس کا نام "استوت تریتا" یعنی محمدؐ ہوگا وہ فاتح، مہربان اور رحمتِ مجسم ہوگا۔"

(ملاحظہ ہو ژند اوستا، فروردین یشت ۲۸، آیتہ ۱۲۹ مترجمہ جیمس ڈارمیٹر)

(۲) "دہوز دہوش شنشور" یعنی وہ ہوں گے رحمۃ للعالمین"۔

(ملاحظہ ہو۔ نامہ ساسانِ اول)

(۳) پیشین گوئی از حضرت نوحؑ۔ "کمان بدلی میں نظر آئے گی" یعنی محمدؐ کی بعثت تمام دنیا کے لئے باعثِ رحمت ہوگی۔

(ملاحظہ ہو توریت کتاب پیدائش باب ۹ آیتہ ۱۴)

(۴) جناب مسیحؑ کی پیشین گوئی۔ "ابن آدم کا آنا ہوگا..... وغیرہ"۔

(متی ۲۴ : ۲۷)

(۵) "نراشنسہ" یعنی محمدؐ کی صفات حسنہ اور اخلاق عالیہ کے لئے ملاحظہ ہوں (باقی اگلے صفحہ پر)

چھوت چھات اور اونچ نیچ دور ہو کر مساوات و اتحاد قائم ہو اور دوسرے کو محبت و وقعت کی نگاہ سے دیکھے اور اس کی خیر خواہی کا طلبگار ہو۔ کاش کہ ہمارے سکھ بھائی گورو جی کی تعلیم اور ان کے اصلاحی مقاصد کی جانب توجہ کریں تو وہ یقیناً مستقبل کو شاندار بنا سکتے ہیں اور ملک میں خدا پرستی و یکجہتی کی فضا پیدا کر سکتے ہیں۔

وصال ۲۳ر اسوج (کارتک پورنماشی) سمبت بکرمی ۱۵۹۶ مطابق ۲۲ر ستمبر ۱۵۳۹ء کو آپ کا وصال ہوا۔ اس جہانِ فانی میں ۷۰ سال ۵ ماہ، یوم گذار کر اللہ کو عزیز ہوئے۔ آپ کے انتقال کے بعد ہندو اور مسلمانوں میں آپ کی آخری رسوم ادا کرنے پر اختلاف ہوا۔ آخر میں جب گرو جی کا بستر اٹھایا گیا تو وہاں جسم نہیں ملا اس لئے آدھا بستر لے کر مسلمانوں نے قبر میں دفن کیا اور ہندوؤں نے آدھا بستر لے کر داہ سنسکار کیا۔ اس واقعہ کو پنڈت جوالا پرشاد گوڑ نے نظم کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ: ؎

معتقد آپ کے تھے ہندو مسلماں اکثر — دیکھنے آئے دمِ مرگ کرامات نظر
جسم خاکی نہ رہا رہ گئی خالی چادر — ایک نے دفن کیا ایک نے پھونکا چادر
چادرہ پھاڑ کے تقسیم کیا دونوں نے — مرتبہ فقر کا تسلیم کیا دونوں نے

(بقیہ گذشتہ صفحہ) منترا تا ۱۴ ادر اتھرو وید کانڈ ۲۰ سوکت ۱۲۷، نیز "نراشنسہ اور انتم رشی" مؤلفہ ڈاکٹر وید پرکاش ایم۔ اے، دھرم شاستر آچاریہ الہ آباد یونیورسٹی۔

(۶) "اگنے وشوانر" یعنی تمام خوبیوں سے متصف رحمت للعالمین ماح رشی (محمدؐ)
(ملاحظہ ہو رگوید منڈل ۵ سوکت ۲۷ منتر ۱)

(۷) مہاتما گوتم بدھ نے بتایا کہ اس کا نام میتریہ ہوگا یعنی رحمت للعالمین کی صفت سے متصف ہوگا (ملاحظہ ہو Gospal of Buddha by Carus P217 بحوالہ نراشنسہ اور انتم رشی صفحہ ۵۲ از ڈاکٹر وید پرکاش ایم اے) اسی کی طرف گرو نانک جی نے آئی پنتھی بزرگوں کو توجہ دلائی ہے کہ اگر تم نے من کو جیت لیا تو گویا سارے جگ کو جیت لیا۔

اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مسلمان کسی کو محض حسن عقیدت اور تعلق و محبت کی وجہ سے اسلامی طریقہ سے دفن کرنا پسند نہیں کرتا جب تک کہ متوفی کا مسلمان ہونا اُسے یقینی طور پر معلوم نہ ہو جائے۔ اور تو اور وہ اپنے غیر مسلم والدین کو بھی دفن کرنا گوارا نہیں کرتا۔ اس لئے لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ جو مسلمان ان کی تجہیز و تکفین اسلامی طریقہ پر کرنے پر مُصر تھے ان کو گرونانک جی نے کا مسلمان ہونا یقینی طور پر معلوم تھا۔ یہ محض جذباتی معاملہ نہ تھا۔

گورونانک جی کے بعد

گرونانک جی کی وفات ۲۲ ستمبر ۱۵۳۹ء کو ہوئی۔ ان کے دو صاحبزادے سری چند اور لکشمی چند تھے۔ آخر الذکر سیر و شکار اور دنیوی کاروبار میں منہمک ہوگئے اور اسی طرح ان کی اولاد بھی۔ سری چند البتہ اپنے والد ماجد کے نقش قدم پر چلے۔ درویشی اختیار کی لیکن اپنے باپ کی جگہ گدی پر نہیں بیٹھے۔ اس طرح سجادگی کا حق گورونانک جی کے ایک خادم انگد (انگد) نامی کو پہونچا۔ سجادگی کا سلسلہ حسب ذیل ہے:

(۱) انگد (انگد) ۱۵۳۹ تا ۱۵۵۲ء، ۱۳ سال
(۲) امرداس ۱۵۵۲ تا ۱۵۷۴ء، ۲۲ سال
(۳) رام داس داماد امرداس ۱۵۷۴ تا ۱۵۸۱ء، ۷ سال
(۴) ارجن بن رامداس ۱۵۸۱ تا ۱۶۰۶ء، ۲۵ سال
(۵) ہرگوبند بن ارجن ۱۶۰۶ تا ۱۶۴۴ء، ۳۸ سال
(۶) ہررائے بن ہرگوبند ۱۶۴۴ تا ۱۶۶۱ء، ۱۷ سال
(۷) ہری کشن بن ہررائے ۱۶۶۱ تا ۱۶۶۴ء، ۳ سال
(۸) تیغ بہادر بن ہرگوبند ۱۶۶۴ تا ۱۶۷۵ء، ۱۱ سال
(۹) گورو گوبند بن تیغ بہادر ۱۶۷۵ تا ۱۷۰۸ء، ۳۳ سال

اس طرح گورو صاحبان کی کل تعداد دس ہے ۔ بندہ بیراگی نے تیغ بہادر اور گورو گوبند کے لڑکوں کے انتقام لینے کے جذبہ سے مغلوب ہو کر قتل و غارتگری کا پیشہ اختیار کیا۔ آخر میں بعہد فرخ سیر اسلم خاں صوبیدار لاہور کو اس کی شورش کو فرو کرنے کے لئے مقرر کیا گیا۔ آخر میں محبوس ہو کر دربار شاہی میں پیش کیا گیا اور عبرت ناک سزا تجویز کی گئی ۔ اس موقع پر ایک درباری امیر محمد امین خاں اور بندہ بیراگی میں جو گفتگو ہوئی اس سے پتہ چلتا ہے کہ گرونانک جی کی اصلاحی تحریک نے قومی یک جہتی کے بجائے سیاسی تحریک کی نوعیت اختیار کرلی ۔ جس کی ابتدا گورو تیغ بہادر کے عہد میں ہو چکی تھی ۔ اس خطرہ کو شہنشاہ عالمگیر نے بہت پہلے محسوس کر لیا (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو جامع التواریخ ص۲۵۲-۲۵۰ از قاضی فقیر محمد صاحب نیز سیر المتاخرین جلد دوم ص۴۰۱ تا ص۴۰۳ مصنفہ سید غلام حسین حسنی طباطبائی)

اورنگ زیب کی دوررس نگاہیں اس حقیقت کو پہچان گئی تھیں کہ وحدت مذاہب کا نظریہ عقلاً اسی وقت قابل قبول ہو سکتا ہے جب تمام مذاہب اصولی تعلیمات میں متحد ہوں۔ بہت سے بزرگوں نے تبلیغ دین کے لئے مختلف تنظیمیں قائم کیں جو بعد میں ایک علیحدہ گروہ بن گئیں اور حکومت وقت کے لئے فتنہ ثابت ہوئیں ۔ عالمگیر نے شاید اپنے نورِ ایمانی اور بصیرت عملی سے اس امر کا بخوبی اندازہ لگا لیا تھا کہ صحیح علم کے بغیر روحانی جذب و کشش اور سحر بیانی محض جذبات کے ابھار دینے سے کام نہیں چلتا جب تک کہ صحیح ایمان نہ ہو اور عقیدہ راسخ نہ ہو اس لئے کہ اعمالِ صالحہ سے ایمان صحیح کا درجہ مقدم ہے ۔ عالمگیر کے دور میں اس تحریک سے جذبات کس حد تک ابھر چکے تھے اس کا اندازہ گورو تیغ بہادر کو حراست میں رکھنے اور حافظ آدم بنوری کو ملک بدر کرنے کے وجوہ پر غور کرنے سے لگایا جاسکتا ہے ۔ دونوں کے پنجاب میں بکثرت مرید تھے ۔ حافظ آدم بنوری خلیفہ تھے حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کے ۔ مولوی نسیم احمد صاحب فریدی امروہوی کے بقول ان کے خلفاء کی تعداد سو اور مریدین ایک لاکھ سے زائد تھے (ملاحظہ ہو رسالہ الفرقان بریلی مجدد نمبر ص۲۳۶)

مولانا محمد حسن نقشبندی مجددی مریدین کی تعداد چار لاکھ بتاتے ہیں اور خلفاء کی تعداد ایک ہزار (ملاحظہ ہو مشائخ نقشبندیہ و مجددیہ ص١٣١ بحوالہ بابا نانک شاہ ص٣٨ تا ص٥) شہنشاہ عالمگیر خود بھی اور اس کے باپ دادے بھی خاندانِ مجددیہ سے وابستہ اور آستانۂ عالیہ کے خدام تھے لیکن اِس وابستگی کے باوجود اُسے مجبوراً حافظ آدم بنوریؒ کو ملک بدر کرنا پڑا جبکہ بمقام مدینہ منورہ ١٠۵٣ھ میں ان کا وصال ہوگیا۔ عالمگیر کو یہ سخت قدم کیوں اٹھانا پڑا ؟ اُسے واقعہ نگاروں نے مطلع کیا کہ گورو تیغ بہادر اور حافظ آدم بنوری دونوں نے مریدوں کی ایک بڑی تعداد کو ساتھ لے کر یہ رویہ اختیار کیا ہے کہ گروجی ہندوؤں اور حافظ جی مسلمانوں سے جبر و تعدی کے ساتھ مال لیتے پھرتے ہیں مبادا ان کا اقتدار بڑھ جائے اور حکومت کے لئے خطرہ بن جائیں چنانچہ متوقع شورش و بغاوت کو دبانے اور ممالک محروسہ میں امن قائم رکھنے کے لئے احتیاطاً سختی برتنا پڑی۔ اس مشترک تحریک کا مقصد جو کچھ بھی ہو لیکن تھی بہرحال خطرناک۔ ملک میں امن و امان قائم رکھنے کے لئے ہر حکومت کو پیش بندی کرنے کا حق ہے مثلاً موجودہ دور میں کانگریسی جمہوری حکومت کی آنند مارگ، بال یوگیشور، ہرے رام ہرے کرشن وغیرہ تنظیموں پر کڑی نظر ہے۔

المختصر بعض سیاسی حالات کی بنا پر اورنگ زیب کو سخت قدم اٹھانا پڑا ورنہ جہاں تک مذہب کا تعلق ہے وہ اپنے آباء و اجداد کے مسلک پر قائم رہا۔ گورو ہرگوبند کی دارا شکوہ بڑی عزت کرتا تھا۔ ایک مرتبہ جب گروجی نے ایک امیر مخلص خاں کو قتل کر دیا تو شاہجہاں کے غصہ کو دارا شکوہ نے فرو کیا۔ اکبر بادشاہ نے امرت سر کے گوردوارہ کو ۵٠٠ بیگہ آراضی بطور جاگیر عطا فرمائی کہ جس کی بنیاد میاں میرؒ کے مبارک ہاتھوں سے گورو رامداس نے رکھوائی تھی۔ اورنگ زیب کے عہد میں جب گورو گوبند سنگھ نے شورش برپا کی اور ضلع لودھیانہ میں اپنے استاد قاضی پیر محمد کے یہاں پناہ لی اور آخر میں مجبور ہو کر فارسی نظم میں عرضی لکھ کر اورنگ زیب سے معافی کے خواستگار ہوئے تو اس نے نہ صرف معاف کر دیا بلکہ دہرہ دون

بام پذیر ہوئے کے خرچ اخراجات نیز گوردوارہ کے لئے جاگیر دی ۔ اس کے بعد گورو
جی آخر تک اورنگ زیب کے ساتھ رہے اور دکن میں جاکر ناندیر کو مستقر بنایا ۔ آج بڑی
ت اس بات کی ہے کہ ہمارے مسلمان اور سکھ بھائی اپنی پرانی تاریخ کو اس کے اصلی
میں دیکھیں ۔ ایک سکھ مورخ نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ "ایسٹ انڈیا کمپنی" اور "سب سی ڈیری
م" (عہد معاونت) کے ماتحت سکھ سرداروں نے سیاسی زمانہ کی ضرورت کے مطابق
تہاس تیار کروایا جو سکھوں میں رائج ہو گیا اور اسی کو نادان سکھوں نے صحیح مان لیا"
طہ ہو سکھ اتہاس ، الشٹ کیوں ہوا ص ۴۲ ؛ تاریخ پنجاب مصنفہ رائے بہادر کنہیالال ؛
رئیس ہند کپورتھلہ گولڈن جوبلی نمبر ، ۱۹۳۷ء ؛ اخبار الجمعیۃ دہلی مورخہ ۱۳ ستمبر ۱۹۵۵ء)
اُمید ہے کہ اصحاب فہم وادراک اور ارباب حل وعقد تاریخ کی اصلاح کی طرف توجہ
گے ۔ میرے خیال میں تو جس طرح انگریز کی سیاست نے اورنگ زیب عالمگیر کی حکومت
رنگ وروپ دیا ٹھیک اسی طرح اس نے اپنی سعی و کوشش سے اس مذہبی تحریک
غلط رنگ وروپ دیا اور بالکل رنگ بدل ڈالا ۔ بڑے تعجب کی بات ہے کہ بانی سکھ
شری گورو نانک جی کو مذہبی پیشوا بھی مانا جائے لیکن آپ کی تعلیمات پر کما حقہٗ عمل نہ کیا
۔ یہ تو بالکل عقل و فہم کے خلاف بات ہے ۔ جبکہ ساری اسلامی تعلیمات گرو گرنتھ صاحب
وجود ہیں تو لامحالہ ان کا پھیلانا اور عام کرنا سکھ دھرم میں شامل ہے جس کو بابا نانک
ندوستان میں پھیلانا چاہتے تھے ۔ گورو نانک جی کے مقاصد کو دو اہم حصوں میں تقسیم
سکتا ہے جو ان کی امتیازی شان کو واضح کرتے ہیں :

) ہندوستان میں تمام فرقوں میں اتحاد و یکجہتی پیدا کرنا ۔ ان کے عقائد و نظریات اور
و کردار میں یکسانیت پیدا کرنا تاکہ ہر انسان ایک دوسرے کو محبت اور وقعت کی نگاہ
یکھے اور رنگ ونسل نیز ذات پات کے امتیازات کو بھول جائے اور شرف و مجد کی
پیشہ کی بجائے صالح اعمال پر رکھے ۔

(۲) آپ کا دوسرا اہم مقصد یہ تھا کہ خالص توحید اور خالص خدا پرستی کی لوگوں کو دعوت جائے تاکہ وہ اپنے اشرف المخلوقات ہونے کی حیثیت کو پہچانیں اور شرک و بت پرستی دور رہیں۔ غرضیکہ یہ دو ممتاز خصوصیات ہیں جو گرو جی کی تعلیم میں نظر آتی ہیں۔ انھیں کی توجہ دلانا مقصود ہے۔ اُمید ہے کہ ہمارے سکھ دوست اس ناچیز کے معروضات پر سنجیدگی کے ساتھ غور فرمائیں گے۔ جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ برہنائے خلوص و محبت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو راہ راست پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے بجاہ سید المرسلینؐ۔ آمین۔

وَمَا علینا اِلّا البلاغ

"الکنز المدفون" کے مصنف کی تحقیق

از جناب مولوی محمد عبداللہ صاحب دہلوی رفیق ادارہ

"الکنز المدفون والفلک المشحون" ایک متفرق معلومات کا مجموعہ ہے جس میں لطائف
ف لابن قتیبۃ، الکشکول للشیخ بہاء الدین العاملی اور الطریف للادیب الظریف مؤلفہ
اعبد الاول جونپوری کی طرح بلا ترتیب بہت سی معلومات جمع کر دی گئی ہیں۔ یہ مجموعہ
ہ تمام مجموعوں سے اس لحاظ سے ممتاز ہے کہ اس میں تالیف و ترتیب نام کو بھی نہیں
سے دو اقتباس آپس میں قطعاً کوئی واسطہ نہیں رکھتے۔ میرے علم میں اس کے مطبوعہ چار نسخے
یک طبع بولاق ۱۲۸۸ھ، دوسرا مطبوعہ مصر ۱۲۹۳ھ جس کے حوالجات حضرت مولانا
ی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریرات میں ملتے ہیں، تیسرا نسخہ مصر سے ۱۳۰۳ھ میں شائع
ہے اور چوتھا نسخہ محرم الحرام ۱۳۲۱ھ میں مطبعہ میمنیہ مصر کا طبع شدہ ہے جو اس وقت پیش نظر
ہے۔ تعداد صفحات علاوہ فہرست ۲۵۸۔ اس کی لوح پر مصنف کے نام کی جگہ یہ عبارت

"المنسوب للعالم العلامۃ الشیخ جلال الدین السیوطی

یوسف الیان سرکیس کی کتاب "معجم المطبوعات العربیۃ والمعربۃ" ج ۱۱ کالم ۱۰۶۰ (مطبوعہ مصر
ء) میں صرف دو نسخوں اول اور سوئم کا پتہ دیا گیا ہے۔

نفعنا اللہ بہ آمین ۔"

یہ "المنسوب" کا لفظ واضح کر رہا ہے کہ اس لوح کے ترتیب دینے والے کے خود یہ بات یقینی نہیں ہے کہ اس کے مؤلف علامہ جلال الدین سیوطی المتوفی ۹۱۱ھ ہیں۔

تاریخی شہادت | مؤرخین کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب علامہ جلال الدین کی تالیف نہیں بلکہ شیخ شرف الدین یونس المالکی کی تصنیف ہے چنانچہ کشف الظنون میں ہے:

"الکنز المدفون والفلک المشحون" مجموعۃ جمعہا یونس المالکی[1]۔"

اور المنجد میں اصل مصنف کے ذکر کے بعد یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ

"ینسب غلطا لجلال الدین السیوطی[2]۔"

یوسف سرکیس نے بھی یہی کہا ہے کہ

"وینسب ھذا الکتاب غلطا لجلال الدین السیوطی[3]۔"

علامہ عبدالحی لکھنوی نے "تبصرۃ الناقد" پر رد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "جو شخص اس کا ایک بار بھی شروع سے اخیر تک مطالعہ کرے گا وہ یقینی طور پر یہ جان لے گا کہ یہ علامہ سیوطی کی تصنیف نہیں ہے[4]۔"

خود کتاب کی شہادت | صفحہ اول پر جو لفظ المنسوب ہے وہ بھی اگرچہ اس بات کو کمزور

---

[1] کشف الظنون ج ۲ صـ ۳۳۶

[2] المنجد القسم الثانی فی الادب والعلوم صـ ۳۴۵

[3] معجم المطبوعات العربیہ والمعربۃ ج ۱۱ کالم ۱۰۶۰

[4] تذکرۃ الراشد صـ ۲۶ ، غیث الغمام علی حواشی امام الکلام صـ ۲۹

کے لئے کافی ہے کہ یہ علامہ سیوطی کی تصنیف ہے مگر یہ شہادت مصنف کے قلم سے نہیں ہے
ہم چند شہادتیں خود مصنف کے قلم کی نقل کرتے ہیں۔

۱۔ علامہ عبدالحی لکھنوی غیث الغمام حاشیۂ امام الکلام میں فرماتے ہیں کہ
الکنز المدفون کے مصنف نے لکھا ہے کہ: "حکیت فیما اختصرہ عمی القاضی ابوعمر
سقی اللہ عہدہ۔۔۔ الخ" مولانا فرماتے ہیں کہ سیوطی کے کوئی چچا "ابوعمر" کنیت والے
نہیں ہیں[1]۔

۲۔ الکنز المدفون کے مصنف حافظ ابوعبداللہ الذہبی کے شاگرد ہیں جیسا کہ انھوں نے
متعدد مقامات پر ظاہر کیا ہے مثلاً ص۱۷ پر لکھتے ہیں: "ومن تاریخ شیخنا الحافظ ابی عبداللہ
الذھبی" اور حافظ ذہبی کی وفات ۷۴۸ھ میں ہے اور سیوطی کی پیدائش ۸۴۹ھ کی ہے تو ذہبی
سے سیوطی کے تلمذ کا کیا امکان ہے۔ ایک صدی سے زائد کا فصل ہے۔

اسی طرح الکنز المدفون ص۱۸۲ میں ہے "اخبرنا شیخنا الحافظ الذھبی رحمہ اللہ"
جس سے صاف ظاہر ہے کہ مصنف حافظ ذہبی کے براہ راست شاگرد ہیں۔ یہ دوسری عبارت
علامہ عبدالحی لکھنوی نے بھی استدلال میں پیش کی ہے۔

۳۔ ص۲۲۳ پر ایک عبارت نقل کرتے ہوئے لکھا ہے: "وفی تفسیر شیخنا ابی حیان
رحمہ اللہ تعالیٰ" اور یہ معلوم ہے کہ ابوحیان کی وفات ۷۴۵ھ میں ہے لہذا سیوطی کا تلمذ
ان سے بھی کسی طرح ثابت نہیں ہوتا۔

۴۔ اسی کتاب میں ایک جگہ ص۱۵۳ پر لکھتے ہیں: "اجتمعت بالاخ فی اللہ ناصرالدین
بن الملیق بالقدس فی ثالث عشرین من شعبان سنۃ سبع وستین وسبعمائۃ
روقع بیننا مذاکرۃ استفدت من بعضھا" ــــ یعنی میں اپنے دینی بھائی ناصرالدین

---

[1] غیث الغمام ص۲۹

ابن الیلیق سے ۲۳ شعبان سن سات سو ستر سٹھ (۷۶۷ھ) کو قدس میں ملاقات ہوں اور ہمارے درمیان علمی گفتگو رہی اور میں نے اس گفتگو سے فائدہ اٹھایا۔

یہ عبارت کس قدر صاف وصریح ہے اور حسن اتفاق سے سن ملاقات ہندسوں میں بھی نہیں کہ کسی درجہ میں غلطی کا شبہ ہوسکے بلکہ صاف وصریح لفظوں میں لکھا ہے۔

اس کے علاوہ ص۱۳۰ و ص۳۹ وغیرہ پر اس دور کے بعض دوسرے علماء سے بھی ملاقات کا پتہ چلتا ہے۔

۵۔ ایک اہم انکشاف اور سب سے بڑا ثبوت جس پر تعجب ہے کہ اب تک کسی کی نظر نہیں پڑی حتیٰ کہ مولانا عبدالحی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی دوسری ہی چیزوں سے استدلال کیا مگر ان کی بھی اس پر نظر نہیں گئی یہ ہے کہ اسی کتاب میں ص۱۵۸ پر مصنف کا پورا نام الگ الگ حروف میں درج ہے۔ عبارت یہ ہے:

"الحمد للہ من کلام کاتبہ جامع ھذا الکتاب الفقیر

ی و ن س ا ل م ا ل ک ی خ د م ب ھا

سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الخ۔"

اس کے بعد مصنف نے اپنا وہ سلام نقل کیا ہے جو انھوں نے روضۂ مطہرہ مبارکہ پر پیش کیا ہے۔ یہ کل چودہ اشعار ہیں۔ اخیر کے دو شعر یہ ہیں ؎

فقیرك یونس المسکین یرجو

یبدل کسرہ منکم بجبر

"یعنی آپ کا گدا مسکین یونس یہ آرزو رکھتا ہے کہ اس کی کوتاہیوں کی مکافات آپ کی بارگاہ سے کردی جائے۔"

ویدخل معکم جنات عدن

ویحظی بالنعیم المستمر

"۔۔۔ (اس کی تمنا یہ بھی ہے کہ) آپ کے ساتھ "جنات عدن" کا داخلہ نصیب ہو اور (جنت کی) دائمی نعمتوں سے بہرہ یاب ہو۔"

(ص۱۵۸ و ص۱۵۹)

ان دو جگہوں پر صراحت کے ساتھ نام دیکھ لینے کے بعد اب کسی اور خارجی شہادت کی ضرورت نہیں رہتی۔

ہر بڑی چھوٹی تحقیق کا جو اولین محرک ہوتا ہے وہ عموماً کوئی ایسی ناقابل ذکر اور غیر اہم سی بات ہوتی ہے کہ اکثر یہ ذہن میں بھی نہیں رہتا کہ ہم نے آخر یہ تلاش و جستجو شروع کیوں کی تھی۔ ظاہر ہے کہ ہم نے جو کتابیں الٹی پلٹی ہیں اور خود اس کتاب کو کھنگالا اس کی وجہ محض یہ شبہ تھا کہ یہ کتاب علامہ سیوطی کی تالیف ہے بھی یا نہیں؟ لیکن خود یہ شبہ کیسے پیدا ہوا؟ اور اس کی تلاش و جستجو کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ تو اس کی بنیاد صرف یہ ہے کہ الکنز المدفون ص۱۷، ص۳۲۲ اور ص۳۵۵ وغیرہ پر متعدد احادیث بلا حوالہ نقل کی گئی ہیں کہیں "ورد فی الحدیث" کہہ کر اور کہیں "قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" اور دوسرے الفاظ سے روایات نقل کی ہیں حالانکہ سیوطی کی عادت ہے کہ کوئی روایت بھی خواہ وہ مضمون کیسا ہی ہو جب بھی نقل کریں گے تو حوالہ ضرور دیں گے اور متون حدیث پر جتنی وسیع نظر سیوطی کی ہے ایسا وسیع النظر ان کے دور میں تو غیر کوئی تھا ہی نہیں ان سے قبل بھی اس درمیانی دور میں ایسے وسیع النظر کم ہوئے ہیں۔ اس بات سے شبہ ہوا کہ سیوطی جو شاید اگر نیند میں بھی ان کی زبان سے کوئی حدیث نکلے تو اخرج فلان عن فلان کے بغیر نہ نکلے انھوں نے ورد فی الحدیث کیسے لکھ دیا۔

کوئی کتاب جب اپنے اصل مصنف کے بجائے کسی دوسرے کی طرف منسوب ہورہی ہے تو ضرور کوئی نہ کوئی وجہ اشتباہ ہونی چاہئے حالانکہ یہاں بظاہر

(حاشیہ: ہمارے لئے اس تلاش کا محرک — وجہ اشتباہ)

کوئی وجہ نہیں مصنف کا نام، نسبت اور عہد سب بالکل الگ ہیں — لیکن وجہ اشتباہ یہاں آ
کہ علامہ جلال الدین سیوطی کی ایک کتاب کا نام ہے "الفلک المشحون"[1] اور اس زیر بحث کتاب
کا پورا نام ہے "الکنز المدفون و الفلک المشحون" یہ دونوں چونکہ نام کے ایک جز کے لحاظ
ہمنام ہیں اور سیوطی کی اکثر تصانیف بہت معروف و مشہور ہیں تو بظاہر کسی مطبع والے
نے جب اول اول اس کو شائع کیا ہوگا تو ممکن ہے سرورق پر مصنف کا نام درج نہ
سیوطی کی الفلک المشحون سمجھکر اپنی یادداشت سے اس لئے یہ نام لکھ دیا ہو۔ اور یہ
"المنسوب" کا لفظ جو مصنف کے نام کے ساتھ لایا گیا ہے اس کی وجہ بظاہر یہی ہے
کہ کتاب کے اندر کی بعض چیزیں بادی النظر ہی میں ایک صاحب علم کو یہ سوچنے پر مجبور
کردیتی ہیں کہ یہ کتاب علامہ سیوطی کی ہے یا کسی اور کی تالیف ہے۔

مصنف کی تاریخ وفات

مصنف کی تاریخ وفات باوجود تلاش کے راقم الحروف کو ابھی تک
نہیں ملی ہے۔ کشف الظنون میں المتوفی سنہ... لکھ کر خالی
چھوڑ دیا ہے۔ یوسف الیان سرکیس نے بھی باوجود فراوانی اسباب و وسائل
ان کے سن وفات معلوم کرنے میں کامیابی حاصل نہیں کی بلکہ صرف اتنا لکھ گئے

---

[1] مضمون نگار نے اب سے کوئی دس گیارہ سال قبل ۸۲ھ ۸۳ھ میں مدرسہ مظاہر علوم
سہارنپور کے کتب خانہ میں علامہ سیوطی کا ایک رسالہ دیکھا تھا جس میں علامہ نے اپنی مختلف
علوم و فنون کی تمام کتابوں کی فہرست الگ الگ فن وار مرتب کی ہے اس میں اس کتاب
"الفلک المشحون" کا بھی ذکر ہے۔ سردست وہ رسالہ حاصل نہیں ہو سکا تاکہ اس رسالہ
کے نام و صفحہ کا حوالہ دیا جا سکتا لیکن راقم سطور کو خوب اچھی طرح "ما رأی العین"
یاد ہے اور کشف الظنون میں بھی باب الفاء میں اس کتاب کا ذکر ہے۔
(ج ۲ ص ۴۵)

کہ "نبغ سنۃ ۵۷۰" یعنی ۵۷۰ھ میں ظاہر ہوئے۔

جہاں تک مصنف کے دور کا تعلق ہے تو وہ مذکورہ بالا عبارتوں سے پوری طرح متعین ہو جاتا ہے، لیکن پیدائش و وفات کے سنین کا پتہ نہیں چلتا۔ البتہ ایک عبارت کتاب کے اندر ایسی ملتی ہے جس سے ان کی عمر کی تقریبی حدود متعین ہو جاتی ہیں ص ۱۱۳ پر لکھتے ہیں: "فی تفسیر شیخنا ابن الاثیر" ـــ یعنی ہمارے شیخ ابن الاثیر کی تفسیر میں یہ ہے پھر ایک عبارت نقل کی ہے ـــ یہاں یہ بات علم میں رہنی چاہیئے کہ "ابن الاثیر" کی کنیت سے تاریخ میں چار ہستیاں گذری ہیں اور چاروں صاحب تصانیف ہیں اور چاروں ہی ساتویں صدی ہجری میں ہوئے ہیں۔

۱۔ ابو السعادات المبارک بن ابی الکرم المعروف بابن الاثیر الجزری المتوفی ۶۰۶ھ ان کی مشہور کتاب جامع الاصول لاحادیث الرسول اور النہایۃ فی غریب الحدیث ہے[۲]۔

۲۔ ضیاء الدین ابو الفتح نصر اللہ بن ابی الکرم، ابن الاثیر الجزری المتوفی ۶۳۷ھ۔ ان کی مشہور کتاب "المثل السائر فی ادب الکاتب والشاعر" ہے[۳]۔

۳۔ ابو الحسن عز الدین علی بن ابی الکرم ابن الاثیر الجزری المتوفی ۶۳۰ھ۔ تاریخ کامل اور اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ کے مصنف یہی ہیں[۴]۔

یہ تینوں "ابن الاثیر" بھائی ہیں[۵]۔

۱؎ معجم المطبوعات العربیۃ والمعربۃ ج ۱ کالم ۱۹۶۷

۲؎ شذرات الذہب ج ۵ ص ۲۲، کشف الظنون ج ۱ ص ۳۵۸، وفیات الاعیان ج ۱ ص ۴۴۱

۳؎ کشف الظنون ج ۲ ص ۳۷۵، وفیات الاعیان ج ۲ ص ۱۵۸

۴؎ وفیات الاعیان ج ۱ ص ۳۴۷، کشف الظنون ج ۲ ص ۲۵۹، شذرات الذہب ج ۵ ص ۱۳۷

۵؎ وفیات الاعیان ج ۱ ص ۳۴۷، و ج ۲ ص ۱۶۱

۴۔ قاضی عماد الدین اسماعیل بن تاج الدین ابن الاثیر الحلبی المتوفی ۶۹۶ھ ۔ عمدۃ الاحکام کی شرح احکام الاحکام انہی کی تصنیف [1] ہے۔

ان چاروں میں سے جہاں تک اس ناچیز کو معلوم ہے تفسیر قرآن پر کتاب اول ہی کی ہے جس کا نام ہے "الانصاف فی الجمع بین الکشف والکشاف"۔ یہ تفسیر ثعلبی اور زمخشری کی تفسیروں سے ماخوذ ہے ــــ اس لحاظ سے الکنز المدفون کے مصنف جن ابن الاثیر کو اپنا شیخ بتاتے ہیں وہ اول ہی ہوئے اور ان کا انتقال ساتویں صدی کے آغاز ہی میں ہوگیا تھا یعنی ۶۰۶ھ میں اور گذشتہ صفحات میں نقل کیا جاچکا ہے کہ مصنف رحمۃ اللہ تعالیٰ ۶۷۰ھ میں القدس کے ایک علمی مذاکرے میں شریک ہوئے ہیں۔ اس طرح اگر مصنف کا ابن الاثیر کو شیخنا کہنا حقیقی اور عام ومعروف معنی میں ہے اور فرض کیجئے ابن الاثیر سے تلمذ انھوں نے اپنے بالکل بچپن اور ان کے اخیر زندگی ہی میں حاصل کیا ہو تب بھی عمر بہت طویل قرار پاتی ہے۔ ان کا عہد متعین کرنے میں یہ دو چیزیں کافی حد تک مدد دیتی ہیں تاہم مجال تحقیق وسیع ہے۔

"کم ترک الاول للآخر"

ــــ واللہ تعالیٰ اعلم

---

[1] کشف الظنون ج ۱ ص۵۴ و ج ۲ ص۱۳۱

مئی ۱۹۸۳ء

تاریخ تحول نظم و نثر پارسی کا ایک باب

افشاری، زندی، قاچاری اور مشروطیت کا دور

بارہویں صدی ہجری کے نصف سے چودھویں صدی ہجری کے وسط تک

مترجم: عندلیب زہرا ایم اے (علیگ)

مشہور ایرانی مفکر و تاریخ دان ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا کی کتاب "مختصری در تاریخ تحول نظم و نثر پارسی" گوناگوں خصوصیات کی حامل ہے۔ یہ کتاب ہند و ایران میں کافی مقبول ہے، اب تک اس کے پانچ سے زائد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس کی مقبولیت و اہمیت کو دیکھتے ہوئے اس کا اردو ترجمہ عندلیب زہرا (علیگ) نے کیا ہے۔ تاکہ فارسی زبان سے واقف و ناواقف حضرات بھی جو عالمی ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں اس مختصر تاریخ سے مستفید ہو سکیں۔

اس کتاب کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تقریباً تیرہ سو برس کی فارسی زبان و ادب کی تاریخ کو کم سے کم الفاظ میں پیش کیا گیا ہے اور ہندوستان نے فارسی کی ترقی و تکمیل میں جو نمایاں حصہ لیا اس پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اختصار کے باوجود تاریخ و ادب کے کسی بھی اہم نکتہ یا مسئلہ کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔

اگرچہ اردو میں فارسی ادب پر متعدد طویل کتابیں موجود ہیں۔ خاص طور پر ڈاکٹر رضا زادہ شفق کی کتاب "تاریخ ادبیات ایران" جس کا مستند ترجمہ ندوۃ المصنفین سے شائع ہو چکا ہے۔

برہان دہلی

اس کتاب کی خصوصیات کے پیش نظر قارئین برہان کی دلچسپی کے لئے اس کا ایک باب شائع کیا جا رہا ہے۔ اس باب میں دورِ مشروطیت میں فارسی زبان میں ہونے والے تغیرات اور عہد حاضر کے شعرا و مصنفین کے اسلوب بیان پر بصیرت افروز روشنی ڈالی گئی ہے۔ توقع رکھنی چاہیئے کہ یہ مفید کتاب جلد شائع ہو سکے گی۔

"برہان"

اس باب میں خاندان صفوی کے انقراض سے عصر حاضر تک کی فارسی نظم و نثر اور زبان کی ترقی اور ارتقائی حالتوں کا ذکر کیا جائے گا۔

فارسی شاعری

ہندوستان اور ایران میں فارسی شاعری میں "سبک ہندی" بہت مقبول تھا صفوی عہد کے آخر میں اصفہان کے کچھ صاحب ذوق اور اہلِ سخن نقادانِ فن نے اس طرز کے متعلق ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔

اس تنقید کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک نئی تحریک نے جنم لیا اور شاعری کے نئے طرز یعنی "سبک ہندی" کے خلاف مہم چلائی جانے لگی۔ "سبک ہندی" کے بارے میں پہلے بھی بتایا جا چکا ہے۔[1]

سبک ہندی کو ناپسند کرنے والے نقادوں کا خیال تھا کہ کلیم کاشانی، صائب اور وحید قزوینی وغیرہ کی شاعری فصاحت و بلاغت سے کوسوں دور ہے اور اس طرز کو یکسر ختم کر دینا چاہیئے اور پھر اسی اندازِ سخن کو رائج کرنا چاہیئے جو ہمیشہ سے بڑے بڑے شاعروں اور سخن شناسوں میں مقبول رہا ہے۔

۱۔ صفوی دور میں "سبک ہندی" کا رواج ہوا۔ اس اسلوب میں شاعر فکر و خیال پر زیادہ توجہ دیتا اور زبان و بیان کی صحت و متانت پر کم توجہ دی جاتی۔ سبک ہندی کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس طرز کے نمائندہ شاعر سلاطین صفوی کے دربار سے ہندوستان میں مغلیہ سلاطین کے دربار میں چلے آئے اور اس طرز کو یہاں بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔

ے سلسلے میں جن لوگوں نے پیش قدمی کی اور ان کا کلام بھی باقی رہ گیا ہے ان میں آذر بیگدلی
محمد خاں مسرور اصفہانی (مقتول ۱۱۶۸ھ) آذر بیگدلی کے استاد میر سید علی مشتاق اصفہانی
ھ) میرزا نصیر اصفہانی (م ۱۱۹۲ھ) صاحب مثنوی پیر و جوان، سید احمد ہاتف اصفہانی
ھ) صاحب دیوان قصائد و غزلیات و ترجیع بند اور لطف علی آذر بیگ آذر بیگدلی
ھ) صاحب مثنوی خسرو و شیریں اور تذکرۂ آتشکدہ۔ نندیہ کے معاصر میرزا محمد صادق
ن۔ مشتاق و ہاتف کے دوست آقا محمد صہبائی قمی (م ۱۱۹۱ھ) حاجی سلیمان صباحی
م ۱۲۰۶ھ) اور آقا محمد عاشق اصفہانی (م ۱۱۸۱ھ) وغیرہ کو دنیائے شاعری میں
رنگ کا علمبردار کہا جاتا ہے۔

ں سب کا مقصد اپنے معاصرین کے انداز کو ترک کرنا اور متقدمین کے اسلوب شاعری
رنا تھا۔ انھوں نے خود بھی قصیدہ، غزل یا مثنوی میں قدیم شعراء کے طرز کی پیروی کی۔
اپنے چچا مسرور کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

حضرت نے اصفہان میں کمالات حاصل کئے انھیں شعر گوئی سے بہت رغبت
ی اور شعر فہمی کا بھی اچھا ملکہ تھا۔ ان کے زمانے میں فصحائے متقدمین کا طرز
ئع ہو گیا تھا اس لئے اچھے شعر وجود میں نہ آسکے[1]۔"

ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

بعض ناواقف لوگوں نے شاعری شروع کر دی تھی جس کی وجہ سے سلسلۂ نظم ٹوٹ گیا تھا لیکن
تاق نے سعی و عمل سے کام لیکر شاعری میں اصلاح کی اور متاخرین کی بنیاد شاعری کو تکبیر
دیا۔ اور فصحائے متقدمین کی بنیادوں کی تجدید کی[2]۔" -

۔ آتشکدہ مطبوعہ بمبئی ص ۴۰۹ (اصل مطبوعہ کتاب میں اوراق پر صفحہ نمبر نہیں ڈالے گئے ہیں)
۔ آذر بھی اپنے معاصرین کی طرح بغیر کسی مناسب رعایت کے فعل حذف کر دیتے ہیں اور یہ صریحاً غلطی ہے۔

عبدالرزاق بیگ دنبلی مشتاق کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار اس طرح

"شوکت، صائب اور وحید وغیرہ نے شاعری میں خام خیالات پیش
تمثیل و استعارے سے کام لیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاعری کا اصل حسن
ختم ہوگئی۔ مشتاق نے ان شعراء کی بساط نظم کو الٹ دیا۔ اور اپنے
ذوق کے مطابق شاعری کی دنیا میں نغمہ سرائی کی۔"

ان اشاروں سے معلوم ہوتا ہے کہ بارہویں صدی کے وسط کے ب
میں ایک نہضتِ جدید رونما ہوئی اور اس کے بڑے مرکز اصفہان
شاعروں کا ذکر کیا جا چکا ہے یہ سب انھیں دونوں مراکز سے وابستہ
تدریس میں مشغول رہتے۔

صباحی کا شاگرد صبای کاشانی، عبدالرزاق دنبلی کا شاگرد میرزا
اصفہانی کا پروردہ لڑکا سحاب اصفہانی عہد قاچاری کے ابتدائی دور کے
کا تعلق شیراز اور اصفہان سے تھا۔

یہ تمام شاعر اور ان کے شاگرد جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے قدیم طرز
کرنا چاہتے تھے اور سبک ہندی کو یکسر ختم کر دینے کے درپے تھے۔

سبک قدیم کے احیاء کی تحریک نے فارسی شاعری کے قالب میں ا
پھونک دی اور عین اس وقت جبکہ افغانستان اور ہندوستان میں سبک
روایات کے ساتھ ترقی کر رہا تھا ایران میں قاچاری دور کے آخر تک
سخن کی تقلید سے انحراف کیا جانے لگا۔ مثلاً رضا قلی خاں نے اپنے
(مجمع الفصحاء) کے شروع میں لکھا ہے:

مؤلف (۱) حدائق الجنان۔ نقل از سبک شناسی تالیف ملک الشعراء بہار مرحو

"ترکمانی اور صفوی دور میں ناقص طرز سخن ایجاد ہوئے اور قصیدوں، موعظہ نصیحت، فلسفہ اور زہد و حماسہ سرائی میں متقدمین کے طرز متروک ہو گئے شاعر مخمس، مسدس، نوحہ اور معمہ نگاری اور تعمیہ اسم بے معنی کی طرف مائل ہو گئے۔ غزل کی کوئی مخصوص شکل مرتب نہ ہوئی تھی۔ جہاں تک ہو سکا ان لوگوں نے پریشان گوئی اور بیہودہ سرائی سے کام لیا۔ حقائق سے انحراف کیا اور فرسودہ مضامین نظم کئے اور صنائع بدیعہ اور بدائع لطیفہ کے بجائے ناکارہ مطالب کو اشعار میں بھر دیا۔ خاص طور سے صفوی اور افشاری دور کے آخری ایام میں اور زندی عہد کے شروع میں اور الوار یہ عہد میں ان لوگوں نے فصاحت و بلاغت اور حکمت و معرفت کے سورج کو گہن لگا دیا۔

سلطنت الواریہ کے آخر میں چند آدمیوں نے متقدمین کے طرز کے احیاء کے لئے بہت کوششیں کیں اور متاخرین کے غیر لطیف اور مبتذل طرز سے اکتا کر متقدمین کے اسلوب کی طرف مائل ہو گئے اور متقدمین کے کلام کو اپنے لئے سرمشق بنایا۔"

یہ قول محمد شاہ اور ناصر الدین شاہ کے زمانے کے ایک مشہور شاعر و ادیب امیر الشعراء کا ہے یہ شخص خود بھی صاحب نقد و نظر تھا۔ اس کے قول سے ہی پوری طرح اندازہ ہوتا ہے کہ قاچاری عہد میں سبک ہندی کے بارے میں عام نظریہ کیا تھا۔
نئے اسلوب شاعری کو جنم دینے والے شاعروں نے جب قدما کے طرز کا احیاء کیا تو اس کے معاصرین نے فارسی ادب کی تاریخ میں اس کو "دورۂ بازگشت" کا نام دے دیا۔
بازگشت یا قدما کے طرز کے تجدیدی دور کو دو زمانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔
پہلا دور بارھویں صدی کے وسط سے شروع ہوتا ہے اور تیرھویں صدی ہجری کے آغاز میں اس کا خاتمہ ہوتا ہے اس مدت میں جو شاعر پیدا ہوئے انھوں نے چھٹی، ساتویں

اور آٹھویں صدی کے شاعروں کی غزل، قصیدہ اور مثنوی کو اپنے لئے نمونہ

دوسرے دور کا اطلاق تیرھویں صدی ہجری کے نصف اول کے آخر

دور کے شاعروں نے چھٹی، ساتویں اور آٹھویں صدی کے شاعروں کے ا

نظر رکھا۔ مثلاً ہدایت، سروش، فتح اللہ خاں شیبانی اور محمود خاں ملک الش

شاعر ہیں۔

در اصل اسی زمانے میں قدیم ادبی طرز کی تکمیل ہوئی اور رضا قلی خاں

معاصرین کو قدیم رنگ اختیار کرنے کی طرف متوجہ کیا۔ اس دور کے آخر

بار آور ہوئی۔

جس طرح بتدریج شاعری رو بہ زوال ہو گئی تھی اسی طرح تدریجاً ا

اور فتح علی شاہ .... کو سلطنت کے قیام کے بعد شعر و شاعری سے ذوق پیدا

شاعر جمع کئے گئے اور قدما کا طریقہ رائج ہوا اور اسی طرز کو اپنانے میں ش

پر سبقت لے جانے کی کوشش کرنے لگے۔ اور شعرا متوسطین اور متاخرین

نقوش کو فنا کر دینے کے درپے ہو گئے۔ کچھ نے خاقانی شروانی اور عبد

پر سجع اور مقفیٰ اور پر تکلف قصائد لکھے۔ بعض نے فرخی اور منوچہری کی تقلید

کو حکیم رودکی اور قطران کا طرز سخن پسند تھا۔ ایک گروہ نے عنصری، مسعو

ایک نے حکیم الٰہی سنائی غزنوی اور جلال الدین محمد مولوی کو، کچھ نے حکیم ابو

ابیوردی کو اپنے لئے مشعلِ راہ بنایا۔

کچھ نے اسدی طوسی اور فردوسی کے انداز پر رزمیہ نگاری کی۔ بعض۔

کو رزمیہ میں نشانِ راہ سمجھا۔

کچھ نے ازرقی و مختاری کا طرز اختیار کیا اور کچھ نے معزی اور لامعی

محسوس کیا۔ دانشمندوں کے ایک طبقہ نے حکیم ناصر کی پیروی کی۔ ادیب

ئی۔ بہت کم ایسا ہوا کہ کسی ایک نے ان سب کا تتبع کیا ہو۔ بلکہ قصیدہ گوئی میں قدیم اور
ں میں جدید شعرا کا طرز مقبول اور رائج تھا۔ زندی اور قاچاری عہد میں شاعروں نے جو روش
تم کی وہ دورۂ مشرطیت سے لیکر آج تک شاعری میں مروج ہے مشرطیت کی ابتدا سے
بعد تک صرف کمتر درجے کے شاعروں نے دوسری روش اختیار کی اور انھیں آج تک
بھی بھی شاعری میں بلند مقام نہ حاصل ہو سکا۔

زندی عہد کے مشہور شاعروں کے بعد قاچاری عہد کے چند مشاہیر کا ذکر کیا جاتا ہے یہ
ب متقدمین کے طرز کے پیرو تھے۔ انھوں نے غزل میں سعدی و حافظ کی، رزمیہ مثنوی میں
ردوسی کی، بزمیہ مثنوی میں نظامی کی، قصائد و مسمطات اور مقطعات میں چوتھی، پانچویں
ر چھٹی صدی کے شعرا بالخصوص عنصری، فرخی، منوچہری، مسعود سعد، سنائی، انوری
ور خاقانی کی تقلید کی۔

اس دور کے شاعروں کی زبان کا وہی قدیم رنگ ہے جو مغلوں اور ان سے پہلے کے شاعروں
ں رائج تھا۔ ان کی توجہ زیادہ تر آرائش سخن، رعایت لفظی، اور الفاظ کی فصاحت پر رہی۔
ہت کم شاعر ایسے ملیں گے جنھوں نے اپنے زمانے کے لہجہ کا لحاظ رکھا ہو۔ دورۂ بازگشت
ے شاعروں کا موضوع عموماً توصیف و مدح، پند و وعظ، آئمہ معصومین کی شان میں قصیدہ و
راثی، رزمیہ، تاریخی، مذہبی اور عشقیہ مثنویاں اور غزل ہے۔

خوش قسمتی سے اس دور کے شاعروں کو بادشاہوں کی سرپرستی حاصل تھی۔ اس
لے میں خاص طور سے قاچاری سلاطین نے شاہان ماسلف کی تقلید کی کوشش کی۔

بادشاہوں کی توجہ ہی سے تہران، شیراز، اصفہان اور مشہد ادب کے بڑے مرکز بن
ئے۔ اور بہت سے شاعر منظرِ عام پر آئے۔ جن میں سے اکثر نے دیوان، طویل مثنویاں
غ اور اچھے شعر یادگار چھوڑے۔

ہم افشاری اور زندی دور کے بڑے بڑے شاعروں کا ذکر پہلے ہی کر چکے ہیں۔ اب عہد قاچاری کے نامور شعرا کا ذکر کیا جاتا ہے۔

فتح علی خاں صبای کاشانی (م ۱۲۳۸ھ): یہ صباحی کاشانی کا شاگرد تھا۔ اور فتح علی شاہ کے دربار میں ملک الشعرا تھا، اس کے قصیدوں کا دیوان مشہور ہے۔ اس کے علاوہ اس کی مثنویاں، شہنشاہ نامہ، خداوند نامہ، گلشن صبا، اور عبرت نامہ بھی بہت مشہور ہیں۔ اور ایران کے آخری زمانہ کے ادب میں اپنا مقام رکھتی ہیں۔

صبا کے اکثر قصیدوں میں کلام کی قدرت، معانی کی دقت اور عبارت کی جزالت کے اتنے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں کہ ان کو دیکھکر چھٹی صدی کے فصحا کے قصائد کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

سید محمد سحاب اصفہانی (م ۱۲۲۲ھ): سید محمد ہاتف کا لڑکا تھا اور فتح علی شاہ کے زمانے کا مشہور قصیدہ گو اور غزلگو تھا۔ قصیدہ گوئی میں اس نے انوری اور خاقانی کی بڑی خوبی سے تقلید کی ہے اور پوری طرح کامیاب بھی رہا۔

مجتہد الشعرا سید حسین مجمر اصفہانی (م ۱۲۲۵ھ): اس نے عالم شباب میں وفات پائی غزل اور قصیدہ میں بڑی کامیابی کے ساتھ متقدمین کی پیروی کی ہے۔

معتمد الدولہ میرزا عبدالوہاب نشاط اصفہانی (م ۱۲۴۴ھ): یہ نظم و نثر اور خط (تحریر) کے لئے اپنے دور کے ممتاز لوگوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ اس نے متقدمین کے انداز پر عمدہ غزلیں لکھیں

میرزا شفیع وصال شیرازی (م ۱۲۶۲ھ): یہ میرزا کوچک کے نام سے مشہور ہے مثنوی، غزل اور قصیدہ گوئی میں مہارت تھی۔ غزلگوئی اور خوشنویسی میں اس کی استادی کو ہمعصروں نے تسلیم کیا ہے۔ وصال نے وحشی کی ناتمام مثنوی "فرہاد و شیرین" کو مکمل کیا اور بحر متقارب میں ایک مثنوی "بزم وصال" لکھی۔

میرزا حبیب قاآنی (م ۱۲۷۰ھ): قاآنی قاچاری عہد کا مشہور قصیدہ گو ہے اس کو

غزل گوئی اور نثر نویسی میں بھی کمال حاصل ہے۔ اس کی شہرت کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس نے قصیدہ گوئی میں ایک خاص طرز کو اپنایا اور قدما کے طرز کے اتباع کے باوجود نئے نئے مضامین، نئی ترکیب اور نئی فکر سے کام لیا۔ گلستان کے طرز پر نثر میں ایک کتاب "پریشان" لکھی جو خاص شہرت کی حامل ہے۔

میرزا عباس فروغی بسطامی (م ۱۲۷۴ھ)[1] : عہد قاچاری کا مشہور غزل گو ہے اس کی بیشتر غزلیں فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے سعدی و حافظ کی یاد دلاتی ہیں

میرزا محمد علی سروش اصفہانی (م ۱۲۸۵ھ) : ناصر الدین شاہ کے زمانہ کا مشہور شاعر ہے۔ اس نے قصیدے اور مثنویاں لکھیں۔ بنیادی طور پر وہ قصیدہ کا شاعر ہے۔ قصیدہ گوئی میں اس نے بڑی استادی کا ثبوت دیا ہے اور اکثر فرخی کی پیروی کی ہے۔ اس کی مثنوی "اردی بہشت" بحر متقارب میں ہے اس میں حضرت علی کے غزوات بیان کئے گئے ہیں اور بھی کئی مثنویاں مثلاً ساقی نامہ اور الٰہی نامہ لکھیں۔

محمود خاں ملک الشعراء کاشانی (م ۱۳۱۱ھ) : اپنے عہد کا مشہور قصیدہ گو تھا اس نے منوچہری اور فرخی کی بڑی خوبی و مہارت سے تقلید کی ہے۔

ابو النصر فتح اللہ خان شیبانی کاشانی : محمد شاہ و ناصر الدین شاہ قاچار کا معاصر تھا اور اپنے عہد کا ماہر قصیدہ گو تھا۔ اس پر غزنوی دور کے شاعروں کا رنگ غالب ہے۔

ان کے علاوہ بھی قاچاری دور میں بہت سے بڑے بڑے شاعر پیدا ہوئے جن کے حالات اور تصانیف کے متعلق ہدایت نے مجمع الفصحاء کی دوسری جلد میں سب سے بہتر طور پر لکھا ہے یہاں ان سب کا ذکر ممکن نہیں۔

قاچاری عہد کے شعراء کے کلام کے بغور مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان سب نے اگرچہ

---

(۱) مجمع الفصحاء میں فروغی کی تاریخ وفات ۱۲۳۳ھ درج ہے۔

ابتکار مضمون اور نئے نئے خیال وفکر کے بیان پر کم توجہ دی ہے لیکن یہ کہنا ضروری ہے کہ انھوں نے صحیح فارسی زبان کے احیاء اور قدیم شعراء کے فکر کی تجدید کر کے فارسی زبان وشاعری کی بہت بڑی خدمت انجام دی اور فارسی زبان وشاعری کو ابتذال وسستی سے نجات دلائی۔ یہ اسلوب مشروطیت کے زمانے سے لے کر اب تک کے مشہور شاعروں مثلاً ادیب نیشاپوری، ادیب پیشاوری، ادیب الممالک فراہانی اور ملک الشعراء بہار خراسانی کے ہاں ملتا ہے۔ صرف آخر کے پندرہ بیس سالوں سے بعض معاصر شاعروں نے فارسی شاعری میں جدت سے کام لینا شروع کیا ہے۔

فارسی نثر

فارسی نثر بھی افشاری، زندی اور قاچاری دور میں کچھ ترقی پذیر ہو گئی تھی۔ اس زمانے میں وہ طرز پھر سے رائج ہو گیا جو گذشتہ مصنفین میں مقبول تھا۔ ظاہر ہے کہ نظم کی طرح نثر میں بھی فصاحت وبلاغت کا معیار قدیم مصنفین کی تحریریں ہی تصور کی جاتی تھیں۔ عموماً چھٹی، ساتویں اور آٹھویں صدی کے لکھنے والوں کی تقلید زیادہ کی جاتی مگر تیرھویں صدی کے اواخر میں اکثر واقعہ نگاروں (مثلاً میرزا ابراہیم) نے پانچویں صدی کے آخر کے اسلوب کو پیش نظر رکھا۔

اس عہد کے شروع میں فارسی منشآت میں صفوی دور کے لکھنے والوں کی سی بے پروائی موجود تھی۔ یہاں تک کہ میرزا مہدی خاں منشی نادر، اور آذر بیگدلی اپنی استادی کے باوجود افعال کے حذف کر دینے کی غلطی سے محفوظ نہ رہ سکے لیکن قاچاری عہد کے مشہور لکھنے والوں کے ہاں اس قسم کی خامیاں بہت کم نظر آتی ہیں۔ افشاری، زندی اور قاچاری دور کے مشہور ادیب یہ ہیں:

میرزا مہدی خاں استرآبادی: یہ نادر شاہ کا منشی تھا۔ اس کی کتاب "درۂ نادرہ" تاریخ وصاف کی طرح لفظی صنائع اور تکلف وتصنع سے پُر ہے۔ اس کی ایک اور کتاب "جہانگشای نادری" ہے جو نسبتاً سادہ طرز میں ہے اور اس کی عبارت اول الذکر کتاب

ہے۔
قاچاری عہد کے شاعروں کے ضمن میں اس کا ذکر ہو چکا ہے۔ نشاط اپنے
ب طرز اور ماہر لکھنے والوں میں شمار کیا جاتا ہے اس کے منشآت

ہیں : فتح علی شاہ کا معاصر تھا اس کے منشآت مشہور ہیں۔ اس نے
خاقان' بھی لکھا۔
ت شاعر اس کا ذکر ہو چکا ہے۔ نثر میں اس نے سعدی کی گلستاں کے طرز
پریشان' لکھی۔
ور اس کا لڑکا عباس قلی سپہر: یہ دونوں مشہور و مبسوط کتاب "ناسخ التواریخ"

یت (م ۱۲۸۸ھ) : امیر الشعراء کے لقب سے ممتاز ہے۔ محمد شاہ اور
معاصر تھا۔ اس کی کئی تصانیف ملتی ہیں مثلاً مجمع الفصحار دو جلد۔ صفوی
کے حال میں ایک تذکرہ 'ریاض العارفین'۔ روضۃ الصفا کا تتمہ روضۃ الصفا'
غت' انجمن آرای عباسی' وغیرہ۔
ائم مقام فراہانی (مقتول ۱۲۵۱ھ) : یہ محمد شاہ کا وزیر اور قاچاری عہد کا
نے تھا۔ تکلف آمیز نثر میں اس کے منشآت ملتے ہیں۔ ان منشآت میں مؤلف
بق الفاظ کا استعمال کیا ہے اور دقیق معانی آفرینی سے کام لیا ہے اس
ایک خاص اثر ہے۔
نے لفظی صنعتوں کو کثرت سے استعمال نہیں کیا اس کے خداداد ذوق نے مناسب
صنائع صرف اس حد تک استعمال کئے ہیں کہ کلام کے لطف اور عبارت کی
نہیں آتی۔

قدیم فصحا کا استشہاد اس کے کلام میں زیادہ ملتا ہے لیکن وہ متقدمین کے کلام کے حوالے اس وقت استعمال کرتا ہے جبکہ وہ مشہور و رائج مثل کا درجہ حاصل کر چکے ہوں اور اس طرح ان کے کلام کو اپنے کلام میں شامل کرتا ہے گویا وہ اس کے کلام کا جزو ہے اور اقتباس و رعایت کا گمان نہیں ہونے پاتا۔ اس کی عبارت مختصر اور تراکیب دلکش ہوتی ہیں۔ بلاشبہ اسے ایران کے آخر دور کا بہترین مصنف کہا جاسکتا ہے اور حقیقی ادیب کا اس پر بخوبی اطلاق ہوتا ہے۔

قاچاری عہد کے آخر میں چند اور بھی کئی اچھے لکھنے والے نظر آتے ہیں مثلاً:۔

میرزا عبداللطیف تبریزی: فرہنگ برہان جامع اور ترجمۂ الف لیلۃ ولیلۃ کے مصنف۔

محمد حسن خاں صنیع الدولۃ (اعتماد السلطنۃ): مرآت البلدان اور کتاب منتظم ناصری اور تذکرہ خیرات حسان کے مصنف۔

میرزا محمد ابراہیم: یہ وقائع نگار تھا۔

فتح علی شاہ کے دورۂ حکومت کے بعد ایران اور یورپ کے درمیان تعلقات قائم ہوئے اور مختلف فنون کے ماہرین فوجیوں اور انجینروں کو دعوت عمل دی گئی اور اس کے لئے مدرسے قائم کئے گئے اور طلباء و ماہرین کو یورپین ممالک بالخصوص فرانس اور انگلستان بھیجنے کا رواج ہوا۔

امراء کے بچے، شاہزادے اور اعلیٰ طبقہ کے افراد فرانسیسی اور انگریزی ادب سے واقف ہوئے۔ رومانی اور داستانی کتابوں سے لیکر علمی، فنی اور فوجی کتابوں کے فارسی میں ترجمے کئے جانے لگے۔ اسی مدت میں میرزا محمد تقی خان امیر کبیر نے "مدرسہ دارالفنون" کا افتتاح کیا۔ اس کے ذریعہ ایرانیوں کو جدید علوم سے واقفیت حاصل کرنے کا موقعہ ملا۔ رفتہ رفتہ روزناموں کی اشاعت کا بھی رواج ہوا۔ ایرانی مصلحوں کی جماعتوں کے افرا

ایران سے باہر اور ایران میں اپنے سیاسی اور اجتماعی نظریات سادہ اور عام فہم زبان میں قلمبند کرنے لگے۔ علمی و فنی اور درسی کتابوں کو عصری تقاضوں کے مطابق جدید طرز پر لکھنے کی ضرورت محسوس کی جانے لگی۔ اس زمانے میں مشروطیت کی تحریک بھی اٹھی اور لوگوں میں ہیجان برپا ہوگیا۔ مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے والی جماعتیں جدید کتابوں کے مطالعہ میں سرگرم ہوگئیں اور یورپین افکار و عقائد سے اپنے ربط کے استحکام کے لئے کوشاں ہوگئیں۔

ایران میں چھپائی کے رواج کی وجہ سے مختلف افکار اور ادبی آثار سے لوگ بخوبی واقف ہوگئے تھے۔ اسی افراتفری کے عالم میں مشروطیت کا انقلاب شروع ہوا۔ برملا تقریریں اور جلسے کئے جانے لگے۔ متواتر اخباروں کی اشاعت ہونے لگی۔ نئے مدرسے قائم کئے گئے۔ یورپین زبانیں سیکھی جانے لگیں۔ پڑھے لکھے لوگوں کے لئے مغربی ادب سے واقفیت حاصل کرنا ضروری سمجھا جانے لگا۔ جدید عربی ادب میں بھی بڑی تیز رفتاری سے ترقی اور تبدیلی کے آثار نظر آنے لگے۔ فکر و عقیدہ میں زبردست تبدیلی پیدا ہوگئی۔ اب دربار اور امیروں کی جماعتوں سے نکل کر ادب عوام میں زیادہ مقبول ہوگیا۔

اسی ارتقاء کا نتیجہ یہ ہوا کہ لکھنے کی روش میں تغیر و تبدیلی پیدا ہوگئی۔ نظم و نثر میں نئی فکر سے کام لیا جانے لگا۔ سادہ اور ہر قسم کی آرائش سے عاری طرز نگارش کا رواج ہوا۔ مختلف قسم کے ادبی مسائل مثلاً داستان، ڈرامے، اجتماعی و اخلاقی و سیاسی مباحث اور علمی و ادبی مباحث اور تاریخی و ادبی تحقیقات وغیرہ کا فارسی زبان میں رواج ہوا۔ مصنفین کی زبان میں بھی بتدریج تبدیلی ہوئی اور عام بول چال کو تحریر میں استعمال کیا جانے لگا۔ نئی تراکیب اور نئے نئے الفاظ فارسی میں شامل ہوئے جن میں سے بیشتر یورپین اور کچھ ترکی استانبول کے تھے۔ نئے نئے خیال، جدید افکار اور تازہ اصطلاحیں وجود میں آئیں۔

فارسی نظم و نثر میں کچھ وجوہ کے سبب تنزل پیدا ہوگیا اس کی وجہ یہ ہے کہ بہت سے لوگ جنھیں نظم و نثر لکھنے پر قدرت نہ تھی بلکہ وہ تصنیف اور شاعری کے ابتدائی اصولوں تک

سے بے بہرہ تھے شعرا و مصنفین کی صف میں زبردستی داخل ہو گئے۔ یہاں تک کہ ایسا بھی دیکھنے
میں آیا کہ ایسے بہت سے افراد جو صحیح فارسی بلکہ مروجہ معمولی زبان سے بھی واقف نہ تھے اخبا
میں سرسری مقالے لکھنے لگے۔ اور رسالوں میں ان کے غلط اور غیر موزوں ترجمے شائع ہونے لگے
اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غلط الفاظ، نامناسب تراکیب و اصطلاحات اور قواعد کی غلطیاں وغیرہ
کثرت سے نظم و نثر میں استعمال کی جانے لگیں۔

دوسرے عوامل جن کا ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں فارسی نظم و نثر کی ترقی کا سبب بنے اور تجدد
و تنوع کا باعث ہوئے۔

نثر میں بھی سادہ زبان استعمال کی جانے لگی۔ اور نثر لفظی پابندیوں سے آزاد ہو گئی۔ کتابی زبان کو عا
بول چال کی زبان سے ہم آہنگ کر کے آسان بنا لیا گیا اور نثر کو اس قابل بنا دیا گیا کہ اس میں ہر قسم کے خیال ک
واضح کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی۔ یہی سبب ہے کہ فارسی کی بہت سی کتابوں کی زبان بہت آسان ہے۔

عہد ناصری کے آخر میں جدید علوم پر کتابیں لکھی جانے لگیں اور اس کے بعد اس کا رواج بڑھتا گیا
یورپین کہانیوں اور افسانوں کے ترجمے کئے گئے اس سے یہ فائدہ ہوا کہ فارسی میں طویل ناول اور مختصر
لکھنے کا رواج ہوا۔ اور اب یہ فن بہت ترقی کر چکا ہے۔ یورپین ادب اور طریقہ تحقیق سے واقفیت ک
بنا پر فارسی میں تاریخ نویسی اور ادبی مسائل میں تحقیق کے انداز میں تبدیلی پیدا ہوئی۔ اب تک ایرا
کے بہت سے ادبی اور تاریخی مسائل اور نکتے حل کئے جا چکے ہیں۔

اس قسم کی ترقیوں کے سبب فارسی ادب میں ایک طرح کی تحریک اور انقلاب سا رو
ہوا۔ امید ہے کہ اس کے اچھے نتائج برآمد ہوں گے۔

دورۂ مشروطیت میں جن مصنفین نے ادب کی خدمت کی اور شہرت پائی ان میں ش
احمد روحی (مقتول ۱۳۱۴ھ ہجری قمری) میرزا آقا خاں کرمانی (مقتول ۱۳۱۴ھ) مؤلف صد خ
سہ مکتوب اور آئینہ سکندری۔ اور میرزا ملکم خاں مصنف رسالۂ وزیر و رفیق اور روزنامہ
قانون کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ...

چین کا حق تنسیخ اور بنگلہ دیش

(از مولانا محمد ابرار حسین صاحب فاروقی گوپاموی)

نظر مقالہ اگرچہ ایک وقتی مسئلہ "چین کا حق تنسیخ اور بنگلہ دیش" کے عنوان پر ہے مگر چونکہ اس مقالہ
جنگ عظیم اول اور جنگ عظیم ثانی کے اسباب و علل اور ان کے نتیجہ میں عرب ممالک، ترکی اور
اسلامی ملکوں کی تقسیم نیز مرحوم لیگ آف نیشنز اور موجودہ اقوام متحدہ کے قیام و کارناموں پر
تبصرہ بھی ہے جس کو قارئین برہان کی دلچسپی کے پیش نظر شائع کیا جا رہا ہے (برہان)

ت چین نے ۲۱ سال یو۔ این۔ او انجمن اقوام متحدہ کی ممبری سے محروم رہنے کے
ں کے مخلصین اور ہوا خواہوں کی پیہم جدوجہد سے جس میں سر فہرست جمہوریہ ہند
اخلہ کے صلہ میں اپنا ہتھیار "تنسیخ" پہلی ہی نشست میں اس تحتی براعظم کے ایک
" بنگلہ دیش" کے خلاف ناقابل تسلیم دلائل کے ساتھ۔ بربنار مخالفت ہوا خواہ
ں کرکے اور اسی "بنگلہ دیش" کو جس کی آبادی ساڑھے سات کروڑ ہے اور جو مسلم
ہوارہ ہے اور جس کو اقوام متحدہ کے (۱۳۲) ممبر حکومتوں میں سے کم و بیش
چھوٹی حکومتوں نے تسلیم کر لیا ہے (جس میں چار بڑے مستقل ممبر بھی شامل ہیں) ممبری
رکے اپنی (۲۱) سالہ محرومی کا گویا بدلہ لے لیا ہے۔ اس کے لئے سوائے اس کے اور
ہے کہ

بریں عقل و دانش بہ باید گریست

چین کے اس تشیخی حربہ پر تبصرہ سے پہلے یہ ضروری ہے کہ پچھلی دونوں عالمی جنگوں کی مختصر ترتاریخ لکھدی جائے تاکہ ناظرین کے نہ صرف حافظہ کا احیاء ہوجائے بلکہ اس "حق تنسیخ" کا تاریخی پس منظر بھی واضح ہوجائے۔

۱۹۱۴-۱۸ء اور پھر ۱۹۳۹-۴۵ء کی دونوں عالمی جنگوں کے بانی جرمنی قوم کے بربریت پسند افراد تھے۔ پہلی عالمی جنگ (محض شاہنشاہیت کی ہوس میں) قیصر ولیم نے لڑی جس نے لاکھوں جانوں کا خون بہاکر اور ہزیمت کے بعد جلاوطن ہوکر اپنے پڑوسی ملک ہالینڈ میں جاکر پناہ لی اور اس طرح سے موت کے چنگل سے وقتی طور پر بچ گیا۔ کامیاب، پرغرور اور فتح کے نشہ میں چور اتحادیوں نے ایک انجمن بنام "لیگ آف نیشن" ایجاد کردی اور اس کا مستقر لندن ٹھہرایا۔ اس انجمن کی تشکیل اور اصلی مقصد پر جو مختصر ترتبصرہ سر اقبال مرحوم نے فرمایا وہ انجمن کے آئین اور مقصد کی واضح تر تصویر ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند

بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

انجمن اقوام کی کارروائیاں اتحادیوں کے ظلم وستم اور لوٹ کھسوٹ کی آئینہ دار ہیں جس کی تفصیل لاحاصل ہے۔ کون نہیں جانتا کہ "انجمن اقوام" کا اصلی نام لائڈ جارج تھا جو نہ صرف "برطانیہ عظمیٰ" کا وزیر اعظم تھا بلکہ اقوام متحدہ کا وہ "قائد اعظم" بھی تھا کیونکہ دوسرے جتنے بھی ممبر تھے وہ اس کے خوشہ چین اور کاسہ لیس تھے۔ امریکی صدر مسٹر ولسن کے پیش کردہ (۱۴) اصول دریا برد ہوگئے اور مسٹر ولسن جو گویا شریک کار تھے باحسرت دیاس اپنے ملک کو سدھار گئے اب رہا روس وہ بالشوک ہوچکا تھا۔ لہٰذا وہ پنچایت باہر تھا۔ اس وقت کا چین جو سابق صدر سن یٹ سن کے ساڑھو چیانگ کائی شیک کی ملکیت یا صدارت میں بے چینی کی زندگی گذار رہا تھا اور جہاں (۱۲۵) چینی ڈالر میں [illegible] شتہ ملتا تھا اور جہاں فاقہ کشوں کی لاشیں سڑکوں پر پڑی رہتی تھیں جن کو کوئی نہیں پوچھتا تھا۔ ایسے چین کا عدم وجود برابر تھا

لہذا لائڈ جارج اور ان کے ہم نوالہ اور ہم پیالہ لارڈ بلفور سہ تن انجمن اقوام تھے اور اپنے حرکت مذبوحی سے وقتی طور پر آدھی دنیا کے مالک ہوگئے تھے امریکہ چونکہ برطانوی پالیسیوں یا جوع الارضی کی اسکیموں کا ساتھ نہ دے سکا اس لئے وہ اپنے (۱۴) اصولوں کا پشتارہ لے کر یورپ کی سیاست سے کنارہ کش ہوگیا۔ اب مرزمیدان صرف مسٹر لائڈ جارج تھے جو خود ہی "لیگ آف نیشن" تھے اس لئے امن کانفرنسوں میں وہی سیاہ و سفید کے مالک تھے۔

بہرحال "تقسیم قبور" کا کام شروع ہوگیا۔ جس کا نشانہ افریقہ اور ایشیا کے ملک بنے۔ جو بیشتر مسلمان یا بالفاظ معروف اسلامی ملک تھے۔ اس تقسیم اور قبضہ کا نام حمایت یا حفاظت (PROTECTORATE یا MANDATE) رکھا گیا۔ غرضکہ شام اور شمالی (یعنی مغربی) افریقہ کے بعض ملک فرانس کے حوالے گئے۔ مصر، فلسطین، عراق اور مشرقی افریقہ کے جرمنی مقبوضات برطانیہ کے حصہ میں آئے۔ اسی طرح دوسری سفید فام حکومتوں کو تھوڑا بہت حصہ دے کر نوازا گیا۔

فلسطین چونکہ لارڈ النبی نے امیر فیصل (بعد میں شاہ فیصل مرحوم) کی مدد سے فتح کیا تھا اس لئے اس نے بحیثیت فاتح کے "بیت المقدس" کو اپنا صدر مقام بنایا۔ ۱۹۲۰ء میں جب میں مصر سے بغرض زیارت بیت المقدس پہونچا تو مسلمانوں اور یہودیوں کا بیت المقدس کی تاریخ میں خونی معرکہ اس سرزمین حرم میں دیکھا جو اس قسم کے فسادوں سے ہمیشہ پاک رہا۔ فی الحقیقت یہ بلفور اعلان "یہودی وطن" کا شاخسانہ یا صیہونی جمہوریت کا دیباچہ تھا۔ جو اب حکومت اسرائیل کے نام سے مشہور ہے۔ اور جو کچھ عربوں کے ساتھ کر رہی ہے وہ دنیا پر روشن ہے۔

یہ وہ وقت تھا کہ شام کے شہر دمشق میں بیٹھ کر امیر فیصل مرحوم نے اپنی بادشاہت کا اعلان کیا تھا اور دوسری طرف بیروت میں فرانسیسی فوجیں بر بنائے مفروضہ لیگی "حمایت" اتر چکی تھیں۔ اس کے جنرل نے شاہ فیصل کو نوٹس دیا کہ ۲۴ گھنٹے کے اندر ملک چھوڑ دو۔ اور یہ دھمکی

کہ میعاد گزرنے کے بعد فوجی کارروائی شروع کر دی جائے گی۔ امیر فیصل نے اس نوٹس اور دھمکی سے اپنے مربی لائڈ جارج کو اطلاع دی جس نے اطاعت کی نصیحت کر کے ان کو اپنے پاس بلا لیا۔ اور وہ اپنی بنائی ہوئی کابینہ کے ممبروں کو فرانسیسی بہیمیت کے بھینٹ چڑھا کر فوراً پیرس اس کانفرنس میں شرکت کے لئے روانہ ہو گئے جو لائڈ جارج کے آغوش کا دوسرا نام تھا۔ بہرحال شام تو ضرور فوجی معرکوں سے بچ گیا مگر ارض مقدس میں خونریزی سے یہودیوں نے گریز نہ کیا اور مسلمانوں کا خون بہا کر اپنی صیہونی اسکیم کی بنیاد ڈال دی۔

اس کے بعد ترکی سلطنت کی باری آئی جس پر انگریزوں کا بنام اتحادی قبضہ تھا جس کی قیادت انگریزی جنرل ہیرنگٹن کر رہا تھا۔ اس مجبور اور مقہور سلطنت کے اس طرح سے ٹکڑے پارچے کئے گئے کہ تھریس معہ سالونیکا اور ایشیائے کوچک کا ساحلی شہر سمرنا (ازمیر) یونان کو بخشا گیا۔ کچھ اس کے ساحلی شہر اور علاقے فرانس اور اٹلی کو بخشے گئے۔ قسطنطنیہ در ولبست اور درہ دانیال معہ آبنائے باسفورس انگریزوں کی جاگیر میں رہے۔ درہ دانیال کے فوجی استحکامات بقول حکومت برطانیہ ڈھا دیے گئے۔ لیکن بقول ایک ترکی فوجی اعلا افسر کے جس نے مجھ سے بحالت قید کہا تھا کہ جو وہاں چند بیرکیں تھیں وہ ڈھائی گئی ہوں گی ورنہ قدرتی استحکامات کو کون ڈھا سکتا ہے جو درہ دانیال کی خصوصیت ہے۔ بہرحال آبنائے باسفورس انگریزی جنگی بیڑے کی آماجگاہ بن گیا۔ خلیفہ وحید الدین دار الخلافہ میں انگریزوں کی قید میں تھے۔ "معاہدہ سیورے" کے نام سے "مرد بیمار" کے خاتمہ کے لئے (جو ترکی حکومت کو نام دیا گیا تھا) جو کچھ کرنا تھا وہ سب کیا گیا۔ اور یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ "مرد بیمار" اب ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ لیکن بقول کیکہ جس کو خدا رکھے اس کو کون چکھے وہ "مرد بیمار" نہ ختم ہونا تھا نہ ہوا۔ اس کے علاوہ لاکھوں ترکی قیدی جو انگریزی دھوکے اور فریب کا شکار ہو کر ۱۹۱۸ء میں بالخصوص شامی محاذ پر بھیڑ بکریوں کی طرح سے پکڑے گئے تھے۔ وہ قیدی برسوں سے مختلف ملکوں میں کیمپوں کی زندگی گزار رہے تھے۔ جو قید سے بچ گئے تھے وہ انور پاشا، جمال پاشا، ناظم پاشا، نوری پاشا اور کمال پاشا تھے۔ ان میں سے انور پاشا اور جمال پاشا

انگریزوں کی سازش کے شکار ہوئے۔ انور پاشا بالشویک سے مقابلہ کرتے ہوئے افغانستان اور خراسان کی سرحد پر شہید ہو گئے۔ جمال پاشا طفلس (قفقاز) کے ایک ہوٹل میں شہید کئے گئے۔ نوری پاشا اور ناظم پاشا ایشیاء کوچک میں مخفی طور پر زندگی کے دن پورے کر رہے تھے۔ کمال پاشا قسطنطنیہ میں گویا نظر بند تھے۔ آخر میں انھیں کی سعی پیہم سے عصمت پاشا انونو کی معیت میں انگریزوں کی حرکات مذبوحی اور بہیمیت کا ہمیشہ کیلئے جنازہ اٹھ گیا اور مرد بیمار مرد آہن ہو گیا اب وہ کمال پاشا نہیں تھا بلکہ اتاترک تھا اور جماعت احرار کا سردار۔ آخر کار "لوزان کانفرنس" کا اعلان ہوا۔ جس میں مرد آہن کو طلب کیا گیا۔ برطانیہ کی قیادت ہندوستان کے پرانے بدنام گورنر جنرل لارڈ کرزن بحیثیت وزیر خارجہ برطانیہ کر رہا تھا اور "مرد آہن" کی قیادت جنگ سقاریہ کا ہیرو۔ عصمت باعظمت اتاترک کا دست راست کر رہا تھا۔ عصمت باعظمت نے کانفرنس میں لارڈ کرزن کو زیر کر کے "معاہدہ سیورے" کو دفن کیا اور نئے معاہدے نے جنم لیا۔ اس طرح مرد بیمار نے مرد آہن بنکر دنیا پر اپنے جبروت، اپنی طاقت، اپنی سیاست اور اپنی کیاست کا سکہ بٹھا دیا۔ برسوں کے ترکی جنگی قیدی جو مختلف ملکوں کے کیمپوں میں تھے رہا ہوئے اور اپنے ملک میں آ کر کاموں میں مصروف ہو گئے۔ خلیفہ وحید الدین انگریزوں کی سرپرستی میں قسطنطنیہ سے چلے گئے۔ کچھ دنوں کے لئے سلطان عبد المجید خلافت کی مسند پر رہے۔ لیکن ترکی قومی پارلیمنٹ نے ان کو بھی معزول کر دیا اور وہ یورپ چلے گئے اور وہیں ان کا انتقال ہو گیا۔ ۱۹۴۸ء میں ان کا جسد خاکی ان کی بیٹی شہزادی درشہوار نے اپنے خسر نظام میر عثمان علی خاں کی منظوری اور اجازت سے خلد آباد (اورنگ آباد۔ دکن) میں لا کر دفن کیا۔ جہاں مقبرہ بہت پہلے تیار ہو چکا تھا۔ غرضکہ اب وہاں نہ خلافت رہی نہ خلیفہ رہا بلکہ وہاں جمہوریت تھی جس کے صدر کمال اتاترک اور وزیر اعظم عصمت انونو تھے۔ حکومت کا مستقر ایشیاء کوچک کا قدیم مشہور شہر انقرہ قرار پایا اور قسطنطنیہ یا استنبول ایک صوبہ کا مستقر ہو گیا جس کے پہلے گورنر عدنان بے ہوئے۔ احرار نے کس طرح قسطنطنیہ کو فتح کیا ایک معمہ ہی رہا۔ اس راز کو سلطنت خدا داد افغانستان کے پہلے قونصل جنرل حیدر خاں نے مجمل طور

پر ظاہر فرمایا تھا۔

بہر حال لیگ آف نیشن (انجمن برائے تقسیم قبور) اب بے جان ہو چکی تھی جس نے اسٹ سے ۱۱ سال زندگی گذار دی کیونکہ قبروں کے "مردوں" نے اپنی دوبارہ زندگی کا ثبوت پیش کر ہوئے حامیتوں کا خواب وخور حرام کر دیا تھا۔ یہ تھا پہلی عالمی جنگ کا اثر جو دنیا کے نقشہ میں نقت اور منافقانہ "حمایت یا حفاظت" کی شکل میں نمودار ہوا تھا۔ اس کو آزادی کی لہر نے تہس نہس کر کے مردہ قوموں کو نشاۃ ثانیہ سے نوازا۔

نشاۃ ثانیہ کا یہ ہیجان جاری ہی تھا کہ آخر سال ۱۹۳۲ء میں جرمن قوم کا ایک معمولی فرد سور بن کر اٹھا جس کو قوم نے فیوہلر کا لقب دیکر اس کا خیر مقدم کیا۔ اور جس نے ڈکٹیٹر کا چولا اختیار کر کے سب سے پہلے جمہوریت کو برخاست کیا اس کے بعد قومی سکہ "مارک" کو سونے کے سکے میں بدل دہ جس کی قیمت جمہوریت کے عہد میں بجائے ۱۲ مارک فی پاونڈ کے کم وبیش ۱۰ لاکھ فی پاؤنڈ ہو گئی تھی اور جس کی وجہ سے ملک کی معاشیات تہ وبالا تھیں۔

غرضکہ اس مطلق العنان آمر یا ڈکٹیٹر نے "نازی" جماعت بنا کر ہر فرد قوم کو نازی بنا دیا فوجی وردی پہنا دی اور اپنے ارادۂ فتح عالم کو پورا کرنے کے لئے دنیا کو زیر وزبر کرنا شروع کر دیا۔ ابھی اس نے قدم اٹھایا ہی تھا کہ برطانیہ کے صلح جو وزیر اعظم مسٹر چمبرلین نے بھر کوشش کی کہ نازی آگ کے شعلے بھڑکنے نہ پائیں لیکن کامیابی نہ ہوئی اور یہ شعلے اپنا کام کرنے لگے۔ آخر کار مسٹر چمبرلین نے کرسی وزارت چھوڑ دی اور مسٹر چرچل نے وہ کرسی سنبھالی جن نہ صرف یہ پختہ عقیدہ تھا کہ انگریزوں اور اتحادیوں کی فتح ضرور ہوگی بلکہ ان کا فتح کے بعد یہ اعلان تھا کہ

"برطانیہ اپنی شہنشاہیت سے دستبردار نہیں ہو سکتا ہے"

یہ ہندوستان کی غلامی کی طرف اشارہ تھا جس کو وہ برطانیہ کی دائمی جاگیر سمجھ رہا تھا۔ بہر حال ۵ یعنی ۵ برس تک نازی آگ نے وہ آفت مچائی کہ بقول ایک قدیم شاعر کے:

قیامت مچانے لگا کرتا نے　　　فلک یہ پکارا کہ خالق بچائے

غرضکہ پانچ برس اس آگ نے وہ کیا کہ پچھلی جنگی بربریتیں سب ماند پڑ گئیں۔ اس وقت کی دنیا میں لوگوں کی زبانوں پر دو ہی نام ہٹلر اور اس کے کاسہ لیس مسولونی ہی کے تھے جن کی حرکات مذبوحی اور فاتحانہ حرصوں نے مخلوق کی زندگی دوبھر کردی تھی اور وہ قیامت مچائی جس کے خیال سے رونگٹے کانپتے ہیں۔ بہرحال خالق نے مخلوق کی یا بقول شاعر فلک کی پکار سن لی۔ اور ان دونوں درندوں کو ختم کیا، ہٹلر نے خودسوزی سے خودکشی کرلی اور مسولونی مارا گیا اور اس طرح اس خونی ڈرامہ یا دور کا خاتمہ ہوا۔ اتحادیوں نے اطمینان کا سانس لیا اور اپنی فتح کے شادیانے بجائے اور جشن منائے۔ لیکن اب فتح کے نشہ نے جنم لیا۔ جس نشہ میں اب انہوں نے ملکوں کی تقسیم کا بیڑا دوسری شکل میں اٹھایا۔ لیگ آف نیشن دفن ہو چکی تھی۔ لہٰذا امریکہ کے مشورے سے ایک دوسری تنظیم کی بنیاد ڈالی گئی جس کا نام یو۔ این۔ او (انجمن اقوام متحدہ) رکھا گیا اور بجائے لندن کے امریکہ کا سب سے بڑا شہر نیویارک اس کا صدر مقام قرار پایا۔ اس یو۔ این۔ او کے دو حصے کئے گئے۔ ایک کا نام جنرل اسمبلی (عام مجلس) اور دوسرے حصے کا نام سیکورٹی کونسل [مجلس صیانت (تحفظ)] رکھا گیا۔ یہ گویا کہ جنرل اسمبلی کی مجلس عاملہ تھی اور ہے۔ جس کے ۵ ممبر اس طرح سے قرار پائے کہ پانچ بڑے ممبر (برطانیہ، روس، فرانس، امریکہ اور چین) مستقل اور دائمی ممبر قرار پائے باقی دوسرے ممبر خود مختار اور آزاد ممالک کے نمائندے ہوتے ہیں اور جنرل اسمبلی کے ممبران کو سیکورٹی کونسل کیا بلکہ ۵ مستقل ممبر اس شرط اور قید کے ساتھ منتخب کرتے ہیں کہ پانچوں ممبر متفق ہوں۔ انجمن کے آئین میں یہ نئے قسم کی دفعہ رکھی گئی ہے کہ مستقل ۵ ممبروں میں سے ایک ممبر کو حق تنسیخ (ویٹو) دیا گیا ہے۔ مجلس کی اکثریت خواہ کچھ کہے وہ بے اثر ہے گویا ایک ممبر مستقل ڈکٹیٹری کرتا ہے۔ اس دوسری عالمی جنگ کا بعض اعتبار سے نتیجہ اچھا نکلا۔ یعنی جو ایشیا اور افریقہ کے ملک فرنگی حکومتوں کے پنجہ میں رہ کر مظالم کے شکار تھے وہ اپنی جدوجہد سے

آزاد ہوگئے اور اس طرح سے نوآبادیاتی نظام کا آخر کار جنازہ نکل گیا اور فرنگیوں کی چودھراہٹ ختم ہوگئی۔

لیکن امریکہ اور برطانیہ کی سازش نے عربوں بلکہ جملہ مسلمانوں کی مقدس سرزمین پر ایک دوسرا کھیل کھیلا اور اس سرزمین پر "بلفور" کا اعلان کردہ "یہودی وطن" اس طرح سے بنا دیا کہ امریکہ کے سرمایہ دار یہودیوں کو وہاں لاکر بسا دیا گیا اور ان کی حکومت وہاں قائم کردی گئی جس کا نام حکومت اسرائیل" ہے۔ عربوں کو بے خانماں کیا گیا جو اب تک لاکھوں کی تعداد میں مختلف عرب ممالک میں پناہ گزینی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ۱۹۴۸ء میں جب یہ ناجائز حکومت سرزمین مقدس پر قائم کی گئی جس کے وہ کسی حالت میں حقدار نہیں تھے اور اس وقت عرب ممالک نے متحدہ محاذ قائم کرکے ان غاصبین کا مقابلہ کرنا شروع کر دیا تھا جن کی پشت پناہی ہر طرح سے امریکہ کر رہا تھا۔ میں اس زمانے میں مصر میں موجود تھا۔ جو گویا متحدہ محاذ کا مرکز تھا۔ میں نے ناکامیاب جنگ کی وہاں رہ کر کچھ جھلکیاں دیکھی ہیں۔ عوام کا جوش وخروش بھی دیکھا اور مقتدر لوگوں سے کچھ بات چیت بھی ہوئی۔ بہرحال شاہ فاروق معزول ومرحوم کی عیاشانہ اور خودغرضانہ زندگی نے اس کو یکسر ناکام بنا دیا۔ اسرائیل کے قدم جم گئے بلکہ امریکی کھلم کھلا مالی اور جنگی مدد سے اسرائیل کے نہ صرف حوصلے بڑھے بلکہ اس کی توسیعی اسکیمیں بھی کامیاب ہوئیں اور ہورہی ہیں۔ حتیٰ کہ بیت المقدس بھی اب اسی کے زیرنگیں ہے۔ اَللّٰھُمَّ شَتِّتْ شَمْلَھُمْ۔ آمین۔

اس دوسری عالمی جنگ نے دنیا کا نقشہ ہی بدل دیا۔ یورپ کے نقشہ پر تقسیم کے طفیل نئی حکومتیں نمودار ہوگئیں مثلاً دو جرمنی ہوگئے۔ سرویا اور مانٹی نگرو صفحۂ ہستی سے مٹ گئے۔ یوگوسلاویہ اور زیکوسلواکیہ پیدا ہوگئے۔ دو آسٹریا ہوگئے۔ ایک ہنگری اور ایک آسٹریا۔ امریکہ سے کیوبا الگ ہوکر آزاد ہوگیا۔ ایشیا میں دو کوریا (جنوبی اور شمالی) ہوگئے۔ دو ویٹ نام

(شمالی اور جنوبی) ہو گئے۔ دو چین ہو گئے۔ ایک زیر سرپرستی امریکہ چیانگ کائی شیک کا چین بنام (فارموسا جزیرہ) دوسرا کمیونسٹ چین جس کے سربراہ ماؤزے تنگ۔ صدر اور وزیر اعظم چاؤ این لائی ہیں۔ دو ہندوستان ہوئے ایک پاکستان بنا (جس کے دو حصے ہوئے یعنی ایک مغربی پاکستان اور دوسرا مشرقی پاکستان) اور دوسرا متحدہ جمہوریہ ہندوستان۔ دو کشمیر ہو گئے (اسی سلسلہ میں دو پنجاب مشرقی اور مغربی ہوئے اور دو بنگال مغربی اور مشرقی ہوئے) بہرحال اس دوسری عالمی جنگ نے "دو" کا ہندسہ اس قدر دہرایا کہ ہر چھوٹے بڑے ملک اس کے شکار ہوئے اور خدا جانے یہ "دور دوئی" کب تک جاری رہے گا۔ اس کو مستقبل ہی بتائے گا۔

بنگلہ دیش کی آزاد حکومت

۱۹۷۰ء میں جنرل یحییٰ خاں۔ چھٹے سربراہ اور تیسرے فوجی ڈکٹیٹر اور خود ساختہ صدر بے آئین مملکت پاکستان کے کرم ناظلم نے۔ بقول کسے

خدا شرے برانگیزد کہ خیرے ما دراں باشد

ایک ہزار میل دور ملک کی راجدھانی سے مشرقی پاکستان کو "بنگلہ دیش" بنا کر دنیا میں دوسری سب سے بڑی مسلمانی یا اسلامی آزاد حکومت کی وہ بنیاد ڈالی جس کی پیشین گوئی بقول ایک نامہ نگار کے آج سے ۲۴ سال قبل لارڈ ماونٹ بیٹن نے اپنی گورنر جنرل کے زمانہ میں مسٹر جناح سے گفتگو کرتے ہوئے اور تقسیم ملک سے باز رہنے کا مشورہ دیتے ہوئے اس طرح سے کی تھی:

> مشرق و مغرب کے یہ دو پاکستانی خطے جو ایک دوسرے سے
> ایک ہزار میل دور ہیں اور جس کے لئے کوئی زمینی راستہ نہیں
> ہے ۲۵ سال بھی نہیں رہ سکتے ہیں۔

اس راوی کا یہ بیان صحیح ہو یا نہ ہو لیکن حقیقت یونہی تھی۔ جس کو نادر شاہی جنرل نے برطانوی شاہی جنرل کے قول کو پورا کر کے دکھایا اور اپنے لامثال "ظلم و ستم" سے مشرقی حصہ پاکستان کو بنگلہ دیش کی شکل دیدی جو اپنی آزادی اور خود مختاری کو دنیا سے منوا رہا ہے۔ چنانچہ اب تک تقریباً

۹۹ ملکوں نے اس کی آزادی کو تسلیم کرلیا ہے جن میں بڑے ملک ہندوستان، روس، برطانیہ
فرانس اور امریکہ شامل ہیں۔ البتہ بنگلہ دیش کو مولانا بھاشانی کے محبوب چین نے اس لئے
تسلیم کرنے سے انکار کردیا یا کم ازکم سردست گریز کیا کہ اس کو سیکورٹی کونسل (مجلس تحفظ)
میں جس کا وہ نیا نیا ممبر ہوا ہے اپنے اختیار ویٹو (حق تنسیخ) کا تجربہ یا مظاہرہ کرنا تھا۔

بنگلہ دیش اور چین کا ویٹو (حق تنسیخ)

اگست ۱۹۷۲ء میں جب بنگلہ دیش کی طرف سے یو۔این۔
او میں ممبری کے لئے درخواست پیش کی گئی تو چونکہ آئین کے
اعتبار سے سیکورٹی کونسل کی منظوری ضروری تھی لہذا بعد بحث و تمحیص اس کو اس میں بھیجدیا گیا
اس کے سب ممبر کم وبیش وہی تھے (سوائے چین کے) جو اس کی خود مختاری کو تسلیم کرچکے تھے لیکن
اس منظوری کا دارومدار صرف پانچ بڑے ممبروں کی متفقہ مرضی پر تھا باقی ماندہ ممبر تو صرف
کہنے کے لئے ہیں۔ آئین کی یہ کتنی بڑی ستم ظریفی ہے کہ ایک مستقل ممبر اگر "نہیں" کہدے تو سب
مستقل ممبر "نہیں" کے ہی پابند ہونے پر مجبور رہوتے ہیں۔ امریکہ مستقل ممبر کی حیثیت سے محض
اپنے پٹھو چیانگ کائی شیک کی ہمدردی میں ۲۱ سال تک کمیونسٹ چین کے خلاف یہی
تنسیخی کھیل کھیلتا رہا۔ ۲۱ سال کے بعد جب سمجھوتہ ہوگیا تو چیانگ کائی شیک بیک بینی
و دوگوش اس اہم خدمت سے بیدخل کئے گئے اور کمیونسٹ چین کو یہ عزت بخشی گئی جس
نے پہلی ہی نشست میں بنگلہ دیش کے خلاف حق تنسیخ استعمال کرکے (امریکہ وار اختیار)
کی آزمائش کی۔ جو پوچ اور لاطائل دلیلیں چینی ممبر نے اپنے حق تنسیخ کی پشت پناہی اور
ثبوت میں پیش کیں ان کا خلاصہ یہ ہے:

> "اب تک ہندوستانی فوجیں بنگلہ دیش میں موجود ہیں اور
> پاکستانی جنگی قیدی اب تک رہا نہیں کئے گئے وغیرہ وغیرہ"

جن تقریباً ۹۹ ملکوں نے بنگلہ دیش کی آزادی کو تسلیم کیا ہے وہ اس قدر بے بصارت اور
بے بصیرت تھے کہ ان باتوں کو سمجھے بغیر جو چین کے ہی سمجھ میں آئیں اس کی آزادی کو تسلیم

کر لیا۔ دنیا اس کو اچھی طرح سے جانتی ہے کہ اُس وقت ہندوستان کی فوجیں واپس آچکی تھیں کوئی سپاہی تو کیا کوئی فوجی ماہر بھی وہاں نہیں تھا۔ آج دنیا ہندوستان کی وزیراعظم مسز اندرا گاندھی کے اس طریق کار اور دانشمندانہ وجراُتمندانہ اقدام پر انگشت بدنداں ہے جو انھوں نے تاریخ مقررہ سے قبل ہی اپنی امدادی فوج کو بنگلہ دیش سے واپس بلالیا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ جنرل یحییٰ خاں کے ہندوستان پر بے وجہ حملہ کا یہ لاثانی جواب دیا کہ یکطرفہ جنگ بندی کا اعلان کر دیا۔ یہ وہ اعمال ہیں جو ہندوستان کے مخلصانہ رویہ کے آئینہ دار ہیں اور دنیائے سیاست میں حیرت انگیز اور نئے قسم کے ہیں۔ اب رہا قیدیوں کی رہائی کا مسئلہ اس کے لئے چین کو بین الاقوامی قانون کا کم از کم مطالعہ کر لینا چاہئے تھا کیونکہ جنگی قیدی اس وقت تک رہا نہیں کئے جا سکتے جب تک کہ فریقین میں معاہدۂ امن نہ ہو جائے اور ہنگامی حالات ختم نہ ہو جائیں۔ بہر حال جہاں تک جنگی قیدیوں کی رہائی کا تعلق ہے وہ پاکستان اور ہندوستان کے مابین ہے چین کو اس میں مداخلت کا کوئی حق نہیں۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں نے ایک حد تک دوستانہ فضا قائم کر لی ہے اور دائمی مصالحت کی گفتگو جاری ہے جو اپنے وقت پر ہو جائے گی اور سب پیچیدگیاں ایک ایک کر کے دور ہو جائیں گی اور تینوں ہمسایہ ملک امن وچین کی زندگی گذارنے لگیں گے۔

چین کے اس بے جا عمل نے قانون داں طبقہ کو یو۔ این۔ او کے اس آئینی سقم کی طرف متوجہ کر دیا ہے جس میں آمرانہ پہلو نمایاں ہے جس کے ذریعہ سے سیکورٹی کونسل کے صرف پانچ مستقل ممبروں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ انفرادی طور پر کسی ملک کو منظور یا نامنظور کر دیں۔ اس لئے بعض قانونی ماہرین کی یہ رائے غلط نہیں ہے کہ یو۔ این۔ او کا آئین تبدیلی یا جزوی ترمیم کا مقتضی ہے تاکہ یہ آمرانہ طریق موقوف ہو اور صرف جنرل اسمبلی کو منظوری یا نامنظوری کا اختیار ہو بشرطیکہ ممبروں کی اکثریت اس کو منظور کرے ورنہ اس آمرانہ طریق سے نہ یو۔ این۔ او کا کچھ مفہوم رہتا ہے اور نہ جنرل اسمبلی کا۔

حال ہی میں جودھپور یونیورسٹی کے ایک پروفیسر نے چین کے اس حق تنسیخ پر تبصرہ کرتے ہوئے اسی آئین کی اس مخصوص دفعہ کا حوالہ دیتے ہوئے جس نے گویا حق تنسیخ کی تخلیق کی ہے ترمیم کا مشورہ دیا ہے کہ یو۔ این۔ او میں اصولِ اکثریت کار فرما ہو جس مقصد کیلئے اس کی تشکیل کی گئی ہے۔

بہرحال بنگلہ دیش اس معاندانہ عمل سے دل برداشتہ نہیں ہوسکتا ہے اور نہ اس کی آزادی پر یہ اثر انداز ہوسکتا ہے البتہ اس عمل سے اس کی خواہش ممبری کو ضرور دھکا لگا جس کا احساس دنیا کی سبھی حکومتوں کو ہے۔ اس کے تسلیم کرنے والے اسلامی ملک یمن، انڈونیشیا، ملیشیا اور عراق وغیرہم بھی ہیں۔ دوسرے اسلامی ملک بھی عنقریب اس کو تسلیم کرلیں گے۔

بہرحال بنگلہ دیش ایک حقیقت بن چکا اس سے انکار کرنے والا یا تو عناد سے کام لے رہا ہے یا حقیقت سے بربنا مصلحت چشم پوشی کرتا ہے یا پھر کسی ”اشارہ غیبی“ کا منتظر۔ ......

خنساء: حالات زندگی اور مرثیہ گوئی

از جنابہ زہرہ کفیل ۔ مسلم یونیورسٹی ۔ علی گڑھ

تاریخ کا مشہور واقعہ ہے کہ جاہلیت کی ممتاز ترین شاعرہ خنساء کی نفسیاتی حالت ایمان لانے کے بعد ایسی بدل گئی تھی کہ جنگ یرموک میں اپنے تمام لڑکے کٹوا دئے اور جب آخری لڑکا بھی شہید ہو چکا تو پکار اٹھی الحمد للہ الّذی اکرمنی بشہادتھم" محترمہ زہرہ کفیل نے اس مشہور شاعرہ کے حالات قدرے اختصار کے ساتھ قلم بند کئے ہیں جنھیں "برہان" میں شائع کیا جا رہا ہے ۔ "برہان"

قدیم عربی شاعری میں مرثیہ گوئی کو بلند مقام حاصل ہے ۔ مشہور بہادروں اور رؤساء کی موت پر ہمیشہ مرثیے کہے جاتے تھے ۔ جن میں مرنے والے کی اولوالعزمی، شجاعت، فراخ حوصلگی اور اصول پرستی کی تعریف کی جاتی تھی ۔ مرثیہ گوئی میں بعض عرب شاعرات نے بہت شہرت حاصل کی ہے ۔ اور ان میں خنساء کا نام سرفہرست آتا ہے ۔ عرب کی شاعر عورتوں میں اسلام سے قبل یا اسلام کے بعد کوئی ایسی شاعرہ نہیں گذری جو متانت شعر، نزاکت الفاظ اور حلاوتِ ترکیب میں خنساء سے بازی لے جائے ۔ مرثیہ گوئی میں وہ نہ صرف شاعرات بلکہ شاعروں میں بھی منفرد حیثیت رکھتی ہے ۔

ابتدائی حالات | اس کا اصل نام تماضر بنت عمرو بن الشرید تھا اور لقب خنساء ۔ اس کا والد بنو سلیم کے امراء میں سے تھا ۔ مورخین کا اندازہ ہے کہ اس کی پیدائش چھٹی صدی کے نصف آخر میں کسی وقت ہوئی ہوگی ۔ جس طرح اس کی تاریخ پیدائش کے متعلق کوئی یقینی بات کہنا مشکل ہے اسی طرح اس کی ابتدائی زندگی کے متعلق کچھ کہنا مشکل ہے ۔ تاریخ کی کتابوں میں اس کی زندگی کے حالات کی تفصیل اسی وقت سے ملتی ہے جب سے اس نے شاعری شروع کی اور دریدبن الصمہ

نے اسے شادی کا پیغام دیا۔ خنسار اپنے قبیلہ میں حسن وجمال کی وجہ سے مشہور، اپنے والدین کی اکلوتی لڑکی اور اپنے بھائیوں کی آنکھ کا تارا تھی۔ درید بن الصمۃ جو اپنے زمانہ کا مشہور شاعر، شہ سوار میدانِ جنگ کا سپر اور اپنے کارناموں کی وجہ سے مشہور تھا ایک دن بنوسلیم کے خیمہ گاہ کے پاس سے گذرا۔ خنسار اس وقت خیمہ سے باہر اپنے باپ کے ایک بیمار اونٹ کے زخموں پر مرہم لگارہی تھی۔ درید نے اسے دیکھا تو بے قرار ہوگیا۔ دوسرے دن وہ اس کے والد عمرو کے پاس آیا اور خنسار کیلئے نکاح کا پیغام دیا۔ عمرو نے اسے اعزاز واکرام کے ساتھ بٹھایا اور کہا کہ آپ کی شرافت اور نجابت میں کوئی شبہ نہیں لیکن خنسار بڑی آزادی پسند لڑکی ہے اس لئے اس کی رائے دریافت کرنی ضروری ہے۔ خنسار نے درید کا پیغام سن کر اپنے باپ کو جواب دیا کہ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں اپنے رشتہ داروں کو چھوڑ کر بنوجشم کے ایک بوڑھے سے شادی کروں گی جو عنقریب قبر میں جانے والا ہے۔ درید یہ سن کر واپس چلا گیا اور ایک نظم میں اس نے خنسار کی بدمذاقی کا تذکرہ کیا۔ جب لوگوں نے خنسار کو اس کا جواب لکھنے کی ترغیب دی تو اس نے کہا کہ میں نے درید کو ٹھکرادیا یہی کافی ہے۔ میں اس کی ہجو نہیں لکھوں گی۔

ازدواجی زندگی درید کو ٹھکرانے کے بعد خنسار نے اپنے چچازاد بھائی رواحہ سے شادی کی۔ معاشی بدحالی، خانگی جھگڑوں اور رواحہ کی فضول خرچیوں کی وجہ سے دونوں میں ناچاقی ہوکر نوبت طلاق تک پہنچ گئی۔ رواحہ کے بعد خنسار کی دوسری شادی اپنے ہی قبیلہ کے ایک اور نوجوان مرداس بن عامر سے ہوئی۔ خنسار نے اپنے دوسرے شوہر کے ساتھ ایک طویل عرصہ گذارا۔ مرداس سے خنسار کے تین لڑکے: معاویہ، یزید اور عمر، ایک لڑکی عمرہ پیدا ہوئی۔ مرداس کی وفات کے بعد خنسار نے مرثیہ بھی لکھا۔

قبولِ اسلام ۸ھ میں خنسار ایک وفد کے ساتھ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اسلام قبول کرکے اس نے آپ سے بیعت کی۔ اس موقعہ پر اس نے کچھ اشعار بھی آپ کی خدمت میں پیش کیے۔ آپ نے ان کو پسند فرمایا اور یہ کہا کہ اے خنسار اور سناؤ۔ اس کی وفات کے متعلق زیادہ

تفصیلات نہیں ملتی ہیں۔ اتنا تو ثابت ہے کہ وہ جنگ قادسیہ میں شریک ہوئی اور اس نے وہاں اپنے تینوں لڑکوں کو جنگ میں جوش و خروش کے ساتھ حصہ لینے کی ترغیب دی۔ یکے بعد دیگرے تینوں لڑکے رجز پڑھتے ہوئے میدان جنگ میں آئے۔ بے جگری سے مقابلہ کرنے کے بعد جام شہادت نوش کیا۔ جب ان کی شہادت کی خبر خنساء نے سنی تو صرف اتنا اس کی زبان سے نکلا "خدا کا شکر ہے کہ جس نے مجھے ان کی شہادت سے عزت بخشی اور میں امید کرتی ہوں کہ وہ جلد مجھے ان سے جنت میں ملائے گا۔"

وفات حضرت عمرؓ نے خنساء کے لئے بیت المال سے روزینہ مقرر کر دیا تھا۔ حضرت عمرؓ کے بعد حضرت عثمانؓ کا دور خلافت آیا تو حضرت عثمانؓ نے بھی اس کے وظیفہ کو برقرار رکھا۔ خنساء کی عمر اب کافی ہو چکی تھی، بینائی کمزور ہو گئی تھی اور اپنے دونوں بھائی معاویہ اور صخر کے غم میں وہ گھل گئی تھی اسی حالت میں اس نے ۲۴ھ میں بادیہ میں وفات پائی۔ یہ پتہ نہیں چلتا ہے کہ وفات کے وقت اس کے پاس کون کون لوگ تھے اور کن لوگوں نے اس کی تجہیز و تکفین کی۔ البتہ یہ بات یقینی ہے کہ خنساء جس نے ساری عمر مرثیہ گوئی میں گزاری، اس کی موت کے بعد کسی نے اس کیلئے مرثیہ نہیں لکھا

خنساء کی شخصیت خنساء کی شخصیت کا سب سے اہم عنصر اس کی شجاعت ہے۔ درید بن الصمہ کے پیغام پر اس کے باپ کا یہ کہنا کہ خنساء آزاد اور خود مختار ہے اس کی شجاعت پر دلالت کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے درید جیسے شہ سوار، رزم و بزم کے ہیرو اور مشہور سردار کو ٹھکرا دیا۔ وہ عرب کے میلوں ٹھیلوں میں شریک ہوتی تھی اور بے جگری کے ساتھ اپنے باپ، بھائی اور قبیلہ والوں کے کارناموں پر فخریہ اشعار پڑھتی تھی۔

زمانہ جاہلیت میں قبائلی تعصب کا بہت چرچا تھا اور اہل عرب کی یہ خاص عادت تھی کہ وہ اپنے قبیلہ اور ان کے حلیفوں کے کارناموں کو خوب بڑھا چڑھا کر پیش کرتے تھے۔ خنساء بھی اس تعصب کا شکار تھی۔ اسی وجہ سے اس نے بنو جشم کے سردار درید کے پیغام کو ٹھکرا دیا اور اپنے قبیلہ کے کسی نوجوان سے شادی کرنے کو ترجیح دی۔ اسے اپنے خاندان سے اس قدر محبت تھی کہ جب اس کا بھائی معاویہ میدان جنگ میں مارا گیا تو وہ اس کے فراق میں زندگی بھر روتی رہی۔ صخر کی موت نے تو اس کی کمر ہی توڑ دی اور اس کا غم دگنا اور چوگنا ہو گیا۔ اس نے اپنے فخریہ

باپ اور قبیلے کے دوسرے افراد کا مرثیہ لکھا جس میں ان سبھوں کی فیاضی اور شجاعت پر بھرپور داد دیتی ہے۔

خنساء کی شاعری پر جاہلیت کا اثر خنساء کی عمر کا بیشتر حصہ زمانۂ جاہلیت میں گذرا۔ دورِ جاہلیت کے تمام اوصاف اور خصائص اس کی زندگی کا جزو بن چکے تھے۔ چنانچہ اسلام لانے کے بعد بھی اسلامی اثرات اس پر پوری طرح غالب نہیں آسکے۔ اس کا لباس اور رہن سہن جاہلی طرز پر تھا۔ اس سلسلے میں متعدد واقعات نقل کئے جاتے ہیں:

ابن اعرابی کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ خنساء کسی ضرورت سے مدینہ آئی۔ لوگ حضرت عمرؓ کے پاس آئے اور عرض کیا کہ اے امیر المومنین خنساء جاہلیت کے لباس میں مدینہ آئی ہے۔ کیا ہی بہتر ہوتا کہ آپ اسے نصیحت کریں۔ حضرت عمرؓ خنساء کے پاس آئے اور اس سے پوچھا کہ اے خنساء کس چیز نے تمھاری آنکھوں کو زخمی کر دیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ سادات مضر پر گریہ وزاری نے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ وہ لوگ تو زمانۂ جاہلیت میں ہلاک ہوئے ہیں اور سب جہنم کے ایندھن ہیں۔ خنساء نے جواب دیا کہ اسی بات کا تو مجھے بھی غم ہے۔ کاش وہ اسلام پر مرتے۔ پھر حضرت عمرؓ کی فرمائش پر اس نے کچھ اشعار سنائے جنھیں سن کر خلیفہ موصوفؓ نے لوگوں سے فرمایا کہ اسے اپنی حالت پر چھوڑ دو وہ ہمیشہ روتی رہے گی۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ حضورؐ کے انتقال کے بعد خنساء ایک مرتبہ حضرت عائشہ کے پاس زمانۂ جاہلیت کا لباس جس کو "صدار" کہتے ہیں پہن کر آئی۔ حضرت عائشہ نے اس کو صدار پہنے ہوئے اور سر منڈائے ہوئے دیکھ کر فرمایا کہ اے خنساء صدار پہننے کی تو اسلام میں ممانعت آئی ہے پھر بھی تم اسے پہنے ہوئے ہو۔ اس نے جواب دیا کہ اے ام المومنین مجھے اس کا علم نہیں تھا لیکن حضرت عائشہ کی اس ملامت کے بعد بھی وہ صدار پہنا کرتی تھی۔

اس سلسلہ میں ایک واقعہ یوں نقل کیا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ بیت الحرام میں خنساء کو دیکھا جو صدار پہنے ہوئے اور سر منڈائے ہوئے طواف کر رہی ہے۔ طواف ہی کے دوران اپنے منہ پر تھپیڑ بھی مارتی جا رہی ہے اور اپنی اوڑھنی میں اس نے اپنے مقتول بھائی صخر کا ایک جوتا لٹکا رکھا ہے حضرت عمرؓ نے اس کو نصیحت کی تو اس نے جواب دیا کہ مجھ پر ایسی مصیبت پڑی ہے کہ اہل عرب میں سے کسی

پر ایسی مصیبت نہیں آئی حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اور بھی ایسے لوگ گذرے ہیں جن پر تم سے بڑی افتاد پڑی ہے لیکن اسلام سے ماقبل کی تمام چیزوں کو منسوخ کر دیا ہے اور اب ایسا کرنا درست نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ کی اس نصیحت کے بعد خنساء نے اپنے بال بڑھا لئے، صدار پہننا ترک کر دیا اور سر ڈھانپنے لگی۔ چنانچہ اپنے ایک شعر میں وہ کہتی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ "میں نے صبر کو سب سے بہترین چیز پائی ہے۔ جوتے اور منڈے ہوئے سر اور صدار کی بہ نسبت۔"

مرثیہ گوئی

یہ بات مسلم ہے کہ مردوں کی بہ نسبت عورتیں زیادہ ذکی الحس اور جلدی اثر قبول کرنے والی ہوتی ہیں۔ غم کے موقعہ پر عورتیں مردوں کی بہ نسبت زیادہ غمزدہ اور خوشی کے موقع پر زیادہ خوش نظر آتی ہیں۔ بدوی زندگی میں مردانگی کے جواہر میں عمدہ کارنامے، میدان جنگ میں صلاحیتوں کا مظاہرہ رزم اور بزم میں مہارت اور شجاعت و فیاضی کا شمار ہوتا تھا۔ مرد گھر کے داخلی اور خارجی معاملات میں خود مختار ہوتا تھا۔ جب بھی کسی قبیلہ میں مندرجہ بالا صفات کا حامل شخص قتل کر دیا جاتا یا مر جاتا تو اس سے مردوں کی بہ نسبت عورتوں کو زیادہ صدمہ پہنچتا تھا اس موقعہ پر وہ دل کھول کر نوحہ کرتی تھیں کیونکہ مرد ان کی عصمت و عفت کا محافظ ہوتا تھا۔ دور جاہلی میں رونا دھونا مردوں کی شان کے بالکل خلاف سمجھا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ جنگ و جدل، خوں ریزی اور انتقام سے مردوں کو اتنی فرصت نہیں ملتی تھی کہ وہ مرنے والوں پر ماتم کریں اس لئے یہ کام عورتوں کے لئے بالکل خاص ہو کر رہ گیا تھا۔ عربوں کے یہاں شاعر کا تصور نہایت اونچا تھا۔ وہ اسے مافوق الفطرت طاقتوں سے متصف سمجھتے تھے۔ شاعر ان کے نزدیک وہی ہوتا تھا جو غیبی معلومات رکھتا ہو۔ بہادر اور ماہر جنگ ہو۔ علم، تجربہ، فکر اور دانش میں اپنے قبیلہ والوں پر فائق ہو۔ اس کے کلام سے قبیلہ کے کارنامے شہرت دوام حاصل کر لیتے تھے۔ وہ اپنے کلام سے قبیلہ کی نیک نامی کو چار چاند لگا دیتا تھا۔ اسی طرح عورتیں اپنے مرثیوں کے ذریعہ ان جاں بازوں کی یاد کو تازہ رکھنے کا کام انجام دیتی تھیں جنھوں نے قبیلہ کی آن بان کی خاطر خود کو قربان کر دیا تھا۔ مرثیہ گوئی عورتوں کے ساتھ خاص ہو کر رہ گئی تھی۔ مصطفیٰ صادق الرافعی اپنی کتاب تاریخ آداب العرب میں لکھتے ہیں کہ "شاعر قبیلہ کے سیاسی حالات کا ترجمان تھا اور اپنے

اشعار کے ذریعہ قبیلہ کے کارناموں کو پھیلانے کا کام انجام دیتا تھا۔ شاعرہ قبیلہ کے غم واندوہ کی ترجمان ہوتی تھی اور گذرے ہوئے جاں بازوں کے کارناموں کو اپنے اشعار سے لوگوں میں پھیلاتی تھی اس طرح شعراء اور شاعرات کا الگ الگ فریضہ تھا۔"

معاویہ اور صخر کی موت سے قبل اور بعد میں خنساء کی شاعری خنساء نے بھی اپنے مرثیوں کے ذریعہ سے اپنے قبیلہ کی شان اور اس کے جاں بازوں کی آن کو برقرار رکھنے کا فریضہ انجام دیا۔ اس نے اپنے اشعار میں اپنے باپ، دونوں بھائیوں معاویہ اور صخر، اپنے شوہر مرداس اور قبیلہ کے دیگر شہسواروں کا مرثیہ لکھا۔ یوں تو بھائیوں سے بہنوں کو محبت ہوتی ہے لیکن خنساء نے جس انداز میں محبت کی وہ بالکل نرالا انداز تھا۔ اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں وہ دوسری عرب شاعرات کی طرح دو چار اشعار کہہ لیا کرتی تھی۔ چنانچہ مصطفیٰ صادق الرافعی لکھتے ہیں کہ "عرب عورتوں میں اصل شاعری مرثیہ گوئی ہی تھی۔ دیگر اصناف سخن میں ان کے بہت کم اشعار ملتے ہیں ان میں خنساء اور لیلیٰ اخیلیہ بہت مشہور ہیں۔ خنساء کا معاملہ یہ ہے کہ دیگر شاعرات کی طرح پہلے وہ شوقیہ طور پر دو چار اشعار کہہ لیا کرتی تھی۔ یہاں تک کہ اس کا باپ اور دونوں بھائی مارے گئے۔ خاص طور پر اپنے چھوٹے بھائی صخر کے مارے جانے کے بعد اس کے ضبط کا دھارا ٹوٹ گیا اور غم برداشت سے باہر ہوگیا۔ دن رات اپنے والد اور بھائیوں کے غم میں وہ آنسو بہایا کرتی تھی۔ غالباً اسی غم نے اسکو قبل از وقت بوڑھا بنا دیا تھا۔" اسی کو اپنے شعر میں وہ کچھ اس طرح کہتی ہے کہ "خدا کی قسم معاویہ اور صخر دونوں کس قدر جنگ آزما اور بہادر تھے۔ میدان جنگ، ضیافت مہمانان، جود وسخا اور ہر معاملات میں وہ پیش پیش رہتے تھے۔ ان کی موت نے مجھے قبل از وقت بوڑھا کر دیا ہے۔"

واقدی نے ایک روایت نقل کی ہے کہ جب بدر کی لڑائی ہوئی اور اس میں عتبہ، شیبہ اور ولید بن عتبہ مارے گئے تو ہند بنت عتبہ نے مرثیہ کہا۔ اسے یہ پتہ چلا کہ خنساء بھی اپنے باپ اور بھائیوں پر روتی ہے اور اپنے غم کو سب سے بڑی مصیبت بتاتی ہے۔ سوق عکاظ میں دونوں کی ملاقات ہوئی۔ ہند نے خنساء سے سوال کیا کہ مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ تم لوگوں سے یہ کہتی ہو

کہ عرب میں سب سے بڑی مصیبت تم پر آئی ہے کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ کس بنا پر تم یہ کہہ رہی ہو؟ خنساء نے جواب دیا کہ مجھے اپنے باپ اور بھائیوں کا صدمہ ہے۔ خنساء نے ہند سے پوچھا کہ تم اپنے صدمہ کو سب سے بڑا کس طرح کہتی ہو؟ ہند نے جواب دیا کہ مجھے اپنے باپ عتبہ، چچا شیبہ اور بھائی ولید کے مارے جانے کا غم ہے۔ اس کے بعد اس نے کچھ اشعار سنائے۔ پھر خنساء نے بھی اپنا ایک مرثیہ سنایا جس کا مفہوم کچھ اس طرح ہے کہ میں اپنے باپ عمرو پر کثرت سے آنسو بہاتی ہوں۔ زمانہ نے میرے خاندان، باپ اور بھائیوں کو ختم کر دیا۔ میں اس طرح روتی ہوں کہ آنسو خشک نہیں ہوتے ہیں۔"

اپنے ایک مرثیہ میں وہ صخر کا مرثیہ ان اشعار سے کہتی ہے

یؤرقنی التذکر حین أمسی فیردعنی مع الاحزان نکسی

یذکرنی طلوع الشمس صخراً واذکرہ لکل غروب شمس

فلولا کثرۃ الباکین حولی علی اخوانہم لقتلت نفسی

ترجمہ: مجھے یاد بیدار رکھتی ہے جب میں شام کرتی ہوں۔ غم کے ساتھ ابتلاء مرض مجھے کچوکے لگاتی ہے

سورج کا طلوع ہونا مجھے صخر کی یاد دلاتا ہے اور ہمیشہ غروب ہوتے ہی اس کو یاد کرتی ہوں۔

اگر میرے اردگرد اپنے بھائی بندوں پر رونے والوں کا مجمع نہ ہوتا تو خود کو مار ڈالتی۔

اس مرثیہ میں خنساء نے جس غم واندوہ کا اظہار کیا ہے اس کی مثال عربی شاعری میں بہت ہی کم ملتی ہے۔ پورے قصیدے کو پڑھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ خنساء کو اپنے بھائی سے شدید محبت تھی اور اس کے غم میں گھل کر اس نے جان دیدی۔ چنانچہ وہ کہتی ہے:

فلم اسمع بہ رزءًا لجن ولم ار مثلہ رزءًا لانس

فقد ودعت یوم فراق صخر ابی حسان لذاتی و انسی

ترجمہ: میں نے جناتوں کے لئے اتنی بڑی مصیبت نہیں سنی اور نہ ہی انسانوں کے لئے ایسی مصیبت دیکھی

میں نے صخر کے فراق کے دن سے تمام لذت ونعمت اور انسیت کو خیرباد کہدیا ہے۔

ایک دوسرے مرثیہ میں اپنے دونوں بھائیوں پر نوحہ خوانی کرتے ہوئے خدا سے دعا بھی مانگتی ہے۔

ساً بکیهما و الله ما حق و السن	و ما انبت الله الجبال الرواسیا

سقی الله ارضاً اصبحت قد حوتهما	من المتهلات السحاب الغوادیا

ترجمہ: قسم خدا کی میں اس وقت تک روتی رہوں گی جب تک شدت غم سے کوئی مصیبت زدہ روتا رہے اور خدا نے مضبوط پہاڑوں کو جب تک قائم رکھا ہے۔ خدا اس زمین کو موسلا دھار برسنے والے صبح کے بادل سے سیراب کرے۔

خنسار کی شاعری پر متقدمین کی رائے | خنسار کا شمار مخضرم شعراء میں ہوتا ہے۔ مخضرمین ان شعراء کو کہتے ہیں کہ جنھوں نے زمانہ جاہلیت کو بھی دیکھا اور اشاعت اسلام کے بعد اس سے بھی فیض یاب ہوئے جب سے خنسار کی شاعری کا چرچا ہوا اور وہ لوگوں میں مشہور ہوئی اسی وقت سے وہ علمائے ادب اور نقادوں کے لئے موضوع سخن بنی رہی۔ خنسار کے متعلق نابغہ ذبیانی نے جس رائے کا اظہار کیا ہے اس کی بڑی اہمیت ہے۔ ابن قتیبہ اپنی کتاب "الشعر والشعراء" میں لکھتے ہیں کہ خنسار نے ایک مرتبہ سوق عکاظ میں اپنا قصیدہ پیش کیا۔ نابغہ جو اس سال حکم کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ خنسار کے اشعار سننے کے بعد کہا "خدا کی قسم اعشیٰ اگر تم سے پہلے اپنا قصیدہ نہ سنا چکا ہوتا تو میں انسانوں اور جناتوں میں تمھیں بڑی شاعرہ مانتا۔"

جب خنسار نے آپؐ کے سامنے کچھ اشعار پیش کئے تو آپؐ نے پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ نبی کریمؐ افصح العرب والعجم تھے۔ لہٰذا آپؐ کی پسندیدگی کا اظہار اس پر دلالت کرتا ہے کہ واقعی خنسار عظیم شاعرہ تھی۔ طبقات صحابہ میں یہ واقعہ منقول ہے: عدی بن حاتم جب اپنے قبیلے والوں کے ساتھ گرفتار ہو کر آئے تو حضورؐ سے عرض کیا "یا رسول اللہؐ ہمارے قبیلے میں سب سے بڑے شاعر، سب سے بڑے سخی اور سب سے بڑے شہ سوار گذرے ہیں۔" آپ نے فرمایا کہ ان کے نام بتاؤ۔ عدی نے کہا کہ سب سے بڑا شاعر امرؤالقیس، سب سے بڑا سخی حاتم بن سعد اور سب سے بڑا شہ سوار عمرو بن معدی کرب ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ اے عدی حقیقت یہ نہیں جو تم نے کہا۔ سب سے بڑی شاعرہ خنسار، سب سے بڑے سخی محمدؐ اور سب سے بڑے شہ سوار علی ابن ابی طالب ہیں۔ ...
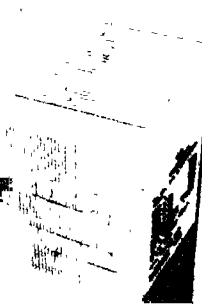
Registered No. D. 666 MAY 197

Phone : 262816

سالانہ قیمت دس روپے

فی پرچہ ایک روپیہ

حکیم مولوی محمد ظفر احمد پرنٹر و پبلشر نے انڈین پرنٹنگ پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر برہان سے شائع کیا

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتب
سعید احمد اکبر آبادی

مصباح اللغات

مکمل عربی اردو ڈکشنری

مرتبہ

ابوالفضل مولانا عبدالحفیظ بلیاوی

قیمت

اٹھائیس روپے

مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی

بُرہان

جلد ۷۰ | جمادی الاول ۱۳۹۳ھ مطابق جون ۱۹۷۳ء | شمارہ ۶

نظرات

تین مہینہ کے سفر کے بعد جب ۳ جون کو بحمد اللہ بہمہ وجوہ بخیریت وعافیت واپسی ہوئی تو جن احباب اور بزرگوں کے انتقال پرملال کی خبر سے سخت افسوس اور رنج ہوا ان میں مولانا عبدالصمد صاحب رحمانی بھی تھے۔ مولانا ان اکابر علم وفضل اور اصحاب ورع وتقویٰ میں سے تھے جن کے دم سے اسلام کی روحانی اور دینی واخلاقی عظمت کی آبرو قائم ہے، ان کی استعداد بڑی پختہ تھی مطالعہ وسیع، نظر دقیق اور فہم ثاقب رکھتے تھے، یوں تو سب ہی علوم دینیہ ومروجۂ مدارس عربیہ سے ان کو طبعی لگاؤ تھا، لیکن فقہ اور حدیث سے ان کو زیادہ دلچسپی اور مناسبت تھی۔ جب گفتگو کرتے تھے تو ان کی باتوں سے رسوخ فی العلم کے ساتھ، سنجیدگیٔ رائے، ذہانت اور توازن فکر کے جھلکے آتے تھے۔ عملاً بڑے قناعت پسند اور درویش صفت بزرگ تھے، ہر چیز میں سادگی اور بے تکلفی ملحوظ رکھتے تھے۔ صاحب درس اور صاحب تصنیف وتالیف بھی تھے، ملک کی تحریک آزادی کے ہراول دستے میں تھے، لیکن آزادی کے بعد ملک میں جو حالات پیش آئے اور جن کا سلسلہ اب بھی جاری ہے، انھوں نے بعض دوسرے مجاہدین وطن کی طرح ان کو اس درجہ دل شکستہ اور مایوس کر دیا تھا کہ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ گوشہ نشین ہو گئے تھے، چند برس سے مجموعۂ امراض واسقام تھے اور بہت کمزور ہو گئے تھے۔ آخر وقت موعود بھی آپہونچا۔ اللہ تعالیٰ مغفرت وبخشش اور رفع درجات کی نعمتوں سے سرفراز فرمائے۔ آمین۔

مفصل سفر نامہ تو انشاء اللہ تعالیٰ برہان میں شائع ہوگا ہی اور پھر اگر ہو سکا تو جنوبی افریقہ کے بعض دوستوں کی خواہش اور فرمائش کے مطابق اس کا انگریزی ترجمہ بھی کتاب کی صورت میں چھاپ

دیا جائے گا۔ لیکن اتنا تو اب بھی سن لیجئے کہ جنوبی افریقہ (ریپبلک) چار صوبوں پر مشتمل ہے (۱) ٹرانسوال جس کا سب سے بڑا شہر جہانسبرگ ہے (۲) نٹال: اس کا سب سے بڑا شہر ڈربن ہے (۳) کیپ ٹاؤن: اس کا سب سے بڑا شہر اسی نام سے ہے (۴) فری اسٹیٹ: موجودہ حکومت نے جو نیشنل پارٹی کی حکومت ہے اور جس نے ابھی گزشتہ ۲۵ مئی کو اپنی حکومت کی پچیس سالہ سلور جوبلی منائی تھی اس نے ملک کی پوری آبادی کو نسلی اعتبار سے مندرجۂ ذیل چار حصوں میں تقسیم کیا ہے: (۱) سفید فام (Whites) ان میں دو قسم کے لوگ شامل ہیں۔ ایک وہ جو خالص انگریز نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور دوسرے وہ فرانسیسی، ڈچ اور انگریز وغیرہ اقوام ہیں جو عرصۂ دراز سے یہاں آباد ہیں اور جن کی نسل باہمی رشتۂ ازدواج و مناکحت کے باعث مخلوط ہو گئی ہے۔ یہ لوگ افریکان (Afrikaan) کہلاتے ہیں اور ان کی زبان کا نام بھی یہی ہے۔ یہودی اور بعض عرب ممالک مثلاً شرق اردن اور لبنان کے عیسائی بھی انھیں میں شمار ہوتے ہیں۔

(۲) انڈین: یہ وہ لوگ ہیں جو نسلاً ہندوستانی ہیں اور جن کے آباد اجداد کم و بیش ایک سو برس پہلے وہاں مزدور کی حیثیت سے انگریزوں کی طرف سے لے جائے گئے تھے، یا خود جا کر آباد ہو گئے تھے، ان میں غالب اکثریت مسلمانوں کی ہے اور یہ زیادہ تر ہمارے صوبۂ گجرات، بمبئی اور آندھرا پردیش سے تعلق رکھتے ہیں۔ انڈین میں ہندو اور عیسائی بھی شامل ہیں اور یہ لوگ زیادہ تر تامل ناڈ یعنی مدراس وغیرہ کے لوگ ہیں، لیکن یہ اقلیت میں ہیں (۳) تیسرا گروپ رنگین (Coloured) کہلاتا ہے، ان میں جزائر شرق الہند، ملایا وغیرہ کے لوگ شامل ہیں جنھوں نے سفید فام یا دوسری قوموں کے ساتھ رشتۂ ازدواج و مناکحت قائم کیا اور اس لئے ان کی نسل بھی مخلوط ہو گئی ہے۔ یہ لوگ کم و بیش تین سو برس سے یہاں آباد ہیں۔ انگریزوں نے ان کے آباد و اجداد کو بھی کھیتوں اور فارموں پر کام کرنے کی غرض سے ان کو یہاں لا کر بسایا تھا۔ ان لوگوں میں مذہبی اعتبار سے ہندو بھی ہیں اور عیسائی اور مسلمان بھی، مگر اکثریت ان میں بھی مسلمانوں کی ہے۔ (۴) چوتھا گروپ ملک کے اصل باشندوں یعنی افریقیوں کا ہے جو بالکل سیاہ فام ہیں اور اپنی مخصوص شکل و صورت رکھتے ہیں۔ ملک میں نہایت عظیم آبادی انھیں لوگوں کی ہے، مگر سب سے زیادہ پسماندہ بھی یہی لوگ ہیں۔ ان کے مختلف قبائل ہیں، مثلاً بعض لوگ (Bantu) کہلاتے ہیں،

بعض زولو (یعنی عام حبشی) کہے جاتے ہیں۔ رنگ روپ اور شکل و صورت میں کوئی فرق نہیں لیکن ہر قبیلہ کی بولی الگ الگ ہے۔

حکومت نیشنل گورنمنٹ کہلاتی ہے اور پارلیمنٹری ہے، لیکن ووٹ دینے اور پارلیمنٹ کی ممبری کے لئے امیدوار ہونے کا حق صرف نمبر اول یعنی سفید فام لوگوں کو حاصل ہے، باقی تین گروپ کے لوگوں کو گورنمنٹ کی تشکیل و تعمیر میں کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ گورنمنٹ نے ملک کی پوری آبادی کو مذکورۂ بالا چار گروپ میں تقسیم کرکے فری اسٹیٹ کا علاقہ تو صرف سفید فام اقوام کے لئے مخصوص کردیا ہے، باقی تین گروپ کے لوگوں میں سے کوئی شخص وہاں جاکر نہ رہ سکتا ہے اور نہ کوئی بزنس کرسکتا ہے، یہاں تک کہ اگر اپنے کسی دوست وغیرہ سے ملنے یا اس کو دیکھنے کی غرض سے ہی کوئی شخص فری اسٹیٹ میں جانا چاہے تو اس کو پرمٹ حاصل کرنا ہوگا اور اس صورت میں بھی اس کو وہاں شب باشی کی اجازت نہیں ہوگی۔ اب رہے ملک کے باقی تین صوبے؛ ٹرانسوال، نٹال، اور کیپ ٹاؤن۔ تو ان میں سب گروپوں کے لوگ آباد ہیں لیکن اس طرح کہ ہر شہر، ہر ٹاؤن اور ہر مقام پر ہر گروپ کے لئے الگ الگ علاقے مقرر کردیے گئے ہیں، ایک گروپ کے لوگ بس اپنے مقرر کردہ علاقہ میں ہی رہ سکتے اور کاروبار کرسکتے ہیں۔ ایک گروپ کا آدمی دوسرے گروپ کے علاقہ میں نہ مکان بنا سکتا ہے اور نہ دکان۔ گروپنگ سسٹم کے اس قانون کو منظور ہوئے ابھی آٹھ برس ہوئے ہیں۔ دس برس کی مدت میں اس نئی علاقہ بندی کو مکمل ہوجانا ہے، اور یہ سب کچھ بڑی خاموشی، اطمینان اور سکون سے ہو رہا ہے۔ نئے علاقوں میں جو لوگ خود مکان نہیں بنا سکتے۔ ان کے لئے خود گورنمنٹ نے مکانات کثرت سے بنائے ہیں اور کرایہ کا طریقہ ایسا رکھا ہے کہ تیس برس کے بعد اگر مکان کی قیمت پہلے نہ ادا نہ کردی جائے کرایہ دار خود مکان کا مالک بن جاتا ہے۔

بہرحال ایک فری اسٹیٹ کو چھوڑ کر میں نے ملک کے باقی تینوں علاقوں کا مکمل دورہ کیا۔ اور الحمد للہ جہاں کہیں گیا، مسلمانوں نے تنظیم و تکریم اور راحت رسانی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ واپسی میں دو روز موریشیس میں بھی قیام رہا۔ وہاں کے احباب نے بھی جس طرح پذیرائی کی ہے۔ دل پر اب تک اس کا گہرا اثر ہے۔ میں اپنے ان سینکڑوں بلکہ ہزاروں دوستوں اور کرم فرماؤں کا صمیم قلب سے شکر گذار ہوں۔

فجزاھم اللہ عنی احسن الجزاء

مختلف مذاہب کے درمیان
سمجھوتہ کا اسلامی راستہ

از جناب مولانا محمد تقی امینی صاحب ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

آزاد ہندوستان میں "وحدتِ ادیان" کے نام سے مختلف مذہبوں کے درمیان سمجھوتہ کا ایک راستہ نکالا گیا ہے جس کے لحاظ سے تمام مذاہب اپنی موجودہ شکلوں کے ساتھ ایک اور صحیح قرار پاتے ہیں خواہ اُن کے درمیان کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو؟ یہ "سیاسی راستہ" ان مذاہب کے لئے "بیساکھی" کا کام دیتا ہے جو نہ اصلی شکل میں محفوظ ہیں اور نہ اُن کی تعلیم سماجی ضرورتوں کی کفیل ہے۔ لیکن اسلام جس کی حفاظت کا باقاعدہ انتظام ہے اور جس کی تعلیم بہمہ وجوہ سماجی ضرورتوں کی کفیل ہے وہ ہرگز اس راستہ کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے، اسلام بجائے خود ایک مستقل راستہ ہے جو دوسرے مذاہب کی حفاظت و بقار کا ضامن ہے اور جس پر عمل درآمد سے سمجھوتہ کا وہ نمونہ قائم ہوتا ہے کہ آج کی سیکولر و غیر سیکولر حکومتیں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے:

(۱) اعلان کیا کہ مذہب کے معاملہ میں کسی قسم کی زبردستی نہیں ہے۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ[۱] — دین میں زبردستی نہیں ہے۔

فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ[۲] — جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے۔

---

[۱] البقرہ ع ۳۵۔ [۲] الکہف ع ۴۔

(۲) ہر قابلِ ذکر مذہب کی "اصل" کو تسلیم کیا۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ[۱]

لوگ ایک امت (ایک دین پر) تھے۔ پھر اللہ نے یکے بعد دیگرے نبیوں کو بھیجا جو (نیک عمل کے نتائج کی) بشارت دینے والے اور (بد عملی کے نتائج سے) ڈرانے والے تھے اور ان کے ساتھ اللہ نے سچی کتاب اتاری تاکہ جن باتوں میں لوگ اختلاف کرنے لگے تھے ان میں فیصلہ کرنے والی ہو۔

وَإِنْ مِنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ[۲]

اور کوئی امت ایسی نہیں ہے جس میں کوئی ڈرانے والا (رسول) نہ گذرا ہو۔

إِنَّمَا أَنْتَ مُنْذِرٌ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ[۳]

اے پیغمبر آپ صرف ڈراتے ہیں اور ہر قوم کے لئے ایک ہدایت کرنے والا ہوا ہے۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَسُولٌ[۴]

ہر امت کے لئے رسول ہے۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَنْ لَمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ[۵]

ہم نے آپ سے پہلے بہت سے پیغمبر بھیجے ان میں سے کچھ ایسے ہیں جن کے حالات سنائے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جن کے حالات نہیں سنائے (ان کا ذکر قرآن حکیم میں نہیں ہے)

(۳) ہر مذہب کی بنیادی تعلیم میں وحدت تسلیم کی:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا أَنِ

بیشک ہم نے دنیا کی ہر قوم میں ایک پیغمبر بھیجا

---

[۱] البقرہ ع ۲۶ [۲] الفاطر ع ۳ [۳] الرعد ع ۱
[۴] یونس ع ۵ [۵] المومن ع ۸

اُعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ[۱]

(جس کی تعلیم کا خلاصہ یہ تھا) کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت (سرکش قوتوں) سے بچو۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ[۲]

اے پیغمبر ہم نے آپ سے پہلے کوئی رسول دنیا میں نہیں بھیجا مگر اس وحی کے ساتھ کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں۔ بس میری ہی عبادت کرو۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ[۳]

تمہارے لئے وہی دین مقرر کیا جس کی نوحؑ کو وصیت کی اور جس کی وحی ہم نے آپؐ کو بھیجی اور جس کی وصیت ہم نے ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو کی وہ یہ تھی کہ "الدین" کو قائم رکھو اور اس میں اختلاف نہ ڈالو۔

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ[۴]

اے پیغمبرؐ۔ اللہ نے آپ پر یہ سچی کتاب اتاری ہے جو کتابیں اس سے پہلے نازل ہو چکی ہیں ان کی یہ کتاب تصدیق کرتی ہے اور توریت و انجیل (بھی) اس سے پہلے لوگوں کی ہدایت کے لئے نازل کی ہے۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا

آپ کہدیجئے اے اہل کتاب تم ایک ایسی بات کی طرف آجاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ

---

[۱] النحل ع ۵۔
[۲] الانبیاء ع ۲۔
[۳] الشوریٰ ع ۲۔
[۴] آل عمران ع ۱۔

بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ [1]

کریں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ اللہ کو چھوڑ کر ہم آپس میں ایک دوسرے کو "رب" نہ بنائیں۔

(۲۸) بنیادی تعلیم پر زیادہ زور صرف کیا۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَ اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَ الصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ [2]۔

نیکی یہ نہیں ہے کہ (رسمی طور پر) تم نے اپنا منہ پورب اور پچھم کی طرف کر لیا بلکہ نیکی تو اس شخص کی ہے جو اللہ پر آخرت کے دن پر ملائکہ پر تمام کتابوں پر اور تمام نبیوں پر ایمان لاتا ہے۔ اپنا مال اللہ کی محبت میں رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور سائلوں کو دیتا ہے اور غلاموں کو آزاد کرانے میں خرچ کرتا ہے۔ نماز قائم کرتا، زکوٰۃ ادا کرتا، قول و قرار کا پکا ہوتا ہے تنگی اور مصیبت کی گھڑی ہو یا خوف و ہراس کا وقت ہر حال میں ثابت قدم رہتا ہے ایسے ہی لوگ (دینداری میں) سچے ہیں اور یہی برائیوں سے بچنے والے ہیں۔

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا [3]۔

ہر ایک کے لئے ایک جہت ہے جس کی طرف وہ اپنا منہ کر لیتا ہے نیکی کی راہ میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی کوشش کرو (اصل کام یہی ہے) تم کسی جگہ بھی ہو اللہ تم سب کو لائے گا۔

---

[1] البقرہ ع ۲۲

[2] البقرہ ع ۲۱

[3] البقرہ ع ۱۷

(۵) ہر مذہب کی انفرادیت برقرار رکھتے ہوئے مختلف شکلوں میں رواداری [illegible]

لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ وَادْعُ إِلَىٰ رَبِّكَ إِنَّكَ لَعَلَىٰ هُدًى مُسْتَقِيمٍ ۔ وَإِنْ جَادَلُوكَ فَقُلِ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُونَ اللَّهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ[۱]

ہر امت کے لئے ہم نے عبادت کا ایک خاص طریقہ مقرر کیا ہے جس پر وہ چلتی ہے اس معاملہ میں لوگ آپ سے جھگڑا نہ کریں آپ اپنے رب کی طرف دعوت دیتے رہئے آپ یقیناً ہدایت کے سیدھے راستہ پر ہیں اور اگر لوگ آپ سے جھگڑا کریں تو آپ کہہ دیجئے کہ اللہ بہتر جانتا ہے جو تم کرتے ہو جس میں تم اختلاف کرتے ہو قیامت کے دن اللہ اس کے بارے میں فیصلہ کرے گا۔

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَٰكِنْ لِيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ[۲] ۔

ہر ایک کے لئے ایک شریعت (دستور العمل) اور طریقہ (راہ عمل) مقرر کر دیا ہے اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک امت بنا دیتا لیکن یہ اختلاف اس لئے ہوا کہ اس نے جو تمہیں دیا ہے اس میں وہ تمہاری آزمائش کرے پس نیکی کی راہ میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش کرو۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ[۳]

تم ان کو برا بھلا نہ کہو جن کو وہ اللہ کے سوا پکارتے (پوجتے) ہیں ورنہ وہ بے سمجھے بوجھے حد سے تجاوز کر کے اللہ کو برا بھلا کہنے لگیں گے۔

---

۱ الحج ع ۹۔ ۲ المائدہ ع ۵۔

۳ الانعام ع ۱۳۔

ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِيعَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ[1]

پھر (انبیاء بنی اسرائیل کے بعد) اے محمد ہم نے آپ کو دین کے معاملہ میں ایک شریعت پر قائم کیا پس آپ اس کی پیروی کیجئے اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کیجئے جو علم نہیں رکھتے ہیں۔

یہ آیتیں سابقہ شریعتوں کی تصدیق کرتی اور ان کے بارے میں رواداری برتنے کا حکم دیتی ہیں یعنی ہر امت کو ایک شریعت (دستور العمل) دے چکے ہیں۔ آپ کو بھی ہم نے ایک شریعت دی ہے۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ اس وقت کون شریعت بنیادی تعلیم سے ہم آہنگ اور قابل عمل ہے دراصل اسی میں سب کی آزمائش اور اسی پر کامیابی کا انحصار ہے۔

ان آیتوں سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ سابقہ شریعتیں اصلی شکل میں موجود ہیں یا اب بھی حسب سابق وہ قابل عمل ہیں بلکہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ (رسول اللہؐ) راہ راست پر ہیں آپ اپنی شریعت کی اتباع کیجئے اور لوگوں کو بھی اس کی طرف دعوت دیجئے (سابقہ شریعتوں میں تبدیلی کا ذکر دوسری آیتوں میں ہے) اوپر دین اور شریعت کے دو لفظ آئے ہیں ان کی تشریح ضروری ہے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کہتے ہیں:

ان اصل الدین واحد اتفق علیه الانبیاء علیهم السلام وانما الاختلاف فی الشرائع والمناهج تفصیل ذلك انه اجمع الانبیاء علیهم السلام علی توحید الله تعالی عبادة واستعانة وتنزیهه عما لایلیق بجنابه وتحریم الالحاد فی اسمائه وان حق الله

اصل دین ایک ہے جس پر تمام انبیاءؑ متفق ہیں شرائع اور منہاج میں اختلاف ہے۔ اتفاق کی یہ باتیں ہیں عبادت و استعانت میں اللہ کو ایک سمجھنا۔ تمام ان چیزوں سے اس کی پاکی بیان کرنا جو اس کی شان کے مناسب نہیں ہیں۔ اس کے ناموں میں کج روی کو حرام سمجھنا۔ اللہ کا حق بندوں

لہ

علی عبادہ ان یعظموہ تعظیماً لا یشوبہ تفریط
وان یسلموا وجوھھم وقلوبھم الیہ
وان یتقربوا بشعائر اللہ الی اللہ وان اللہ
قدر جمیع الحوادث قبل ان یخلقھا وان
للہ ملائکۃ لا یعصونہ فیما امر ویفعلون
ما یؤمرون وانہ ینزل الکتاب علی من
یشاء من عبادہ ویفرض طاعتہ علی الناس
وان القیامۃ حق والبعث بعد الموت
حق والجنۃ حق والنار حق وکذالک
اجمعوا علی انواع البر من الطھارۃ
والصلوٰۃ والزکوٰۃ والصوم والحج و
التقرب الی اللہ بنوافل الطاعات من
الدعاء والذکر وتلاوۃ الکتاب المنزل
من اللہ وکذالک اجمعوا علی النکاح وتحریم
السفاح واقامۃ العدل بین الناس
وتحریم المظالم واقامۃ الحدود علی
اھل المعاصی والجھاد مع اعداء اللہ
والاجتھاد فی اشاعۃ امر اللہ ودینہ
فھذا اصل الدین ولذلک لم یبحث
القرآن العظیم لمیۃ ھذہ الاشیاء
الا ما شاء اللہ فانھا کانت مسلمۃ

پر یہ جانا کہ اس کی زیادہ سے زیادہ تعظیم کی جائے
چہرے اور دل اس کے سپرد کئے جائیں۔ اللہ کے
شعائر کے ذریعہ اس سے قربت حاصل کی جائے۔
یہ عقیدہ رکھا جائے کہ (الف) تمام حوادث سے پہلے
ان کے لئے اللہ کے علم میں ایک اندازہ مقرر ہے
(ب) اللہ کے فرشتے ہیں جو اس کی نافرمانی نہیں
کرتے ہیں (ج) اللہ اپنے بندوں میں جس پر
چاہتا ہے کتاب اتارتا ہے (د) اللہ اپنے بندوں
پر اپنی اطاعت فرض کرتا ہے (ہ) قیامت، مرنے
کے بعد کی زندگی۔ جنت دوزخ سب حق ہیں۔
اسی طرح نیکی کی قسموں پر سب نبیوں کا اتفاق
ہے یعنی طہارت، صلوٰۃ، زکوٰۃ، روزہ، حج اور
نفلی عبادت (دعا، ذکر، تلاوت) کے ذریعہ قرب
حاصل کرنا۔ اسی طرح نکاح کے جائز ہونے، زنا
کے حرام ہونے، عدل و انصاف قائم کرنے،
مظالم کے حرام ہونے مجرموں پر حد قائم کرنے،
اللہ کے دشمنوں سے جہاد کرنے اللہ کے حکم اور دین
کی اشاعت میں زیادہ سے زیادہ کوشش کرنے
پر بھی اللہ کے نبیوں نے اتفاق کیا ہے یہ سب
باتیں اصل دین ہیں جن کے لئے قرآن نازل
ہوا (الی ہے) ان کے نزدیک یہ سب باتیں مسلم

فمن قبل القرآن على السنتهم وانما الاختلاف في صور هذه الامور واشباحها كان في شريعة موسى عليه السلام الاستقبال في الصلوة الى بيت المقدس وفي شريعة نبينا صلى الله عليه وسلم الى الكعبة وكان في شريعة موسى عليه السلام القصاص فقط وجاءت شريعتنا بالقصاص والدية جميعاً وعلى ذلك اختلافهم في اوقات الطاعات وآدابها واركانها وبالجملة فالاوضاع الخاصة الى مهدت وبنيت بها انواع البر والارتفاقات هي الشرعة والمنهاج[1]

تھیں اسی بنا پر قرآن حکیم نے ان کے ثبوت میں زیادہ کاوش سے کام نہیں لیا۔

شرائع اور منہاج جس میں نبیوں کا اختلاف رہا ہے وہ نیکی و احکام کی شکلیں اور صورتیں ہیں مثلاً موسیٰ کی شریعت میں بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم تھا اور شریعت محمدی میں کعبہ کی طرف حکم ہے۔ موسیٰؑ کی شریعت میں زنا کی سزا صرف سنگساری تھی اور شریعت محمدی میں شادی شدہ کے لئے سنگساری اور غیر شادی شدہ کے لئے کوڑے مقرر ہیں۔ موسیٰؑ کی شریعت میں قتل کی سزا صرف قصاص تھی اور شریعت محمدی میں قصاص اور دیت (خون بہا) دونوں ہیں اسی طرح عبادت کے اوقات ارکان اور آداب میں بھی اختلاف رہا ہے۔ خلاصہ یہ کہ نیکی کی مختلف قسموں اور نفع مند تدبیروں کو بروئے کار لانے کے لئے جو خاص ہیئت و شکل اختیار کی جاتی ہے اس میں نبیوں کا اختلاف رہا اور اسی ہیئت و شکل کا نام شریعت و منہاج ہے۔

مختلف مذہبوں کے درمیان سمجھوتہ کے لئے قرآن حکیم کے بیان کردہ مذکورہ تفصیلات کو بروئے کار لانے کے لئے اسلام نے اپنے دور عروج میں جو تدبیریں اختیار کیں ان کی تفصیل یہ ہے:

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ باب بیان ان اصل الدین واحد والشرائع والمناہج مختلفۃ۔

ند صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مذہبوں کے ماننے والوں کو آپس میں بھائی اور
ر دیا۔

خوۃ[1] سب لوگ بھائی بھائی ہیں۔

احدۃ[2] وہ سب ایک امت ہیں۔

ب کے عبادت خانوں، عبادت کے طریقوں اور مذہبی پیشواؤں کی حفاظت

بۃ ولا کنیسۃ ولا یمنعون نیس ولا من اخراج بلا ھم۔ — یہودیوں اور عیسائیوں کے عبادت خانے نہ گرائے جائیں یہ لوگ ناقوس بجانے سے نہ روکے جائیں اور اپنی عید کے دن صلیب نکالنے سے نہ روکے جائیں۔

تہ ولا کنیسۃ وعلی ان یضربوا ساعۃ شاؤا من لیل ات الصلوۃ وعلی ان یخرجوا عیدھم[3]۔ — یہودیوں اور عیسائیوں کے عبادت خانے نہ گرائے جائیں یہ لوگ رات اور دن میں جب چاہیں ناقوس بجائیں البتہ نماز کے اوقات مستثنیٰ رہیں گے۔ یہ لوگ اپنی عید کے روز صلیب نکالیں۔

ن اسقفیتہ ولا راہب کاھن من کھانتہ ولا رون[4]۔ — کسی پادری کو اس کے موقف سے کسی راہب کو اس کی رہبانیت سے کسی کاہن کو اس کی کہانت سے نہ ہٹایا جائے اور نہ کسی پر کسی قسم کی سختی یا تنگی کی جائے۔

ود ۲ ؍ داؤد [3] سیرت ابن ہشام ج ۱ و الاموال لابی عبید ص ۲۰۴ و ۲۰۵

ف ص ۲۳ [4] الخراج ص ۴۲

۱۷۱ھ میں خلیفہ ہارون الرشید کے زمانۂ حکومت میں مصر کے گورنر موسیٰ بن عیسیٰ تھے انھوں نے منہدم شدہ گرجوں کی حکومت کی جانب سے تعمیر کرانے کے متعلق علماء سے فتویٰ طلب کیا۔ اس وقت علماء کے سرکردہ لیث بن سعد اور عبداللہ بن لہیعہ تھے۔ ان حضرات نے گرجوں کے تعمیر کرانے کا علانیہ فتویٰ دیا اور جواز میں نہایت دورس دلیل پیش کی۔

علامہ مقریزیؒ تاریخ مصر میں لکھتے ہیں:

فبنیت کلہا بمشورۃ اللیث بن سعد وعبداللہ بن لہیعۃ وقالا ھو من عمارۃ البلاد واحتجا ان الکنائس التی بمصر لم تبن الا فی الاسلام فی زمن الصحابۃ والتابعین[1]۔

عبداللہ بن لہیعہ اور لیث بن سعد کے مشورہ سے کل عبادت خانے حکومت کی جانب سے بنائے گئے۔ ان دونوں نے کہا کہ یہ تو شہر کی عمارتیں ہیں اور دلیل یہ پیش کی کہ یہ سب اسلامی حکومت صحابہ اور تابعین کے زمانہ میں تعمیر کئے گئے ہیں۔

(۳) ہر ایک کو عبادت کے علاوہ اور دوسرے مذہبی امور کی ادائیگی کی پوری آزادی دی گئی۔

ابوعبیدؒ کئی ملکوں کا تذکرہ کرنے کے بعد کہتے ہیں:

فھذہ بلاد العنوۃ واقر اھلھا فیھا علی مللھم وشرائعھم[2]۔

یہ تمام ممالک غلبہ سے فتح کئے گئے تھے اور ان کے باشندے اپنے اپنے مذاہب اور شریعتوں پر باقی رکھے گئے تھے۔

فقہ اسلامی میں ہے کہ اگر کوئی مسلمان غیر مسلموں کے خنزیر یا شراب کو ضائع کردے تو اس کی قیمت ادا کرنی پڑے گی حالانکہ اسلام میں یہ دونوں انتہائی حرام ہیں۔

ولضمن المسلم قیمۃ خمرہ وخنزیرہ اذا اتلفہ[3]

مسلمان غیر مسلموں کی شراب اور خنزیر کو ضائع کردے تو اس کی قیمت ادا کرنی پڑے گی

---

[1] تاریخ مقریزی [2] کتاب الاموال ص۱۰۱ [3] رد المختار

(۴) ہر ایک کے پرسنل لا اور کلچر کے حفاظت کی ضمانت دی گئی۔

فهم احرار في شهاداتهم ومناكحاتهم ومواريثهم وجميع احكامهم[1] — یہ لوگ اپنی شہادت کے احکام، نکاح کے معاملات وراثت کے قوانین اور دوسرے تمام پرسنل معاملات میں آزاد ہوں گے۔

شام کی فتح کے پندرہ سال بعد حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایک نسطوری پادری نے اپنے دوست کے نام جو خط لکھا تھا وہ موجود ہے اس میں صراحت ہے کہ

"یہ طائی (عرب) جنھیں خدا نے آج کل حکومت عطا فرمائی ہے وہ ہمارے بھی مالک بن گئے ہیں لیکن وہ عیسائی مذہب سے مطلق برسرپیکار نہیں ہیں بلکہ اس کے برخلاف وہ ہمارے دین کی حفاظت کرتے ہیں اور ہمارے گرجاؤں اور کلیساؤں کو جاگیریں عطا کرتے ہیں[2]۔"

(۵) ہر ایک کو مذہبی تبلیغ کی پوری آزادی دی گئی۔

ولا يحال بينهم وبين شرائعهم[3] — ان کے اور ان کی شریعتوں کے درمیان حائل نہ بنایا جائے گا۔

ولا يكرهون على دينهم[4] — ان کے دین میں کسی قسم کی زبردستی نہ کی جائے گی۔

اس انتظام کے نتیجہ میں دوسرے مذاہب والوں کی انفرادیت اس حد تک برقرار رہی کہ وہ "خود مختار وحدت" میں تبدیل ہو گئے جیسا کہ مشہور پادری کارالفسکی (C. Karalevski)

---

[1] المبسوط جلد ۱۰ صفحہ ۱۳۰۔

[2] جرمنی کی فرانسیسی یادداشت فتح الشام از عہد نبوی میں نظام حکمرانی صفحہ ۱۳۶۔

[3] طبری جزء رابع ذکر الخبر عن فتح المسلمين والفرس بنهاوند۔ [4] طبری فتح بيت المقدس

نے لکھا ہے:

"خود یہودیوں کے جن پر بہت سخت مظالم ہو رہے تھے..... یعقوبی عیسائیوں نے بھی عربوں کو اپنے نجات دہندوں کی حیثیت سے ہاتھوں ہاتھ لیا... مسلمانوں کی سب سے اہم جدت جس کا یعقوبی عیسائیوں نے دل خوشی سے استقبال کیا یہ تھی کہ کہ انھوں نے ہر مذہب کے پیروں کو ایک "خود مختار وحدت" قرار دیا اور اس مذہب کے روحانی سرداروں کو ایک بڑی تعداد میں دنیاوی اور عدالتی اقتدارات دئے۔"[1]

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ اسلام نے اپنے دور عروج میں مختلف مذاہب کو جس قدر آزادی و سہولتیں دی ہیں موجودہ دور کی ترقی یافتہ حکومتیں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی ہیں نیز ہر مذہب کو اپنی جگہ برقرار رکھ کر سمجھوتہ کی جو مذہبی راہ (وحدت دین) نکالی وہ موجودہ دور کی سیاسی راہ (وحدت ادیان) سے کہیں زیادہ بلند اور قابل عمل ہے۔

اس میں شک نہیں کہ بعض اوقات دوسرے مذاہب والوں کو جلا وطن کیا گیا یا ان پر "جزیہ" مقرر کیا گیا لیکن اس کی وجہ ان کا مذہب نہ تھا بلکہ دوسرے وجوہ تھے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر فرمایا:

اخرجوا الیهو د من الحجاز و اخرجوا اہل نجران من جزیرۃ العرب۔	یہودیوں کو حجاز سے نکال دو اور نجرانیوں کو جزیرۃ العرب سے نکال دو۔

رسول اللہ کے اس فرمان کی وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں نے آپ کی زندگی ہی سے معاہدہ کی خلاف ورزی اور خفیہ سازشیں شروع کر دی تھیں جس سے نقض امن کا قوی اندیشہ تھا۔

ابو عبیدؒ کہتے ہیں:

---

[1] کارل الفسکی کا مضمون فرانسیسی انسائیکلو پیڈیا "قاموس تاریخ و جغرافیہ کلیسا" عنوان الملکیہ محمود ۵۹۳-۵۹۲ از عہد نبوی میں نظام حکمرانی ص ۱۶۹ -

قال ذلك صلی اللہ علیہ وسلم لشئ کان منهم اولاً سن احداثوه بعد الصلح و ذلك بين فی کتاب بما کتبه عمر قبل اجلائه اياهم منها۔[۱]

رسول اللہ نے ان کو نکالنے کا حکم اس لئے دیا تھا کہ ان لوگوں نے عہد شکنی کی تھی یا صلح کے بعد کوئی نئی بات (صلح کے خلاف) ان کی طرف سے پائی گئی تھی، یہ حضرت عمرؓ کے اس خط سے ظاہر ہے جو انھوں نے جلا وطن کرنے سے پہلے ان کو لکھا تھا۔

دوسری جگہ کہتے ہیں:

اما بوالاباقی زمانه[۲]

عمرؓ کے زمانہ میں ان کی زیادتیاں بڑھ گئی تھیں۔

قاضی ابو یوسف نے منتقل کرنے کی یہ وجہ بیان کی ہے:

لانه خافهم علی المسلمين[۳]

عمرؓ کو ان سے مسلمانوں کے معاملہ میں خوف تھا۔

ان حرکتوں کے باوجود جب حضرت عمرؓ نے ان کو منتقل کرنا چاہا تو ہر قسم کی سہولتیں پہونچانے کا حکم دیا مثلاً سب سے پہلے یہ فرمان جاری کیا۔

من سار منهم امن بامان اللہ لا یضره احد من المسلمين[۴]۔

جو شخص ان میں سے چلا جائے گا وہ ہر طرح محفوظ رہے گا۔ کوئی مسلمان کسی قسم کا نقصان نہ پہنچا سکے گا۔

پھر عراق و شام کے گورنروں کو جو حکمنامہ بھیجا اس کی دفعات یہ ہیں:

(۱) جس علاقہ میں بھی اہل نجران آباد ہوں انھیں فراخدلی کے ساتھ زمینیں دی جائیں۔

(۲) مسلمان ان کی جان و مال کی پوری حفاظت کریں۔

---

۱ کتاب الاموال ص۹۹ ۔ ۲ ایضاً ص۱۹۹

۳ کتاب الخراج ص۴۰ ۔ ۴ کتاب الخراج ص۴۰

(۳) اگر ان پر کوئی ظلم کرے تو مسلمان آگے بڑھ کر اس کی مدافعت کریں۔
(۴) ان پر کسی قسم کی زیادتی نہ کی جائے۔
(۵) سرکاری ٹیکس سے انھیں دو سال معافی دی جائے[1]۔

اسی طرح فدک والوں کی کھلی سازش اور خلاف ورزی کی تصدیق کے بعد حضرت عمرؓ نے جب ان کو منتقل کرنا چاہا تو پہلے زمین و جائداد کی مناسب قیمت لگا کر رقم ان کے حوالہ کی اور پھر چلے جانے کا حکم دیا۔

ابو عبیدؒ کہتے ہیں:

فلما اجلاهم عمر بعث منهم من اقام لهم حظهم من الارض والنخل فاداه اليهم[2]۔	جب عمرؓ نے ان کو منتقل کیا تو واقف کار شخص کو بھیج کر ان کی زمینوں اور باغات کی قیمت لگائی اور رقم ان کے حوالہ کی۔

"جزیہ" دراصل جان و مال کی حفاظت کا معاوضہ تھا کوئی مذہبی ٹیکس نہ تھا۔ اس زمانہ میں جان و مال کی حفاظت کے لئے مقامی طور پر مستقل فوج رکھنے کی ضرورت ہوتی تھی جس کے اخراجات کے لئے جزیہ نام کا ٹیکس وصول کرنے کا دستور قدیم زمانہ سے چلا آرہا تھا۔ اسلام نے بھی اس دستور کو حالات کی مجبوری سے برقرار رکھا اور اگر کسی وجہ سے یہ حفاظت نہ ہوسکی تو وصول کیا ہوا ٹیکس (جزیہ) واپس کر دیا گیا جیسا کہ ابو عبیدہ (گورنر) نے شہر کے حاکموں کو یہ فرمان لکھا تھا:

ان يردوا عليهم ما جبي لهم من الجزية والخراج[3]۔	جزیہ اور خراج کی رقم جو وصول کر چکے ہو واپس کریں۔

اور یہ کہدیں کہ:

---

[1] کتاب الخراج ص ۴۳ [2] کتاب الخراج ص ۸۱
[3] کتاب الخراج ص ۱۸

انکم قد اشترطتم علینا ان نمنعکم وانا لا نقدر علی ذلك وقد رددنا علیکم ما اخذنا منکم ونحن لکم علی الشروط۔[1]

ہم اس شرط کو نہ پورا کر سکیں گے جس کا تم سے وعدہ کیا تھا کہ تمہاری حفاظت ہمارے ذمہ ہے اب ہم اس کی قدرت نہیں رکھتے ہیں اس لئے جو کچھ وصول کیا تھا وہ واپس ہے اور ہم بدستور شرط کے پابند ہیں

اس طرح جو لوگ فوج میں شریک ہو کر حفاظت میں مدد کرتے تھے ان سے جزیہ نہ لیا جاتا تھا۔ خود حضرت عمرؓ نے فوج میں شرکت کرنے والوں کے بارے میں عراق کے افسران کو لکھا تھا:

ویرفعوا عنهم الجزاء[2] ان سے جزیہ ہٹا دیا جائے۔

ابو عبیدہؓ کا مذکورہ فرمان ذکر کرنے کے بعد گلب پاشا نے اپنی کتاب میں لکھا ہے:

"I cannot remember any other occasion in histry when a government returned taxes already collected, on the grounds that it had failed in its obligations."[3]

"مجھے یاد نہیں پڑتا کہ تاریخ میں کبھی ایسا موقع بھی آیا ہو جبکہ ایک حکومت نے جمع کئے ہوئے ٹیکسوں کو اس بنا پر واپس کر دیا ہو کہ وہ اپنے فرائض ادا کرنے سے قاصر رہی ہو"

ان تصریحات کی موجودگی میں جلاوطنی یا جزیہ مقرر کرنے کی وجہ مذہب کو قرار دینا صرف تعصب و ہٹ دھرمی کی بات ہے جس کو کوئی حقیقت پسند تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہے۔

---

1. طبری جزء رابع فتوح المدائن قبل الکوفۃ
2. The Life and Time of Mohammad (by Glubb J Bgd) Chapter xx The Expansion of Islam as a Religion P. 387 (Last-Line)

مسلم پرسنل لا کے سلسلے میں دو سوالوں کے جوابات

(از مولانا حبیب ریحان ندوی، لکچرار اسلامک انسٹی ٹیوٹ، البیضا، لیبیا)

اسلامی نظام زندگی اور قانون کا خاتمہ سامراجی سازشوں سے تمام اسلامی ممالک میں سامراجی اور تبشیری حکومتوں کے زیر سایہ ہوا تھا، اور سب سے پہلے جس اسلامی سوسائٹی میں اسلامی قانون حدود و تعزیرات کو ختم کیا گیا تھا بدقسمتی سے وہ سرزمین ہندوستان تھی، "انگریزی حکومت کے قیام کے بعد بھی یعنی ۱۷۹۱ء تک قانون شریعت لاگو تھا اور مثال کے طور پر چور کا ہاتھ کاٹا جاتا تھا لیکن اس کے بعد انگریزوں نے رفتہ رفتہ اور وقتاً فوقتاً وضعی قوانین نافذ کرنے شروع کئے اور انیسویں صدی کے وسط تک قانون شریعت ختم کر دیا گیا، سامراجی حکومت کے زیر اثر مصر میں بھی ۱۸۸۳ء میں قانونی نظام فرانسیسی قانون کے مطابق ڈھالا گیا، بیسویں صدی میں البانیا اور ترکی نے پوری جرأت اور مسلمانوں کے ضمیر اور خواہشات کی پرواہ کیے بغیر یہ اعلان کر دیا کہ وہ دونوں لادینی حکومتیں ہیں اور سارے قوانین حتی کہ پرسنل لا تک اٹلی، سوئزرلینڈ اور فرانس کے قوانین کے ماتحت بنا دیئے[۱]۔"

---

[۱] مولانا مودودی کی عربی کتاب "نظریۃ الاسلام وھدیہ" کے حاشیہ صفحہ ۱۳۸-۱۳۹ سے ماخوذ باختصار یہ کتاب قانون اسلامی سے متعلق مولانا کے چھ مقالات پر مشتمل ہے۔ عربی ترجمہ "دار الفکر" بیروت و دمشق نے چھاپا ہے۔

یہاں اس حقیقت کا اظہار و اعتراف کرنا ضروری ہے کہ اسلامی ممالک میں سامراجی، یعنی انگریزوں، فرانسیسیوں اور اٹالیوں کے طویل دورِ حکومت میں کبھی بھی مسلمانوں کے احوالِ شخصیہ، یعنی شریعت کے وہ اوامر جو اجتماعی زندگی میں شادی بیاہ، طلاق اور میراث وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں اور جنہیں پرسنل لا کہا جاتا ہے، ان میں تبدیلی کی کوشش نہیں کی گئی، کیونکہ یہ ایک بدیہی حقیقت تھی جس کے سمجھنے کے لئے کسی زبردست عقلی ریاضت کی ضرورت نہیں تھی کہ یہ قوانین وہ ہیں جن کا تعلق سوسائٹی کے ان سب افراد سے براہ راست ہے جو کسی مذہب کے پیرو ہیں اور اس کا اثر حرام و حلال کی حدود کو چھوتا ہے۔

کیا یہ افسوس اور حرماں نصیبی کی آخری علامت نہیں ہے کہ غیر ملکی، سامراجی اور غیر مسلم حکومتیں علی الاقل اسلامی عائلی قوانین میں کسی بھی تبدیلی کا آغاز نہ کریں بلکہ ہر اسلامی ملک میں شرعی عدالتوں کے زیرِ سایہ اسلامی قانونِ عائلی کو اپنی زیرِ نگرانی نافذ کرائیں، اور وطنی اسلامی حکومتیں خدا کے بنائے ہوئے اس عظیم قانون میں تبدیلی اور تغیر کے نت نئے مطالبے کریں؟ اور بعض اوقات انتہائی جرأت مندی اور بے حیائی کے ساتھ کسی چیز کو آرڈیننس کے ذریعہ بدل بھی دیں؟ اس موضوع کی تفصیل اس مقالے میں کرنی مقصود نہیں ہے، لیکن صرف اتنا بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ اسلامی نقطۂ نظر سے قانونِ الٰہی کے جو ماخذ ہیں صرف ان کی روشنی میں اسلامی قوانین بنائے جا سکتے ہیں، اور اس کے علاوہ کوئی دوسرا طریقہ اگر اختیار کیا جائے تو وہ عقلی، فطری اور شرعی تینوں قباحتوں کا حامل ہوگا، اور صحیح نہ ہوگا بلکہ عقل، فطرت اور شریعت پر ظلم عظیم کے مرادف بھی ہوگا، کیونکہ وہ فسق و ظلم و کفر کے جالوت کا آئینہ دار ہوگا۔

اس موقع پر بعض نادان اور اکثر دانا یہ دو سوال اٹھاتے ہیں، پہلا یہ کہ جب اسلام کا قانونِ جنائی (کریمنل لا) اور دوسرے قوانین نافذ نہیں ہیں تو پھر پرسنل لا کے نفاذ پر اتنا زور کیوں دیا جاتا ہے؟ دوسرا یہ کہ دیکھئے فلاں اسلامی ملک میں فلاں اسلامی قانون بدل دیا گیا ہے یا اس کے بدلنے کی ناکام و نامرادی سہی کوششیں جاری ہیں، اس کی روشنی میں ہم بھی اسلامی

قوانین کو بدلنے کے مجاز ہیں۔

دانا حضرات کے لیے تو ان دونوں سوالات کے جواب دینے کی بھی ضرورت نہیں کہ یہ اتنے بدیہی اور واضح ہیں کہ اس قسم کے معترضین اتنا جواب اچھی طرح جانتے ہیں لیکن نادان عوام کو گمراہ کرنے کی اس طرح کوشش کرتے ہیں، اس لیے ان کا مختصر جواب ہم بیان کرتے ہیں، سب سے پہلے تو ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ:

۱۔ کیا اسلامی شریعت اور کن قوانین میں تبدیلی اسلامی عہد حکومت میں ہوئی تھی؟

۲۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو پھر کب، کیسے اور کن حالات کے ماتحت ہوئی تھی؟

۳۔ اگر سامراجی دور میں غیر ملکی اور غیر مسلم حکام نے یا ان کے حکم اور اشارے پر ملکی حکام نے بھی جرأت کے ساتھ حریت و انصاف اور شریعت الٰہیہ کا گلا گھونٹا تھا تو کیا ان کا یہ غیر آئینی، غیر فطری اور غیر اسلامی طریقہ کار ہمارے لیے نمونہ اور حجت بن سکتا ہے؟

۴۔ سامراجی طاقتیں جب اسلامی ممالک میں اپنا جسمانی اقتدار لے کر آئی تھیں تو ان کی مخالفت مسلمانوں نے اسلامی جذبہ کے ماتحت کی تھی، اور بہرحال جو بھی سیاسی حالات ہوں، آخر کار جب سامراجی حکومتیں فنا ہو گئیں اور اپنے جسمانی اقتدار کا پشتارہ اسلامی ممالک سے لے کر اپنے اپنے وطنوں کو واپس لوٹ گئیں تو عوام نے ٹھنڈی سانس بھری اور کہا کہ اب ہم آزاد ہیں اور سامراج کے غلام نہیں ہیں۔

۵۔ کیا یہ مسرت اور سامراج کی غلامی سے آزاد ہونے کی بشارت صرف اس لیے تھی کہ ظاہری طور پر سامراج ہمارے درمیان سے چلا جائے لیکن اس کا تہذیبی ورثہ، اس کے بنائے ہوئے قوانین کو ہم حجت اور نظیر کے طور پر پیش کریں؛ کیا یہ عقل سلیم کے ساتھ مذاق اور فطرت سلیمہ کے ساتھ مضحکہ نہیں ہے۔

۶۔ اگر سامراج کے بنائے ہوئے قوانین صحیح ہو سکتے تو پھر آزاد ملکوں کے وہ افراد جو آزادی کے بعد صدارت اور وزارت کے عہدوں پر براجمان ہوئے ہیں اور وطنی ہیرو اور قومی رہنما تسلیم کیے گئے ہیں ان کے لیے سامراجی حکومتوں اور قوانین نے جیل کی سزائیں متعین کی تھیں، اور

وطن کے غدار، حکومت کے دشمن، ملک کے باغی فسادی اور اس قسم کی تمام تہمتیں ان کے حق میں روا رکھی تھیں۔

۷۔ سامراج کی بنائی ہوئی ریاستیں جب ختم ہو سکتی ہیں، سامراج کی بخشی ہوئی جاگیریں جب منسوخ ہو سکتی ہیں، سامراج کے عطا کردہ القاب جب مٹائے جا سکتے ہیں، سامراج کی بنائی ہوئی سڑکوں پر سے سامراجی زبان میں لکھے ہوئے نام اور تختیاں جب کھرچی جا سکتی ہیں، سامراجی نمائندوں کے مجسمے پارکوں میں سے جب اتارے جا سکتے ہیں تو پھر آخر سامراج کا بخشا ہوا ملحدانہ اور لادینی نظام تعلیم و تربیت کسی تغیر کا محتاج کیوں نہیں ہے؟ اور سامراج کے بنائے ہوئے غیر صالح، غیر معقول اور غیر اسلامی قوانین ختم کرنے میں آخر کونسی عقلی و شرعی قباحت مانع ہے؟ اور اس کے بدلے صالح اور بین الاقوامی انسانی اور اسلامی قوانین اپنانے میں کونسا عقلی و شرعی عذر مسلم قوموں کے پاس اب موجود رہ گیا ہے؟ اور کیوں اسلامی ممالک میں مسلم علماء اور مسلم عوام کو یہ حق عطا نہیں کیا جاتا کہ وہ قانون مغربی کے ایک ایک بند، ہر غیر اسلامی سطر، لفظ، بلکہ حرف تک کو ہمیشہ ہمیش کے لئے نکال دیں، اور کتاب و سنت یعنی شریعتِ اسلامیہ کے قانون کے دائمی تحفظ کے لئے انہیں پھر دوبارہ وہ حق واپس مل جائے جو انہیں اسلام نے عطا کیا ہے، اور جس کی نگہبانی و نگرانی ان پر فرض کی ہے، وہ حق یہ ہے کہ شریعتِ اسلامیہ کے خلاف بنائے گئے کسی بھی قانون کو عدالت میں چیلنج کرنے کا اختیار ہر مسلمان شخص کو دیا جائے، جس طرح اس کو اپنے دوسرے مالی و جانی حقوق کی حفاظت کے لئے یہ حق ملا ہوا ہے، کیونکہ مسلمان کے نزدیک اسلامی قانون اور شریعت کے احکام کی حفاظت اپنی جان، مال اور آبرو سے بھی زیادہ اہم اور ضروری ہے، یہ قانون شریعت نے اسے "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" والی شہادتی قرآنی نصوص میں دیا ہوا ہے، رسول پاک نے "من رأی منکم منکراً" والی حدیث میں ان پر یہ بات واجب کی ہے اور خلفائے اسلام کی زرین تاریخ میں ہمیشہ ہر عامی شخص کو بھی یہ حق حاصل رہا ہے بلکہ ایک بوڑھی عورت تک کو اس بات کی مکمل آزادی اور ضمانت اور حق دیا گیا تھا کہ وہ کسی بھی قانون کی شرعی حیثیت سے متعلق استفسار کرے،

بلکہ بھری محفل میں خلیفہ کے آرڈیننس کو چیلنج کرنے کی مجاز ہو اور اس کی اس نص قرآنی سے استدلال اور شرعی پوزیشن واضح ہو جانے کے بعد خلیفۂ وقت فوراً اس حکم کو واپس لے لے، اور اپنی غلطی کا اعتراف بھی کرے، اور اس طرح قیامت تک آنے والی ساری نسلوں کو تشریع یعنی اسلامی قانون سازی کے اصول سکھا دے۔

۸۔ عجب طرفہ تماشا تو یہ ہے کہ سامراج کے بنائے ہوئے سارے پلانوں میں تبدیلی تو روشن خیالی، قوم کی ضرورت، ملک کی ترقی اور وطنیت کا کمال سمجھا جائے، لیکن اسلامی قوانین میں سامراج نے جو تبدیلیاں کی تھیں ان کو بدلنے اور کالعدم کرنے کے بجائے ان کو سراہا جائے اور نظیر و حجت کے طور پر پیش کیا جائے۔

۹۔ بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھا کر پرسنل لا سے متعلق ان آئینی تبدیلیوں اور قانونی تغیرات کی کوششوں میں لگ جانا جن میں ترمیم کی جرأت سامراج تک کو نہ ہوئی تھی۔

۱۰۔ سامراج کے رخت سفر باندھنے کا مطلب ہی یہ تھا کہ اب اسلامی ممالک جلد از جلد قوانین الٰہیہ کو دوبارہ پوری آب و تاب کے ساتھ زندگی کے ہر شعبہ میں داخل کریں اور شریعت کے کلی اوامر و احکام پر اسلامی حکومتوں کی بنیاد ڈالیں، انحراف کی پالیسی کو ترک کریں اور زبان و دل سے قانونِ الٰہی کی سربلندی کی کوششوں میں لگ جائیں۔

۱۱۔ مسلمان اسے کہتے ہیں جو اسلام کو آخری، دائمی اور مکمل دین سمجھتا ہو، اور اس کا مطلب ہی یہ ہے کہ پورے قانون اسلامی اور شریعتِ الٰہیہ پر ایمان رکھتا ہو اور اس کے مکمل نفاذ کی کوششوں میں لگا ہوا ہو۔ جس شخص کے کلمۂ طیبہ کا تقاضا ہی یہ ہو کہ خدا کے سوا نہ کوئی خالق ہے نہ کوئی مالک ہے، نہ کوئی رب ہے اور نہ کوئی آقا ہے اور انسان کے جسم و جان پر خالق و مالک و رب کے بنائے ہوئے قانون کے سوا کوئی دوسرا قانون نافذ ہی نہ ہونا چاہیے، اس شخص کا مقصدِ حیات ہی یہ ہوتا ہے کہ تمام جھوٹی خدائیوں اور طاغوتی فرمانروائیوں کے خلاف وہ علم بغاوت ہو اور قانون خداوندی کے سوا کسی دوسرے قانون پر راضی نہ ہو، کسی ایسے با مقصد فرد یا جماعت یا پوری اسلامی سوسائٹی

سے یہ کہنا کہ چونکہ انگریزوں نے اسلامی کریمنل لا ختم کر دیا تھا اس لئے اب ہم اسلامی پرسنل لا بھی ختم کرنا چاہتے ہیں دماغی کمزوری اور عقلی خلل کے سوا اور کچھ نہیں، یہ بات دراصل دلیل اس بات کی ہوئی کہ پرسنل لا کو اصلی حالت میں باقی رکھا جائے اور سامراجیوں نے جن جن شرعی قوانین میں تبدیلیاں کی تھیں اسلامی ممالک میں انہیں فوراً اور بلاتاخیر نافذ کیا جائے تاکہ سامراج کی قانونی وفکری بالادستی کا بھی اسی طرح خاتمہ ہو جس طرح سیاسی بالادستی کا خاتمہ ہوا۔

۱۲۔ مسلمان صرف سامراج کے بنائے ہوئے قوانین کا مخالف نہیں ہوتا، بلکہ وہ ہر طاغوتی نظام، ابلیسی قانون اور غیر اللہ کے طریق زندگی کا مخالف ہوتا ہے، چاہے اس کے کرنے والے اپنے ملک کے مسلمان ہی کیوں نہ ہوں، کیونکہ مسلمان کا مقام شہدائے حق و انسانیت کا مقام ہے، قومیت و وطنیت کے تنگ نائے میں پڑ کر وہ حق و انصاف سے ہاتھ نہیں دھو بیٹھتا، اور خدا کے قانون کی سربلندی کے لیے وہ کوشش کرتا ہے، اور یہ تفریق نہیں کرتا کہ غیر اللہ کا قانون کوئی سامراجی حاکم نافذ کرتا ہے یا اپنے ہی ملک کا کوئی مسلمان نامی حاکم، وہ دونوں کے خلاف خدا کی رضامندی اور شریعت کی حفاظت و بقا کی خاطر نبرد آزما ہونے سے خوف نہیں کھاتا، اور اسلامی ملکوں میں صرف قانون اسلامی کا نفاذ چاہتا ہے کہ اس کے ذریعہ امت اسلامیہ خدا کی رضامندی و رحمت کی مستحق بھی ہوگی اور دوسری طرف قانون اسلامی کے صالح اور مفید عام تجربہ کو زندہ دیکھ کر ساری انسانیت اپنی دائمی پریشانیوں اور لاعلاج مشکلات کے لئے اس کی خدمات قبول کرے گی (جیسا کہ طلاق کے سلسلے میں ساری انسانیت نے کی)، مومن کا مقصد حیات اس دنیا میں خلافت کا قیام ہے، اور وہ دعوت الی اللہ کے ذریعے اور اسلامی قانون کی دائمی صلاحیت کے ذریعہ پوری انسانیت کی جھولی اسلام کی لازوال دولت اور قانون شریعت کی باکمال نعمت سے مالامال کرنا چاہتا ہے، تاکہ بحر و بر میں رونما ہو جانے والے فساد و سیلاب بلا کا خاتمہ ہو اور ظلمت انسانیت کی طویل شب فراق نورِ ایمان کی صبح وصال سے پھر ہم کنار ہو۔

ایسے مومن و مسلم کے سامنے یہ حجت باطل بے کار ہے کہ انگریزوں نے اسلامی کریمنل لا کو

ختم کر دیا اس لیے ہم پرسنل لا کو بھی ختم کر دیں۔

دوسرے سوال کی حقیقت بھی پہلے سوال کے جوابات کے ساتھ واضح ہو گئی، تاہم یہ بتانا ضروری ہے کہ۔

۱۔ کسی بھی نام نہاد اسلامی ملک میں اسلام کے پرسنل لا سے متعلق کوئی تبدیلی ہوئی ہے تو وہ قانونی طور پر حجت نہیں، اور شرعی طور پر اگر کتاب وسنت کے خلاف ہے تو باطل اور کالعدم ہے، اس کی پیروی کسی دوسری اسلامی حکومت میں کیسے ہو سکتی ہے۔

۲۔ کیا یہ تبدیلیاں علمائے اسلام کی رائے اور مسلم عوام کے جذبات کے ماتحت رونما ہوئی ہیں؟ ہرگز نہیں بلکہ مغرب زدہ حکومتوں کے اعلیٰ افسران کی اپنی من مانی ہے، اور کسی بھی شخص کی من مانی حرکات شریعت میں حجت کا درجہ نہیں رکھتیں۔

۳۔ بفرض محال عوام ہی کی مرضی اور رائے شماری اور ووٹنگ کے ذریعے بھی اگر کوئی تبدیلی و تغیر کیا گیا ہو تو وہ بھی اگر کتاب وسنت کے خلاف ہو تو شریعت کی نظر میں کالعدم ہے۔

۴۔ یہ دعویٰ صرف گمراہ کرنے والا ہے، اکثر اسلامی ممالک میں پرسنل لا میں کسی قسم کی بنیادی تبدیلی اب تک نہیں ہو سکی ہے۔ مغربی افکار کے دلدادوں کی طرف سے کوششیں ضرور شروع ہوئی ہیں، لیکن اکثر جگہ وہ ناکامی کا شکار ہوئی ہیں۔

۵۔ اکثر جگہوں پر حالات حاضرہ کے ساتھ جائز حد تک توافق کی صورتیں پیدا کرنے کی غرض سے فقہ اسلامی کے دوسرے مذاہب سے بھی مدد لی گئی ہے، اور کسی ایک فقہ تک قانون کو محصور نہیں رکھا گیا ہے[1]، مصری مقنن نے بھی یہی کیا ہے، پہلے اسلامی قانون کا ماخذ عام طور پر

---

[1] فقہی اصطلاح میں اس عمل کو "تلفیق" کہتے ہیں، اس کے لغوی معنی بھی اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں، "لفقت الثوب الفقه لفقا وھو ان تضم شقة الی اخری فتخیطهما، ولفق الشقتین یلفقهما لفقا، ولفقهما ضم احداهما الی الاخری فخاطهما (لسان العرب۔ ۱۲۔ ۲۰۶) (باقی اگلے صفحہ پر)

حنفی مذہب تھا، لیکن بعد میں اس اساس میں حالات و ضروریات کے مطابق فقہائے امت کی آراء اور فقہی استنباطات کو بھی جگہ دی گئی ہے ۔ لیبی مقنن بھی آج کل یہی کر رہا ہے ، فقہ مالکی کو اساس بنا کر پھر ضرورت کے مطابق دوسرے مذاہب فقہی آراء سے استفادہ کیا جا رہا ہے اور یہ طریقہ صحیح بھی ہے اور مناسب حال بھی، کیونکہ ساری دنیا پر محیط اور سارے مسلمانوں کے کے لئے قطعی طور پر قابل عمل اسلامی قانون میں تعصب ، تنگ نظری اور مذہبی تفوق و پندار کی خو کا ہونا کوئی ایسی مستحسن بات بھی نہیں ، لیکن ہاں فقیہ شہر اگر یہ چاہتا ہے اور اس پر راضی ہے کہ اسلامی قانون کے دائرے کو تنگ سے تنگ کر دے تا کہ پھر مسائل کے حل کے لئے حنفی، شافعی مالکی اور حنبلی فقہ کے بجائے لاطینی، انگریزی، فرانسیسی، اٹالی اور امریکی روشندانوں کی طرف دیکھنا پڑے تو اسے شوق سے مشقِ ستم کی اجازت ہے اور دعوت تعصب کو پروان چڑھانے کا موقع بھی میسر ہے ۔

تمام مذاہب فقہ حق پر قائم ہیں اور حق کی قدریں ان میں مشترک ہیں ، اہل سنت و فقہ

(بقیہ صفحہ گزشتہ) ترجمہ: "کپڑے کو لفق کیا یعنی ایک ٹکڑے کو دوسرے ٹکڑے سے ملا کر سی دیا ، اور دو ٹکڑوں کو لفق کیا یعنی دونوں کو آپس میں ایک دوسرے سے جوڑا اور پھر سی دیا" فقہی تلفیق کے معنی بھی اصلی اور لغوی معنی ہی کے قریب ہیں یعنی دوسرے مذاہب فقہ سے استفادہ اور ضرورت کے وقت ایک دوسرے کو ملانا ، کیونکہ کپڑے کے دو قطعوں کو بھی ضرورت کے وقت ملا کر سیا جاتا ہے ، بلا ضرورت یہ کام نہیں کیا جاتا ۔ احادیث ملفقہ عام طور پر احادیث کاذبہ کو کہا جاتا ہے ، اور یہ بھی لغوی معنی ہی سے ماخوذ ہے ، کیونکہ واضع حدیث سچ بات میں یا تو کچھ جھوٹ ملا دیتا ہے یا بات اپنے من کی بیان کرتا ہے لیکن اس کی نسبت حضور نامدار کی طرف کر کے اس میں کچھ جھوٹ کی آمیزش کر دیتا ہے ، لفق کے اصل معنی جھوٹ یا کذب کے نہیں بلکہ ایک چیز کو دوسری چیز سے ملانے کے ہیں ، اگر یہ آمیزش ایک صحیح چیز میں صحیح چیز کی ہے تو صحیح ہے اور اگر غلط کے غلط چیز کی ہے تو کذب کے معنی اپنے اندر رکھتی ہے ۔

کے اس قول میں صاف اور واضح اجازت اس بات کی ہے کہ سارے مذاہب سے استفادہ کیا جانا نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ ضرورت کے وقت مستحسن اور ضروری ہے اور کسی غیر اسلامی قانون سے اخذ کرنے کی صورت میں تو واجب اور فرض ہو جاتا ہے۔

یہاں تک تو مسئلہ کا پہلو بہت اچھا ہے لیکن اس سلسلے میں حسب ذیل باتوں کا خیال رکھنا انتہائی ضروری ہے :

(الف) ایک تو یہ کہ عام قانون کی بنیاد کسی ایک فقہی مذہب پر قائم کی جائے، اور ملک کے عام فقہی مذہب کی رعایت رکھی جائے تاکہ عوام میں بے دلی اور عدم اطاعت کے جذبات نہ ابھریں۔

(ب) یہ اس صورت میں اور اس وقت تک کے لئے ضروری ہے جب تک کہ ممالک اسلامیہ میں علیحدہ علیحدہ حکومتیں قائم ہیں، جب خلافت اسلامیہ قائم ہو جائے اور پورے عالم اسلامی میں ایک خلیفہ کا حکم نافذ ہو جائے اور ایک حکومت بن جائے تو اس وقت خلیفہ وقت تمام علمائے امت کے اجتماع کے ذریعہ فقہائے امت کے اقوال و مذاہب اور اجتہاد و استنباط کے شرعی طریقوں سے مکمل اسلامی قانون بنانے کا مجاز ہوگا اور کسی ایک مذہب فقہ کو بنیاد بنانے والی شرط اس صورت میں ختم کی جاسکتی ہے۔

(ج) عام حالات میں محض آسانیاں اور سہولتیں تلاش کرنا مقصود نہ ہو بلکہ دلائل و براہین کی روشنی میں اقوال کو اخذ کیا جائے۔

(د) شدید ضرورت کے وقت یا خصوصی حالات و مسائل میں آسانی کی خاطر بھی کسی مسئلہ کو قبول کیا جاسکتا ہے، بشرطیکہ وہ متروک اور بالکل ہی بے دلیل نہ ہو اور مقصود اصلاح ہو اور اسلامی نقطۂ نظر کام کر رہا ہو اور اخلاص ہو، کسی مشرقی یا مغربی نقطۂ نظر کی وجہ سے توڑ مروڑ کر یا غیر سائغ فی الشرع (شریعت میں غیر مقبول) تاویلات کے ذریعے نہ ہو۔

(ر) سب سے اہم اور سب سے ضروری شرط جس کے بغیر کسی قسم کی تحقیق واستنباط،

قیاس اور اجتہاد نہیں کیا جا سکتا، وہ یہ کہ یہ کام علماء و مفکرین اسلام کی اجتماعی آراء سے ہو، اور ایک ملک کے علمائے کرام کا اجماع یا امت اسلامیہ کے علماء کا اجماع کسی مسئلہ پر اگر ہو جائے تو پھر وہ کسی بھی مذہب فقہ سے لیا جا سکتا ہے۔ اجماع کے معنی یہ نہیں ہیں کہ کسی غیر شرعی چیز پر اجماع اس کو شرعی بنا سکتا ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ وہ مسئلہ یا تو پہلے سے کسی مذہب فقہی میں جائز ہو، یا پھر نئے مسائل میں، استنباطِ مسائل کے شرعی طریقے استعمال کیے جائیں جنھیں فقہاء و علمائے امت ہر ملک میں جانتے ہیں، نیز اجماع کا لفظ یہاں میں نے بمعنی اجتماع بھی لیا ہے، یعنی علمائے امت کی اکثریت اس کو قبول کر لے، اس صورت میں اس مسئلہ کو دوسرے مذہب فقہ میں سے اخذ کرنے کے بعد قانون میں لایا جا سکتا ہے، یہ ہرگز صحیح نہیں ہو سکتا کہ اجتہاد کی شرطوں، عربی زبان کی باریکیوں اور بلاغتوں اور فقہ اسلامی کے مذاہب سے بے خبری کے ساتھ ساتھ ہر عامی شخص کو اس طرح کی اجازت دیدی جائے اور جس کا جو جی چاہے وہ عمل شروع کر دے، یقیناً یہ شریعت پر ظلم کے مترادف ہوگا، کیونکہ یہاں تو ہم قانونی معاملات پر گفتگو کر رہے ہیں، عبادات اور ان اشیار تک میں جن کا تعلق [illegible] بندے کے درمیان ہے اس میں بھی عوام کو تقلید ہی کا حکم ہے، صرف مجتہد کو امام اعظم کے نزدیک اس بات کا اختیار ہے کہ چاہے تو تقلیدِ مجتہد کرے اور چاہے تو اپنے اجتہاد پر عمل کرے، اور امام شافعی نے عامی پر تقلید اور مجتہد پر اپنے اجتہاد کے موافق عمل واجب کیا ہے[1]، اس لئے قانونی اشیار میں عوام کو اختیار اور پسند کا حق نہیں دیا جا سکتا، اور اسی طرح علماء کی موافقت یا مجتہدین کے اتفاق سے اگر کوئی چیز قانون میں درج کر دی گئی تو پھر مجتہد کو بھی اس کے خلاف عمل کرنا درست نہیں، کیونکہ اسلام میں افتاء و قضاء کا منصب موجودہ دور میں قانون کورٹ کے منصب سے کسی طرح کم نہیں ہے، اور جس طرح قانون کے صدور کے بعد اشخاص کو

---

[1] قواعد الاحکام فی مصالح الانام، عبد العزیز بن عبد السلام جزء ۲، صفحہ ۱۶۰۔

چاہے وہ عوام ہوں یا خاص، علمائے قانون ہوں یا وکیل اور جج ہوں قانونی معاملات میں اپنی آراء و افکار کے مطابق فیصلہ کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہ جاتی، بلکہ سب قانون کے پابند ہو جاتے ہیں، بالکل اسی طرح علماء و مفکرین اسلام کے اجماع یا شبہ اجماع یا اکثریت سے کسی بھی مسئلے کو مان لینے کے بعد اس مسئلے کو ماننا تمام امت پر واجب ہوگا۔

کوئی صاحب یہ اعتراض نہ کریں کہ علمائے اسلام کا اجماع کسی معاملہ میں ہو ہی نہیں پاتا، کیونکہ قانونی اور فقہی چیزوں میں اختلاف علم و تفقہ کی دلیل بھی ہے اور تفکیر انسانی کا شاہکار بھی ہے، اسلامی شریعت کے علاوہ بھی دنیا میں کوئی ایسا قانون موجود نہیں جس میں کسی نہ کسی قانون دان، وکیل یا جج کو اختلاف نہ ہو، اس لئے اختلافات کا ہونا کوئی غیر فطری بات نہیں اور نہ یہ اسلامی قانون کے اجراء میں تعویق کا سبب بن سکتے، کیونکہ علمائے امت کا اصولی طور پر یہ متفق علیہ فیصلہ ہے کہ اسلامی قانون نافذ ہو، اور پھر قانونی طور پر اختلافاتِ فقہیہ کے باوجود علمائے حق کی اکثریت کا کیا ہوا فیصلہ، قانونی مسائل میں نافذ ہو سکتا ہے اور جمہوریت کے اس دور میں علمائے حق کی اکثریت کی رائے معلوم کرنی مشکل کام نہیں ہے، یہ فیصلہ قانونی اشیاء ہی میں ضروری بھی ہے۔

(س) اگر دوسرے مذاہب فقہ کے باشندے ملک میں موجود ہوں اور ان کے علماء کی اکثریت دوسرے مذاہب فقہ سے تلفیق کے حق میں نہ ہو۔ تو گو بظاہر یہ انتہائی افسوسناک بات ہوگی۔ لیکن مذہبی حریت اور تفکیری آزادی کی خاطر یہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ ہر مذہب فقہ کے ماننے اور چاہنے والے کے لیے قانونی اعتبار سے فیصلے اسی کی فقہ کے مطابق ہوں، ایسا کرنے میں نہ کوئی عقلی قباحت ہے اور نہ کوئی شرعی مانع۔ میرے نزدیک پہلی صورت مستحسن ہے اور اسلامی وحدت کی رو سے بھی اچھی ہے لیکن حریت کے تقاضوں کے پیش نظر اس دوسری چیز کے ماننے میں بھی مجھے ہرگز انکار نہیں، لیکن قانون میں پھر یہ تصریح بے حد ضروری کہ کوئی بھی وہ گروہ جو صرف اپنی فقہ کی روشنی میں فیصلہ چاہے گا، اسے کسی بھی مسئلے کے حل کے لئے کسی دوسرے مکتب فقہ سے اخذ کرنے کی مطلق اجازت نہ ہوگی اور اس کے سارے قضیے اسی مذہب کے

اقوال کی روشنی میں حل کیے جائیں گے چاہے ان میں کتنی ہی مشکل اور سختی ہو۔

۶۔ جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں کی وطنی حکومتوں کے لئے بھی اپنی جمہوریت کو تولنے کا وقت اور امتحان ہے کہ غیر وطنی اور سامراجی حکومتیں جب مسلم پرسنل لا میں تدخل نہ کر سکیں تو آئینِ جہانبانی اور دستورِ فطرت کے مطابق ہر عقیدے اور مذہب والے کو اس کے عقیدے اور اعمال میں جو حریت کی ضمانت دی گئی ہے وہ وطنی حکومتیں اس طرح پوری کر سکتی ہیں کہ سامراجی عہد حکومت میں مسلمانوں کے غصب کئے ہوئے حقوق واپس کریں اور اگر وہ یہ نہیں کر سکتیں تو کم ازکم ان حقوق اور قوانین ہی کو باقی رہنے دیں جنھیں غیر وطنی حکومت نے باقی رکھا تھا، اور خصوصی طور پر اسلامی عائلی قوانین، کیونکہ یوں تو اسلام کا ہر قانون اپنی جگہ پر اٹل اور مستحکم ہے، لیکن بعض قوانین ایسے وہ ہیں جو مسلمانوں کے اقتدار اور اسلامی حکومت ہی میں نافذ ہو سکتے ہیں، جیسے قصاص، حدود، اسلامی تعزیرات وغیرہ، اور بعض دوسرے قوانین وہ ہیں جو ہر خطۂ حکومت کے ماتحت ہوں یا اقلیت میں ہوں یا کسی بھی سیکولر اسٹیٹ میں رہتے ہوں، جیسے عبادات، اخلاقیات اور وہ اجتماعی اور عائلی قوانین جن کی رو سے حرام وحلال کی حدود متعین ہوتی ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کسی مذہب کا پیرو کسی بھی وضعی قانون کی رو سے حلال یا حرام کی ہوئی کسی چیز کو اپنا لے یا چھوڑ دے، کیونکہ مذہب کی حلال کی ہوئی چیزیں اس کے نزدیک حلال ہیں اور مذہب کی حرام کردہ اشیاء اس کے نزدیک حرام ہیں، اس کا وجدان وضمیر اور قلب ونظر اس کے علاوہ کسی دوسری بات کو ماننے سے انکار کرتے ہیں اور قانونی طور پر اگر اس کو منوا بھی لیا جائے تو گویا وہ ایک حرام کام کا مرتکب ہوگا۔ مثال کے طور پر وضعی قانون میراث میں سے کسی وارث کو ایک حق دلاتا ہے لیکن شرعی طور پر اس کا حصہ کم ہے یا وہ وارث ہی نہیں ہے تو یہ مال اس شخص کے لیے حرام ہوگا، اور حرام مال کھانے والے کا پیٹ آگ کا ایندھن بنے گا، دوسری مثال یہ کہ طلاق اسلامی طریقہ ہے، اگر قانون کسی مطلقہ جوڑے کے لئے یہ فیصلہ کرے کہ تمھاری طلاق نہیں ہوئی ہے، لیکن شریعت کا فیصلہ یہ ہو کہ ہوگئی ہے تو اب دونوں میاں بیوی فحش کاری اور زنا کے مرتکب ہوں

گے، اور اصرار کے ساتھ عمل کرنے اور توبہ کی طرف رجوع نہ ہونے کی صورت میں زناکار بھی خدا کی لعنت کا مستحق ٹھہرے گا۔ اس لیے اسلام کا عائلی قانون صرف اجتماعی اور سوشل قانون ہی نہیں بلکہ عقائد و عبادات کا ایک جزو ہے اور اس کی خلاف ورزی کی صورت میں گناہ ہوتا ہے، اس لئے کسی بھی آزاد ملک میں رہنے والا مسلمان شخص یہ کس طرح برداشت کرسکتا ہے کہ حکومت چاہے وہ اسلامی ہو یا سیکولر ہو اس کے عقائد و عبادات، قلب و وجدان، ضمیر و باطن اور حرام و حلال کے معاملات میں دخل اندازی کرے۔

۷۔ جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، وہاں بھی ان پر کسی نام نہاد اسلامی ملک میں کسی تبدیلی و تغیر کے قانون سے ان پر مطلق کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ جیسا کہ پہلے لکھ چکا ہوں قانون سازی اسلام میں صرف خدا کا حق ہے اور انسان کتاب وسنت و اجماع کی روشنی میں خدا کے احکامات کا استنباط کرتا ہے۔ اسلامی قانون کے ماخذوں میں کہیں یہ نہیں لکھا ہوا ہے کہ کسی اسلامی حاکم یا اسلامی ملک کا غیر اسلامی قانون بھی حجت بن سکتا ہے، بلکہ اس کے بالمقابل صاف صاف یہ اعلان ہے کہ "خدا کی معصیت میں کسی انسان کی اطاعت جائز ہی نہیں ہے"، اقلیت میں بسنے والے مسلمانوں کے پاس بھی براہ راست کتاب وسنت موجود ہے، وہاں بھی علماء و فقہاء پائے جاتے ہیں، اور وہ براہ راست احکام کا استنباط شریعت کے اصولوں کی روشنی میں کرسکتے ہیں جو مشکلات حیات پر قابو پانے کی پوری صلاحیت رکھتے ہوں۔

۸۔ مسلمان اقلیت کے لئے یہ حجت بھی بالکل غیر شرعی ہے کہ ملک کی غیر مسلم اکثریت نے اپنا مذہبی عائلی قانون بدل کر اس کی جگہ وضعی اور مدنی قانون شادی بیاہ اور میراث وغیرہ میں قبول کرلیا ہے، اس لیے اس ملک کی مسلم اقلیت کو بھی اسے قبول کرلینا چاہئے، کیونکہ اکثریت اس معاملہ میں آزاد ہے اس کا جو جی چاہے کرے لیکن اقلیت کے حقوق کو چھیننے کا وہ حق نہیں رکھتی، دوسری بات یہ کہ شاید اکثریت کے مذہب اور اس کے بانیوں اور مقننوں نے اس کی اجازت اپنے پیرووں کو دی ہو کہ تم قانونِ عائلی میں تبدیلی کرسکتے ہو، لیکن شرع اسلام نے صاف صاف یہ حکم دیا ہے کہ یہ حدود اللہ

ہیں ان سے آگے نہ بڑھنا اور کسی قسم کی غیر شرعی تبدیلی کے مجاز ہی تم نہیں ہو، اس لیے کسی انسانی قانون ساز کو کبھی یہ جرأت نہ ہو کہ وہ خدا کے مقرر کردہ احکام و قوانین کو بدلے تیسری عقلی بات یہ کہ اسلام کے عائلی قوانین مسلمان کی نظر میں سارے وضعی قوانین سے بہتر ہیں اور عدل و عدالت دونوں اپنے اندر رکھتے ہیں (یعنی کسی ایک خاص شخص کے کیس میں بھی انصاف کرتے ہیں اور عام فطری اصولوں کی رو سے بھی ہر پیش آنے والے قضیے میں حق و انصاف کی رعایت کرتے ہیں)، اور اس طرح زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دینے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں، چوتھی بات یہ کہ کسی غیر مسلم کی نظر میں یہ قوانین نعوذ باللہ ظالمانہ ہوں یا زمانہ کا ساتھ دینے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں تو قطع نظر اس کے کہ یہ بات عقل و منطق، تاریخ و تجربہ کے خلاف ہے، پھر بھی ہم یہی کہیں گے کہ سوسائٹی میں بہت سے دوسرے ظالمانہ مسائل ہیں آپ براہ مہربانی ان کی طرف توجہ دیں، اور ہمارے مسائل کو ہمارے لئے چھوڑیں، کیونکہ جب ملت اسلامیہ ان مفروضہ نقصانات کو بخوشی دلی برداشت کرنے کے لئے راضی ہے تو پھر یہ پرانی مثل صادق آتی ہے کہ جب میاں بیوی راضی تو پھر کیا کریں قاضی۔

۹۔ قوانین اسلامیہ کے سلسلے میں کتاب وسنت سے اجتہاد کے لئے علمائے امت ہی کی رائے وقیع ہوسکتی ہے۔ جبری احکام یا جلسوں جلوسوں اور ووٹنگ کے ذریعہ اس قسم کی قانونی باتیں طے نہیں ہوسکتیں۔ اگر کسی ملک کے چور یا رشوت خور، یا بلیک مارکیٹنگ کے دلدادے اور اخلاق باختگی پر فریفتہ دیوانے کسی شہر میں جلسہ کریں اور ووٹنگ سے یہ پاس کرادیں کہ یہ اخلاقی اور قانونی برائیاں، برائیاں نہیں بلکہ اچھائیاں ہیں، اور عیب نہیں بلکہ ہنر ہیں، تو کیا عقل ان کی ہرزہ سرائی کو برداشت کرے گا، اور اگر کسی دوسرے ملک یا قانون سے یہ حجت بھی پیش کردیں کہ وہاں بلیک کی عام اجازت ہے، یا فلاں بابلی قانون میں اور فلاں ماڈرن سوسائٹی میں کنوارپن اور عفت وعصمت عیب سمجھے جاتے ہیں اور حرام کاری، بے حیائی اور عیاشی ہنر اور فیشن ہے، تو کیا یہ بات کسی دوسرے اخلاق وایمان سے آشنا ملک کے متعلق کے لئے نظیر کا کام دے سکتی ہے؟

۱۰۔ جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں کی حکومتیں اگر اسلامی حکومتوں کی تقلید ہی کرنا چاہتی ہیں تو اچھی باتوں میں کرنی چاہیئے، مثال کے طور پر اکثر اسلامی ملکوں میں پرسنل لا میں مطلق تبدیلی نہیں ہوئی ہے اور بعض ملکوں میں شریعت کے پورے قوانین نافذ ہیں جن میں دیوانی و فوجداری سب شامل ہیں، اور بعض ممالک میں شریعت اسلامیہ کے مطابق سارے قوانین ڈھالنے کے اعلان ہو چکے ہیں، کہیں اسکیمیں تیار ہیں یا پھر یہ کہ مسلم ملکوں میں اقلیتوں مثلاً یہودی اور مسیحی حضرات کا پرسنل لا اب تک محفوظ ہے اور کسی قسم کی تبدیلی اور ترمیم اس میں نہیں کی گئی ہے، اس لیے وہ جمہوری ممالک جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں انھیں اسلامی ممالک کے اس عظیم قانونی و اخلاقی کردار کی روشنی میں سوچنا چاہئے جو وہ اپنی محکوم اقلیتوں کے ساتھ کرتے ہیں، یا پھر ہندوستان کی ساڑھے آٹھ سو سالہ تاریخ تقنین پر نظر رکھی جاسکتی ہے جس میں کہیں بھی غیر مسلموں کے پرسنل اور عائلی قوانین، حتیٰ کہ عادات و رسوم تک کو ہاتھ نہ لگایا گیا تھا، یا پھر عباسی، اُموی اور اندلس کی تاریخ قانون سے بھی یہ چیزیں معلوم کی جاسکتی ہیں۔

۱۱۔ کیا ترکی کے لیے یہ بات افسوس اور محرومی کی نہیں ہے کہ شریعت میں جو تبدیلیاں سامراجی اور مسیحی حکومتیں نہ کر سکیں وہ اس نے کیں اور جس ترکی نے چھ سو برس تک اسلامی اقدار کی حفاظت کی تھی وہی آج ان اقدار کو لوٹنے والا قزاق بن گیا؟

اور کیا یہ شرم و عار کا مقام نہیں کہ ترکی کے بنائے ہوئے عائلی قوانین یہودی ملک اسرائیل اور مسیحی ملک لبنان کے مسلم باشندوں پر نافذ ہیں، اور ترکی کی مسلم سوسائٹی اس سے محروم کر دی گئی ہے؟ اور سیکولر ہندوستان میں انگریزوں کے زمانے میں بنایا ہوا مسلم پرسنل لا آج بھی نافذ اور جاری ہے؟ اور بعض اسلامی ملک ان قوانین کی تبدیلی کی ناکام ہی سہی لیکن کوششوں میں لگے ہوئے ہیں؟ اور کیا سب سے بڑھ کر ستم یہ نہیں کہ ان نام نہاد اسلامی حکومتوں کے اقوال و اعمال و کردار کو حجت بنا کر اس کی روشنی میں مسلم اقلیتوں کے اسلامی پرسنل لا میں تبدیلی کی باتیں غیر اسلامی ممالک میں سوچی جاتی ہیں اور ان کو حجت بنا کر پیش کیا جاتا ہے، اور اس طرح اقلیتوں کی محافظ، غم گسار

اور سہارا بننے کے بجائے مسلم حکومتیں اور ان کے اعمال اقلیتوں کی محرومی اور دل شکنی کا باعث بنتے رہتے ہیں۔ (یہ بات پہلے لکھی جا چکی ہے کہ ان کے اعمال اور غیر اسلامی قوانین کسی کے لئے بھی حجت نہیں بن سکتے۔)

۱۲۔ تمام غیر مسلم اور قدیم قومیں اپنا رشتہ اپنے ماضی سے اور اپنے ناقابل عمل تاقابل ورثہ سے جوڑنا چاہتی ہیں اور اسے فخر سمجھتی ہیں، اور عصر حاضر کے مطابق نہ ہونے کی صورت میں اس میں طرح طرح کی تاویلات کرتی ہیں، بلکہ یوں کہئے کہ پاپڑ بیلتی ہیں، کیا مسلم اقوام کی بیداری کا وقت اب بھی نہیں آیا ہے؟ اَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ (حدید - ۱۶) ترجمہ "کیا ایمان والوں کے لئے (اب بھی وہ) وقت نہیں آگیا کہ ان کے دل ذکر الٰہی سے خشوع حاصل کریں، اور اس سے جو (دین) حق (خدا کی طرف سے) نازل ہوا؟" کیا انھیں اپنے قدیم اور دائمی آسمانی حقائق سے آگہی نہیں حاصل کرنی چاہیے؟ کیا انھیں اپنے تہذیبی ورثہ کی طرف نہیں لوٹنا چاہیے؟ کیا دنیا میں پیدا شدہ مشاکل کا ازلی حل اور ابدی علاج جس اسلامی قانون میں موجود ہے کیا اس کو مکمل طور سے اپنانے کی سعی اخلاص و ایمان کے ساتھ انھیں نہیں کرنا چاہیے؟ اور اس طرح الجھنوں میں گھری ہوئی انسانیت کو مشکلات کے حل کرنے کا فطری طریقہ انھیں نہیں سکھانا چاہیے؟ اور کیا خدا کے بخشے ہوئے نور اور سلامتی کی راہ کا پرچار انھیں اقوام عالم کی حیرانیوں اور گم کردہ راہ پگڈنڈیوں کے سامنے نہیں کرنا چاہیے؟ اور اقوام عالم کے لئے خدا کی دی ہوئی اس ندا سے ان کے گوش آشنا نہیں کرنا چاہیے۔ قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ ۝ يَهْدِي بِهِ اللَّهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِهِ وَيَهْدِيهِمْ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (مائدہ - ۱۵ - ۱۶) ترجمہ "تحقیق آگیا تمہارے پاس (تمہارے) اللہ کی طرف سے نور اور روشن و واضح کتاب، اس کے ذریعہ اللہ ہدایت دیتا ہے جو اس کی رضا کا تابع ہو، سلامتی کی راہوں کی، اور نکالتا ہے ان کو زندگی کے اندھیروں میں سے روشنی کی طرف، اپنے حکم سے، اور انھیں سیدھی راہ کی ہدایت کرتا ہے۔"

بہرحال مختصر سے اس مضمون میں ہم نے تفصیل کے ساتھ دونوں سوالوں کا جواب دیدیا ہے۔ آخر میں اختصار کے ساتھ اتنا اور کہنا چاہتے ہیں کہ یہ دونوں سوال فطری، عقلی، بدیہی اور قانونی وشرعی کسی بھی اعتبار سے صحیح نہیں ہیں، کیونکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی بھی شخص یا قوم کا غیر آئینی عمل کسی بھی دوسرے شخص یا قوم کے لئے آئینی حجت نہیں بن سکتا، اور اسی طرح کسی شخص کے پیٹ میں اگر درد ہو تو یہ اس بات کے لئے دلیل نہیں بن سکتا کہ کسی نہ کسی طرح اس کے سر میں بھی درد پیدا کیا جائے، یا اگر کسی ایکسیڈنٹ میں یا کسی ظالم وجابر غیر ملکی فرمانروا کے تشدد کی وجہ سے کسی شخص کی ایک آنکھ پھوٹ گئی ہے تو اس کو اس بات کی سند نہیں بنایا جاسکتا کہ ضرور اس کی دوسری آنکھ، ناک، کان، ہاتھ، پیر اور دوسرے اعضاء بھی تلف کیے جائیں۔ اس طرح کی منطق نہ صرف یہ کہ نادانی اور لاعلمی سے تعبیر کی جائے گی بلکہ شاید کوئی بھی صحیح الدماغ انسان اس قسم کی ہرزہ سرائی کی جرأت نہیں کرسکتا، وہ صرف یہی کہے گا کہ فوراً آپریشن کے ذریعہ اس کی آنکھ ٹھیک کرنے کی پوری کوشش کی جائے، اور اگر خدانخواستہ وہ ٹھیک نہ ہوسکے تو اس کی دوسری آنکھ کی مکمل نگہداشت، حفاظت اور نگرانی کی جائے کہ کہیں اس کو مزید نقصان نہ پہنچ جائے۔ یہ بات عقلی طور پر کتنی ناقابل تسلیم اور مضحکہ خیز ہے کہ اگر کسی چور یا غاصب نے آپ کی گھڑی چرالی ہے یا غیر قانونی طور پر آپ کی زمین ضبط کرلی ہے تو کوئی دوسرا ساہوکار یا ہمدرد ملک کے قانون ساز ادارے یا عدالت سے یہ مطالبہ کرے کہ ان کے گھر کا سارا ساز وسامان چرالے جانے اور ان کے سارے مکانات، دکانیں اور زمینیں بھی ضبط کرنے کا قانونی حق عطا کیا جائے، یا یہ بات کس قدر عبرتناک حد تک نادانی ہوگی، اگر کوئی شخص یہ مطالبہ شروع کردے کہ چونکہ ظالم وغاصب سامراج کی قانونی عدالت یا غیر قانونی حکومت نے فلاں ملک کے فلاں وزیر اعظم یا قومی رہنماؤں کے خلاف جیل کی سزائیں دی تھیں اور ان میں سے کسی نے سولہ برس، کسی نے سولہ مہینے اور کسی نے سولہ دن ہی سہی جیل کی مشقتیں برداشت کی تھیں، اس لیے اب سامراج کے چلے جانے کے بعد ان سارے قومی رہنماؤں تک کو جیل دی جائے جن کو سامراجی حکومت

نے جیل کی سزا نہیں دی تھی اور دوسری طرف وہ رہنما جن کو سامراج کی عدالتوں نے سزائیں دی تھیں ان کو آزادی کے بعد بھی وزارت و امارت کی کرسیوں سے ہٹا کر دوبارہ جیل کی کوٹھریوں میں فوراً بند کر دیا جائے، اس قسم کی باتیں نہ صرف یہ کہ نادانی سے تعبیر کی جائیں گی بلکہ اگر کوئی ایسی بات کہے تو اسے ڈاکٹری معائنہ کے بعد یا تو پاگل خانے بھجوا دیا جائے گا یا پھر عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کیا جائے گا اور جیل بھجوا دیا جائے گا۔

لیکن طرفہ تماشا یا ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ اسلامیات یا پرسنل لا کے سلسلے میں اس قسم کی باتیں کرنے کا نام ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عقلمندی، روشن خیالی، دانائی، فیشن، ہنر، ریسرچ اور علم و تحقیق پڑ گیا ہے۔ بہرحال اس قسم کی غیر آئینی، غیر علمی، غیر عقلی، غیر فطری اور غیر شرعی باتیں کرنے والوں کے حق میں بھی ہم صرف دعا ہی کر سکتے ہیں، کہ اے فیاض ازل حکمت و شعور اور عقل و دانائی کی دولت انھیں نصیب فرما، اور قانون اسلامی کی خوبیوں کو سمجھنے کی بصیرت ان میں پیدا فرما، اور حقیقی اسلام کی چاشنی سے ان کے کام و دہن آشنا بنا تاکہ وہ مسلمان ہو کر اور مسلمانوں جیسے نام رکھ کر اسلام کو نقصان نہ پہنچائیں بلکہ تیرے دین کے سچے خدمتگذار بن جائیں، اور غیر اللہ اور طاغوت کی قانونی بالادستی کے بھی منکر ہو جائیں، اور دلوں سے مغربی و مشرقی غیر اسلامی افکار، اقدار اور تہذیب کی محبت بھی نکل جائے کہ اسلامی قانون کو بروئے کار لانے میں یہی سب سے بڑی رکاوٹ ہے، لیکن اسلام کے سیل رواں اور اسلام کی روشنی کے سامنے اس کی حقیقت کچھ بھی نہیں ہے، اور اب وہ وقت قریب آچکا ہے جب اسلامی ملکوں میں اسلام کا شمس تاباں پوری درخشانی کے ساتھ طلوع ہونے والا ہے اور باطل کے سارے گھروندے خس و خاشاک بن کر بہہ جائیں گے یا خاکستر ہو جائیں گے کیونکہ ان کی حقیقت مکڑی کے جالوں سے زیادہ نہیں ہے،

مَثَلُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِن دُونِ اللَّهِ أَوْلِيَاءَ كَمَثَلِ الْعَنكَبُوتِ اتَّخَذَتْ بَيْتًا ۖ وَإِنَّ أَوْهَنَ الْبُيُوتِ لَبَيْتُ الْعَنكَبُوتِ ۖ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُونَ مِن دُونِهِ مِن شَيْءٍ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۖ وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُونَ (عنکبوت ۴۱-۴۳)

ترجمہ "ان لوگوں کی مثال جو اللہ کے سوا اولیاء (محبوب، مددگار، شریک، حامی) دوسروں کو بناتے ہیں، ان کی مثال مکڑی کی طرح ہے کہ اس نے ایک گھر بنایا اور سب سے کمزور گھر مکڑی کا گھر ہے، اگر وہ سمجھتے، اللہ جانتا ہے جس کو پکارتے ہیں اس کے سوا کوئی چیز بھی، اور وہ زبردست حکمتوں والا ہے، اور یہ مثالیں (اور کہاوتیں) ہم لوگوں کے (فائدے) کے لئے بیان کرتے ہیں، اور ان کو سمجھتے (بوجھتے) وہی ہیں جو جاننے والے (سمجھدار) ہیں۔

علامہ اقبال اور اسلامی ثقافت
کے
اصل الاصول کی ترجمانی

(از جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری سابق رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اترپردیش)

اسلامی ثقافت یا "مسلم کلچر" عام طور پر اہل اسلام کے نقطۂ نظر سے ان کے اندازِ زندگی کا نام ہے، جسے اگر منطقی بنیادوں پر متعین کیا جائے تو اس چیز کے مترادف قرار پاتا ہے، جسے قرآن "دین" کا نام دیتا ہے۔

مگر علامہ اقبال کے نزدیک "اسلامی ثقافت" اُن علوم بالخصوص علوم عقلیہ کا مصداق ہے جو مسلمانوں کی تفکیری سرگرمیوں کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوئے۔ ویسے وہ بھی اصولی طور پر اس کا ماخذ قرآن اور اُس کی تعلیمات ہی کو بتاتے ہیں۔

اس قرآن اور اس کی تعلیمات کے بارے میں علامہ کا خیال ہے کہ:

"بنیادی طور پر قرآن کی روح کلاسیکیت بیزار (یونان بیزار) ہے"

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

یہ وہ چیز ہے جسے قرآن کے ابتدائی طالب علموں نے کلاسیکی قیاس آرائی کے زیر اثر ہوتے ہوئے نظر انداز کر دیا۔ وہ قرآن کو یونانی فکر کی روشنی میں پڑھتے اور سمجھتے

تھے۔ انھیں اس حقیقت تک پہونچنے میں کہ قرآن کی روح حقیقی طور پر کلاسیکیت بیزار (یونان بیزار) ہے، دو سو سال لگے۔"

علامہ نے اس مزعومہ واقعہ کو ایک بنیادی تاریخی حقیقت سمجھنے پر اصرار کیا۔ لہٰذا ایک اور مقام پر فرمایا:

"اس حقیقت کو نہ سمجھتے ہوئے کہ قرآن کی روح حقیقی طور پر کلاسیکیت بیزار یا یونان بیزار ہے، اور یونانی مفکرین پر پورا اعتماد کرتے ہوئے اُن (مسلمان مفکرین) میں پہلا رجحان اور میلان یہ پیدا ہوا کہ قرآن کو یونانی فلسفہ کی روشنی میں سمجھیں۔"

انھوں نے اس مزعومہ "یونان پسندی" اور "یونان بیزاری" کے درمیان تاریخی طور پر تحدید کی بھی کوشش کی ہے کہ "یونان پسندی" کا یہ رجحان مسلمانوں میں دو سو سال تک رہا، جس کی وجہ سے عمل پسند عرب کوئی علمی ترقی نہ کر سکے۔ فرماتے ہیں:

"واقعہ یہ ہے کہ یونانیوں کے اثر نے .... اس کے برخلاف مسلمانوں کے تصورِ قرآن کو دھندلا اور غیر واضح رکھا اور کم وبیش دو سو سال تک عمل پسند فعّال عربوں کے مزاج کو اپنے اظہار وتحقق کا موقعہ نہیں دیا۔"

اس اصرار بیجا کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے اسلامی ثقافت کو یونانی علوم کی افادیت سے مسلمانوں کی مایوسی کا نتیجہ قرار دیا۔ فرماتے ہیں:

"اس بات کے پیش نظر کہ قرآن کی روح ٹھوس واقعات سے اعتنا کرنا ہے اور اور یونانی فلسفہ کی حقیقت قیاس آرائی ہے جو نظریات تراشی میں مگن رہتا ہے اور حقائق و واقعات سے بے اعتنائی برتتا ہے، اس کوشش کا نتیجہ ناکامی کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا اور اس ناکامی کے نتیجہ میں اسلامی ثقافت کی حقیقی روح منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئی۔"

لہٰذا علامہ کے نزدیک مختلف اسلامی علوم (بالخصوص علوم عقلیہ) کی ترقی یونانی فکر کے

خلاف مسلمان مفکرین کی ذہنی بغاوت کا نتیجہ تھی۔ اس ذہنی بغاوت کی تفصیل میں فرماتے ہیں :

"یونانی فلسفہ کے خلاف اس عقلی بغاوت کا اظہار فکر کے جملہ شعبوں میں ہوا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ میں اس بات کی کما حقہ تفصیل کا اہل نہ ہو سکوں گا کہ ریاضی وہیئت اور طب میں اس کا ظہور کس طرح ہوا۔ یہ اشاعرہ کی مابعد الطبیعی تفکیر میں بالکل واضح ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ اُس تنقید میں عیاں ہے، جس کے ساتھ مسلمانوں نے یونانی منطق پر تبصرہ کیا۔"

آخر میں علامہ نے ریاضیات کے اندر مسلمانوں کی سرگرمیوں کے بارے میں حسب ذیل تبصرہ سپرد قلم فرمایا ہے :

"جہاں تک ریاضیات کا تعلق ہے، یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ بطلیوس (۸۷ - ۱۶۵ء) کے زمانہ سے نصیر الدین طوسی (۱۲۰۱ - ۱۲۷۴ء) کے زمانہ تک کسی نے بھی ان دقتوں کی طرف سنجیدگی سے غور نہیں کیا جو (اصول) اقلیدس کے خطوط متوازی کے مصادرے کی صحت کو مکانی حسی کی بنیاد پر ثابت کرنے میں مضمر ہیں۔ یہ محقق طوسی ہی کی ذات تھی، جس نے اس سکون میں جو ہزار سال سے دنیائے ریاضیات پر طاری تھا، تلاطم برپا کیا، محقق طوسی نے اس مصادرہ کی اصلاح کی کوشش میں مکان کے حسی تصور کے ترک کرنے کی ضرورت کا احساس کیا۔ اس طرح انھوں نے فضائے کثیر الجہات کی تحریک کے لئے، ہرچند کہ وہ کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو، بنیاد فراہم کی۔"

لیکن علامہ کی عظمت فکر کے باب میں ادب واحترام کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑتے ہوئے بھی ہم اس احساس حقیقت کے لئے مجبور ہیں کہ یہ افادات محل نظر ہیں۔

(۱) قرآنی تعلیمات کی روح کا تعین | قرآن کی تعلیمات کی روح یا اصل الاصول کو متعین کرنے کی کوشش ہمارے مصلحین کی قیاس آرائیوں کا بڑا دلچسپ موضوع رہی ہے علامہ اقبال بھی اس روش عام پر چلے بغیر نہ رہ سکے اور انھوں نے اسے "یونان بیزاری" میں مضمر

سمجھ لیا، چنانچہ خطبات میں فرماتے ہیں:

"بنیادی طور پر قرآن کی روح کلاسیکیت بیزار (یونان بیزار) ہے"

لیکن خود قرآن حکیم کی تصریحات کی رو سے "قرآن کی روح" "یونان پسندی" اور "یونان بیزاری" دونوں سے بالاتر ہے۔ "اسلامی تعلیمات" کے مطابق یہ "توحید ربوبیت" چنانچہ حسب تصریح قرآن مجید منشائے تخلیق انسان صرف "عبادت الٰہی" ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (ذاریات۔۵۶)

[اور میں نے جن اور انس کو اسی واسطے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کیا کریں]

اور اسی مقصد کے تحقق کے لئے بار بار انبیاء کرام کی بعثت ظہور میں آئی، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُوْلٍ إِلَّا نُوْحِيْ إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُوْنِ"

(الانبیاء۔۲۵)

[اور ہم نے آپ سے پہلے کوئی ایسا پیغمبر نہیں بھیجا جس کے پاس ہم نے یہ وحی نہ بھیجی ہو کہ میرے سوا کوئی معبود (ہونے کے لائق) نہیں ہے۔ پس میری ہی عبادت کیا کرو۔]

خود شارع علیہ السلام نے "دعائم اسلام" کو جو اس کے رکن رکین اور مبنیٰ علیہ ہیں، حدیث مشہور میں متعین فرما دیا ہے۔ ان میں اولین حیثیت "ایمان باللہ" کی ہے:

"بُنِيَ الاسلام على خمس: شهادة ان لا اله الا الله وان محمداً عبده ورسوله واقام الصلوٰة وايتاء الزكوٰة والحج وصوم رمضان"

[اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے: اس بات کی شہادت کہ اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد اس کے بندے اور رسول ہیں، نماز کا قائم کرنا، زکوٰۃ کا ادا کرنا، حج اور رمضان کے روزے]

اور اسی "توحید ربوبیت" کے مقدس فریضہ کی ادائیگی کے لئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تیغ بکف ہوئے

تک کے لئے مامور ہیں۔

"اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰی یَقُوْلُوْا لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ۔"

[مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک لڑتا رہوں جب تک وہ یہ نہ کہیں کہ اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔]

لیکن علامہ نے اسپنگلر کی تقلید میں اسے "یونان بیزاری" میں منحصر کر دیا۔ اسپنگلر نے جدید یورپی ثقافت کا اصل الاصول "یونان بیزاری" (کلاسیکی انداز فکر سے انحراف کلی) بتایا ہے، چنانچہ وہ "انحلال الغرب" میں لکھتا ہے:

"اور اب پہلی مرتبہ کلاسیکی اور مغربی (جدید یورپی تہذیب کی) روحوں کے مابین بنیادی تضاد کا پورے طور پر اندازہ لگانا ممکن ہو سکا ہے۔ تاریخ کے پورے پس منظر میں جو بے شمار شدید اور گہرے تعلقات پر مشتمل ہے، دو اور چیزیں اساسی طور پر ایک دوسرے سے اتنی مختلف نہیں ہیں جتنی کہ یہ دونوں (یونانی کلاسیکی تہذیب اور جدید یورپی تہذیب)۔"

علامہ اقبال کا بھی، جو اصولی طور پر جدید یورپی اور اسلامی ثقافتوں کو ایک ہی سمجھتے ہیں، بلکہ مقدم الذکر کو موخر الذکر کا تسلسل قرار دیتے ہیں، اصرار ہے کہ اسپنگلر نے یورپی ثقافت کے جو مخصوص خصوصی (یعنی یونان بیزاری اور زمانہ کے حقیقی ہونے کا شدید شعور) بتائے ہیں، انھیں اسلام کے اندر بھی خواہی نخواہی ثابت کیا جائے۔ خواہ تاریخ اور قرآن کے مطالعہ سے ان کی تائید ہوتی ہو یا نہ ہوتی ہو۔

غرض قرآن کی روح کے "یونان بیزار" ہونے کا مفروضہ علامہ کے تجدد پسند ذہن کی اختراع ہے اور جب انھیں اس کی تائید میں اسلامی ادب کے اندر کوئی دلیل نہ مل سکی، تو پھر انھوں نے تحکمیت و ادعائیت کا سہارا لیا اور ادعائی طور پر فرما دیا:

"بنیادی طور پر قرآن کی روح کلاسیکیت بیزار (یونان بیزار) ہے۔"

(۱۲) اسلام میں یونان پسندی اور یونان بیزاری کی تاریخی طور پر حد بندی کا مفروضہ | علامہ کی تکفیری سرگرمیوں کا

سب سے تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ ان کے بنیادی مقدمات اکثر حالات میں ان کے تجدد پسند ذہن کی اختراع ہوتے ہیں، جن کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ مگر وہ انھیں کمال ادعائیت و تحکیت کے ساتھ مسلمات بلکہ "بدیہی علوم متعارفہ" بناکر پیش کرتے ہیں۔ پھر ان ادعائی مسلمات پر قیاس آرائیوں کی ایک فلک بوس عمارت قائم کرتے ہیں، جس کا انجام

خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

کا مصداق ثابت ہوتا ہے۔

چنانچہ مثال بالا میں انھوں نے جس وجہ سے بھی ہو، قرآن کی روح "کلاسیکیت بیزاری" (یونان بیزاری) کو قرار دے لیا تاکہ جدید یورپی تہذیب کو اسلامی ثقافت کا خوشہ چین ثابت کر سکیں، حالانکہ قرآن مجید اور اسلام کی بنیادی تعلیمات سے کسی طرح بھی آن کے اس اختراع ذہنی کی تائید نہیں ہوتی۔ مگر علامہ اسے ایک حقیقت نفس الامری سمجھنے پر مصر ہیں۔

اس کے بعد وہ قیاس آرائیوں کا ایک سلسلہ شروع کر دیتے ہیں، جس کا آغاز اس دعوے سے فرماتے ہیں کہ مسلمانوں نے دو سو سال تک اس مزعومہ روح قرآن (کلاسیکیت بیزاری) کے علی الرغم "یونان پسندی" کو اپنایا، حتیٰ کہ قرآن کو بھی یونانی فلسفہ کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

"یہ وہ چیز ہے جسے قرآن کے ابتدائی طالب علموں نے کلاسیکی قیاس آرائی کے زیر اثر پورے طور پر نظر انداز کر دیا۔ وہ قرآن کو یونانی فکر کی روشنی میں پڑھتے اور سمجھتے تھے۔ انھیں اس حقیقت تک پہونچنے میں کہ قرآن کی روح حقیقتاً کلاسیکیت بیزار ہے، دو سو سال لگے۔"

اس قسم کی گلفشانیاں اگر تجدد پسندانِ روزگار میں سے کوئی اور صاحب فرماتے تو چنداں تعجب نہ ہوتا کیونکہ جدید کی ممارست نے انھیں اس قابل ہی نہیں چھوڑا کہ قدیم کا حقیقت پسندانہ

ادراک کرسکیں۔ لیکن جب یہ چیزیں اُس عبقری وقت کے قلم سے نکلتی ہیں جس نے اپنی خداداد صلاحیتوں کا بہترین حصہ "ایران میں مابعد الطبیعیات کا ارتقاء کے عنوان سے اسلام کی فکری تحریکوں کا مطالعہ کرنے میں صرف کیا تھا، تو ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہتی۔ بہرحال

(الف) نہ تو مسلمانوں نے قرآن فہمی کا آغاز یونانی فلسفہ کی روشنی میں کیا، جو دو سو سال کی سعی لاحاصل کے بعد انھیں اپنی ناکامی کا احساس ہوا ہو۔ اور

(ب) نہ یہ بات ہی صحیح ہے کہ دو سو سال تک "یونان پسندی" مسلمانوں کی تفکیری سرگرمیوں کا رہنما اصول رہی اور اس کے بعد انھوں نے "یونان بیزاری" کو اپنا شعار بنایا۔

مزید تفصیل حسب ذیل ہے:

(الف) مسلمانوں میں قرآن فہمی کا آغاز نزول قرآن ہی کے ساتھ ہوا، چنانچہ قرآن باربار رسول اکرم صلی اللہ علیہ سلم کی ذات اقدس کو "تعلیم کتاب وحکمت" کے فریضہ کی بجاآوری کے ساتھ متصف کرتا ہے:

"یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ آیَاتِهٖ وَیُزَکِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَةَ"

[جو ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور اُن کو (عقائد باللہ و اخلاق ذمیمہ سے) پاک کرتے ہیں اور ان کو کتاب (قرآن) اور حکمت (دانشمندی کی باتیں) سکھاتے ہیں]

پھر جس نہج پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو قرآن سمجھایا، اسی نہج پر موخرالذکر نے تابعین کو، تابعین نے تبع تابعین کو اور آخرالذکر نے اپنے بعد آنے والے علماء کو۔

غرض دو سو سال تک مسلمانوں نے قرآن کو صرف "تعلیم نبوت" ہی کی روشنی میں سمجھا اور یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ صحابہ وتابعین اور تبع تابعین میں سے کوئی بھی طبقہ یونانی فلسفہ سے آشنا نہ تھا، قرآن فہمی کے لئے اُس سے استمداد واستعانت کا تو سوال ہی کیا۔ پھر بعثت اسلام سے دو سو سال بعد تک یونانی فلسفہ اسلامی معاشرہ میں مروج بھی نہیں ہوا تھا۔ اُس کی باقاعدہ ترویج تیسری صدی ہجری سے شروع ہوتی ہے۔

غرض علامہ کی یہ قیاس آرائی قطعاً بے بنیاد ہے کہ مسلمانوں نے دو سو سال تک قرآن کو یونانی فلسفے کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی۔

(ب) جہاں تک مسلمانوں کی فکری تاریخ میں "یونان پسندی" اور "یونان بیزاری" کے رجحانات کی تاریخی طور پر تحدید کا تعلق ہے، علامہ کی یہ قیاس آرائی بھی صحیح نہیں ہے کہ اول الذکر مسلمانوں میں دو سو سال تک رائج رہی اور اس کے بعد موخر الذکر (یونان بیزاری) کا رواج ہوا۔

واقعہ یہ ہے کہ اسلامی فکر میں یہ دونوں تحریکیں بیک وقت چلتی رہی ہیں اور زمانی طور پر ان کے درمیان خطِ فاصل کھینچنا ایک لایعنی بات ہے۔ یونانی فلسفہ کے رواج کے بعد اس کے متعلق مفکرین اسلام کے دو موقف تھے اور یہ دونوں بیک وقت ظہور میں آئے۔

بعض لوگوں نے اُن مسائل کو جو اسلام کی تعلیمات سے متصادم تھے، باطل کرنے کی کوشش کی۔ یہ لوگ "متکلمین" تھے اور ان کی فکری سرگرمیاں "علم کلام" کہلاتی ہیں۔ اقبال کی اصطلاح میں یہ گویا "ANTI – CLASSICALISM" کا رجحان تھا۔

لیکن کچھ اور لوگ تھے جنھوں نے فلسفہ کی دلکشی سے مسحور ہو کر یونانی فلسفہ کی روشنی میں اسلامی تعلیمات کی تاویل و توجیہ پر اصرار کیا۔ یہ لوگ "فلاسفۂ اسلام" یا "حکمائے اسلام" کہلائے۔ اقبال کی اصطلاح میں گویا یہ "CLASSICALISM" کی تحریک تھی۔

اس کے بعد ان دونوں تحریکوں کے نمائندوں میں ایک مسلسل کشمکش شروع ہوئی جس سے اسلامی فکر کی ثروت میں بیش بہا اضافہ ہوا۔ چنانچہ علامہ تفتازانی نے لکھا ہے:

ثم لما نقلت الفلسفة عن اليونانية الى	پھر جب فلسفہ یونانی زبان سے عربی زبان میں منتقل
العربية خاض فيها الاسلاميون وحاولوا	ہوا تو مسلمانوں نے اس میں غور و خوض کیا اور جن
الرد على الفلاسفة فيما خالفوا فيه الشريعة	مسائل میں فلاسفہ نے شریعت سے اختلاف کیا
فخلطوا بالكلام كثيراً من الفلسفة ليحققوا	تھا انھوں نے اس کی تردید کا ارادہ کیا۔ اس

مقاصدہا فلیتمکنوا من ابطالہا۔ (شرح عقائد نسفی صفحہ ۶)

طرح فلسفہ کے بہت سے مسائل علم کلام کے ساتھ ملا دیے تاکہ وہ ان کے مقاصد کی تحقیق کر سکیں اور اس طرح ان کے ابطال پر قادر ہو سکیں۔

غرض یہ دونوں تحریکیں جنھیں مروجہ اصطلاح میں "کلام" اور "فلسفہ" کہا جاتا ہے اور علامہ کی اصطلاح میں "کلاسیکیت بیزاری" اور "کلاسیکیت پسندی" کہنا چاہیئے، بیک وقت ظہور میں آئیں اور نہ صرف دو سو سال تک بلکہ تقریباً ایک ہزار سال تک ایک دوسرے کے دوش بدوش چلتی رہیں۔ مگر اس کی تفصیل ایک مستقل پیش کش کی مقتضی ہے۔

بہر حال علامہ کی مزعومہ حد بندی کے دو سو سال تک مسلمانوں میں "یونان پسندی" کی تحریک کو فروغ حاصل رہا اور اس کے بعد "یونان بیزاری" کی تحریک کو، یہ محض ان کے اپنے ذہن کی اختراع ہے، جس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

علامہ نے اپنے مزعومہ فکری انقلاب [یعنی یونان پسندی کی تحریک کے بجائے "یونان بیزاری" کی تحریک کے رواج] کی توجیہ کے باب میں بھی ٹھوس تاریخی شہادتوں کے بجائے ذہنی اختراع کا سہارا لیا ہے۔ انھوں نے یہ مفروضہ تراشا ہے کہ اس انقلاب کا سبب علمی بے اطمینانی تھا۔ فرماتے ہیں:

> "اس بات کے پیش نظر کہ قرآن کی روح ٹھوس واقعات سے اعتنا کرنا ہے اور یونانی فلسفہ کی حقیقت قیاس آرائی ہے جو نظریات تراشی میں مگن رہتا ہے اور حقائق و واقعات سے بے اعتنائی برتتا ہے، اس کوشش کا نتیجہ ناکامی کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا اور اس ناکامی کے نتیجے میں اسلامی ثقافت کی حقیقی روح منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئی۔"

حالانکہ اصل وجہ سیاسی تھی۔ فلسفہ نے مسلمانوں میں آتے ہی اسلام دشمن اعداءیوں اور تخریب کاروں کے ساتھ گٹھ جوڑ کر لیا اور اگلی صدی میں وہ باطنی (قرمطی) کا رکن رکین بن گیا۔ چنانچہ دیلمی نے اس (باطنی مذہب) کے بارے میں لکھا ہے:

"واتفق اهل المقالات ان اول من اسس هذا المذهب المشئوم قوم من اولاد المجوس وبقایا الخرمیة والفلاسفة والیهود"

(قواعد عقائد آل محمد صفحہ ۳۱)

مقالات نویسوں کا اتفاق ہے کہ جن لوگوں نے سب سے پہلے اس مذہب مشئوم کی بنیاد ڈالی، وہ مجوس کی اولاد، خرمی مذہب کے بچے کھچے لوگ فلاسفہ اور یہود تھے۔

خود فاطمی خلیفہ عبید اللہ بن الحسن القیروانی نے سلیمان بن سعید الجنابی کو لکھا تھا:

"واذا اظفرت بالفلسفی فاحتفظ به فعلی الفلاسفة معولنا وانا وایاهم مجمعون"

(الفرق بین الفرق صفحہ ۱۷۷)

اور اگر تمہیں کوئی فلسفی مل جائے تو اس پر ہوشیاری سے نظر رکھو، کیونکہ فلاسفہ ہی پر ہمارا اعتماد ہے اور ہم اور وہ باہم متفق ہیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تفلسف ان اسلام دشمن تحریکوں کا امتیازی شعار بن گیا۔ لہذا حکمراں طبقہ کے ساتھ ساتھ امن پسند شہریوں کا بھی اس کی طرف سے چوکنا، بلکہ بیزار ہو جانا فطری تھا۔ اس وجہ سے فلسفہ، علوم الاوائل اور یونان پسندی عوام و خواص ہر جگہ مبغوض ہو گئی، چنانچہ برنی نے لکھا ہے کہ سید نور الدین مبارک سلطان التمش کے دربار میں وعظ کے اندر فلاسفہ کی مخالفت میں فرمایا کرتے تھے:

"فلاسفہ و علوم فلاسفہ و معتقدات معقولات فلاسفہ را در بلاد ممالک خود بودن نگزارند و علوم فلسفہ را سبق گفتن بای وجہ کان روا ندارند"

اور یہ فلسفہ بیزاری کچھ عہد التمش کے ساتھ مخصوص نہ تھی، بلکہ ممالیک دہلی نے اس روایت کو اپنے غوری و غزنوی پیشرووں سے ورثہ میں پایا تھا۔

(۳) اسلامی علوم کی ترقی میں یونان بیزاری کی کارفرمائی کا مفروضہ | دین اسلام اور اسلامی ثقافت کا اصل الاصول "توحید ربوبیت" ہے جو مرد مومن کو محض ایجابی طور پر ہی عبادت الٰہی کے لئے مامور نہیں کرتا کہ

لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ

(میرے سوا کوئی معبود ہونے کے لائق) نہیں۔ پس میری ہی عبادت کیا کرو)

بلکہ بالتصریح غیر اللہ کی عبادت کی بھی ممانعت کرتا ہے :

"وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ"

[اور تیرے رب نے حکم کر دیا ہے کہ بجز اس کے کسی اور کی عبادت مت کرو]

بالفاظ دیگر اللہ رب العزت کے سوا انسان کا کوئی آقا نہیں سب اس کے محکوم ہیں، دنیا کی ہر چیز اس کے واسطے بنائی گئی ہے۔ اس تعلیم کا منطقی نتیجہ تھا کہ پیروان اسلام کائنات کے سامنے بھکاری کی حیثیت سے نہیں، بلکہ شکاری کی حیثیت سے جائیں اور اس کی ظاہر و پوشیدہ قوتوں کو قابو میں کر کے اپنے مقصد کے مطابق استعمال کریں۔ اس کا نام "تسخیر کائنات" ہے، جس کے لئے قرآن بار بار ہمت افزائی کرتا ہے :

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً (لقمان ـــ ۲۰)

[کیا تم نے نہ دیکھا کہ اللہ نے تمھارے کام میں لگائے جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہیں اور تمھیں بھر پور دیں اپنی نعمتیں ظاہر اور چھپی۔]

لیکن کائنات کی زندہ اور بے جان قوتوں کی تسخیر ان سے براہ راست کشتی لڑ کر نہیں کی جا سکتی۔ یہ صرف کائنات کی پوشیدہ قوتوں کی واقفیت ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔ اس کا نام "علم طبیعی" اور نیچرل سائنس ہے۔ یہ حکمت مرد مومن کی متاع گم گشتہ ہے جسے وہ حسب فرمان رسول :

"كلمة الحكمة ضالة المؤمن اينما وجدها فهو احق بها"

جہاں ملے لے لینے کا حقدار ہے۔

اسی جذبے کے تحت انھوں نے یونان کا علمی و حکمی سرمایہ تلاش کیا۔ لیکن انھوں نے دوسروں کے تحقیق کئے ہوئے علوم ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اپنے ملی سوز دروں اور حسن طبیعت سے "قُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا" کی تعلیم کے زیر اثر، ان کے اندر چار چاند لگائے اور جہاں تک اُن کے یونانی پیشرو نہیں پہونچے تھے پہونچنے کی کوشش کی اور اکثر حالات میں پہونچ کر دم لیا۔

یہ ہے اسلامی ثقافت کا اجمالی جائزہ۔ مگر علامہ اقبال کا خیال ہے کہ اسلامی ثقافت یونانی علوم کی افادیت سے مسلمانوں کی مایوسی کا نتیجہ ہے۔ اس لئے مختلف اسلامی علوم بالخصوص علومِ عقلیہ نے یونانی فکر کے خلاف مسلمان مفکرین کی ذہنی بغاوت کے نتیجہ میں ترقی کی۔ فرماتے ہیں:

"اس بات کے پیشِ نظر کہ قرآن کی روح ٹھوس واقعات سے اعتنا کرنا ہے اور یونانی فلسفہ کی حقیقت قیاس آرائی ہے، جو نظریات تراشی میں مگن رہتا ہے اور حقائق و واقعات سے بے اعتنائی برتتا ہے، اس کوشش کا نتیجہ ناکامی کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا اور اس ناکامی کے نتیجے میں "اسلامی ثقافت" کی حقیقی روح منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئی۔

یونانی فلسفہ کے خلاف اس عقلی بغاوت کا اظہار فکر کے جملہ شعبوں میں نمودار ہوا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ میں اس بات کی تفصیل کا اہل نہ ہو سکوں گا کہ ریاضی و ہیئت اور طب میں اس کا کس طرح ظہور ہوا۔ یہ اشاعرہ کے مابعد الطبیعی تفکیر میں بالکل واضح ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ اس تنقید میں عیاں ہے، جس کے ساتھ مسلمانوں نے یونانی منطق پر تبصرہ کیا۔"

لیکن علامہ کے یہ افادات حقیقت سے مطابقت نہیں رکھتے، کیونکہ:

الف۔ یونانی پیشروؤں سے مسلمان فضلاء کا اختلاف "بغاوت" نہیں تھا، بلکہ اُن کی دریافتوں پر اصلاح و ترقی کے مترادف تھا۔

ب۔ اشاعرہ کے مابعد الطبیعی تفکیر یونانی فلسفہ کے خلاف بغاوت کا نتیجہ نہیں تھی۔ بلکہ یہ نتیجہ تھی اُس عہد کے "تکافوءِ ادلہ" اور خود امام اشعری کی "سخت پسندی" کا۔

ج۔ مسلمانوں کی منطق جو شیخ بوعلی سینا کے زمانہ سے "سلم العلوم" کے متاخر شراح اور ان کی شروح کے محشیوں کے زمانہ تک رائج رہی، یونانی (ارسطاطالیسی) منطق کی تنقید نہیں ہے، بلکہ اس کی توضیح ہے۔ یہی ارسطاطالیسی منطق (اور اسی طرح دوسرے فلسفیانہ علوم) پر تنقید و نکتہ چینی تو یہ کام ارسطو کے باغیوں نے نہیں کیا۔ یہ کارنامہ تھا دوسرے متبادل حریفانہ نظامہائے فکر کے علمبرداروں کا۔

مزید تفصیل حسب ذیل ہے :

(الف) تعجب ہے علامہ ایک بالغ النظر فلسفی ہونے کے باوجود EVOLUTION اور REVOLUTION میں امتیاز کی کماحقہ مراعاۃ نہ کر سکے۔ کسی علم کے EVOLUTION یا ترقی و ارتقا میں ہر منزل پر اس کے بنیادی مقدمات جوں کے توں برقرار رہتے ہیں۔ لیکن جب اُس میں REVOLUTION یا انقلاب آتا ہے تو پچھلی منازل کے بنیادی مقدمہ کو مسترد کر دیا جاتا ہے اور اس کے بجائے اس کے مخالف یا متضاد بنیادی مقدمہ کو اساسی حیثیت دے دی جاتی ہے ۔ اس حیثیت سے فضلائے اسلام کی علمی کاوشیں یونانی علوم کے ارتقا و ترقی کا دوسرا نام ہیں، کیونکہ انھوں نے ان علوم کے بنیادی مقدمات کو کبھی معرض بحث میں لانے کی جرأت نہیں کی ۔

مثلاً ہیئت میں یونانی فلکیات کا بنیادی اصول یہ ہے کہ زمین کائنات کے مرکز میں واقع ہے اور تمام اجرام سماوی اس کے گرد چکر لگاتے ہیں ۔ احمد بن محمد النہاوندی (جو ہارون الرشید کے عہد میں تاریخ اسلام کی پہلی رصدگاہ جندی سابور کا متولی تھا ، زمانہ آٹھویں صدی مسیحی کا آخر) کے وقت سے لے کر "زیج محمد شاہی" کے مرتبین کے وقت تک (زمانہ اٹھارویں صدی مسیحی) جملہ مسلمان ہیئت دان اسی اصول پر عمل پیرا رہے ۔ ترقی انھوں نے اس علم کو ضرور دی مگر یہ ترقی "ارتقا" یا EVOLUTION کی مصداق تھی ۔

انقلاب یا REVOLUTION کی مثال کوپرنیکس کا جدید ہیئتی نظام ہے جو ارسطا طالیسی ۔ بطلیموسی "ارض مرکزی نظریہ" کے برخلاف اس اصولی نظریہ پر قائم ہے کہ زمین ساکن نہیں ، بلکہ متحرک ہے اور دوسرے اجرام سماوی کے ساتھ ساتھ سورج کے گرد چکر لگاتی ہے [اور یہ نظام شمسی کسی اور مرکز کے گرد]

اسی طرح یونانی طب کا بنیادی اصول "نظریۂ اخلاط" تھا ۔ یہی اصول شروع سے آخر تک تمام مسلمان اطبا کی طبی کاوشوں کا مبنیٰ علیہ بنا رہا ۔ انھوں نے فن طب میں جو بھی ترقی کی وہ

وہاں کے ماہرین نے "نظریہ اخلاط" کو مسترد کر کے اس کی جگہ "بیکٹیریا" یا "نظریہ جراثیم" کو دیدی۔ یورپ کے ڈاکٹروں نے جو کچھ کیا اُسے بجا طور پر یونانی طب کے خلاف "بغاوت" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، مگر مسلمانوں کی کاوشوں کو اس نام سے تعبیر کرنا "وضع الشئ فی غیر محلہ" ہوگا۔

(ب) اشاعرہ امام ابوالحسن الاشعریؒ کے پیرو ہیں جو پہلے خود ایک بہت بڑے معتز[لی] تھے لیکن بعد میں اعتزال سے تائب ہو گئے اور اہل السنت والجماعت میں آملے۔ ان کی یہ [اعتزال] سے تو بغاوت کہی جا سکتی ہے۔ مگر اعتزال "CLASSICALISM" یا "یونان پسندی" [کا] نام نہیں تھا، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اسے خود یونانی فلسفہ کے ردّ و ابطال کا بہت بڑا شرف پہونچتا [ہے]۔ امام اشعری نے معتزلہ سے "رویت باری کے انکار" "کلام باری کے مخلوق ہونے کے عقیدے" "المنزلۃ بین المنزلتین" وغیرہ مسائل میں بغاوت کی تھی۔ مگر جہاں تک یونانی فلسفہ کے نقض و ترد[ید] کا تعلق ہے، اس باب میں وہ اپنے معتزلی پیشروؤں کے مخالف فلسفہ تنقیدی سرگرمیوں کا پورا ورثہ لے کر تائب ہوئے تھے۔ اشاعرہ کے یہاں یونانی فلسفہ سے جو کچھ اختلاف ہے، اس میں ان فلاں کاوشوں کا دخل نہیں ہے۔ اور متاخر اشاعرہ نے فلسفہ کا اگر کوئی رد و ابطال کیا تو یہ شیخ بوعلی سینا کا فلسفہ تھا۔ مگر علامہ اقبال ہوں یا ان کے انداز فکر پر سوچنے والے دیگر متجددین عہد، بوعلی سینا کی کاوشوں کو قطعاً ابتکار فکر سے تہی دامن سمجھتے ہیں۔ لہٰذا اگر وہ امام غزالی یا امام رازی کے نقوض و ردود کو ارسطو کی تنقید سمجھ لیں تو معذور رہیں۔

(ج) لیکن منطق کے متعلق علامہ نے بڑے وثوق سے فرمایا ہے:

"لیکن یونانی فلسفہ کے خلاف یہ عقلی بغاوت سب سے زیادہ وضاحت کے ساتھ اُس تنقید میں عیاں ہے، جس کے ساتھ مسلمانوں نے یونانی منطق پر تبصرہ کیا۔"

یونانی منطق سے مسلمان فضلاء کے اختلاف نے دو شکلیں اختیار کی تھیں:

پہلی شکل کھلی ہوئی مذمت کی تھی۔ یہ محدثین کرام کا مسلک تھا جو شروع ہی سے غیر اسلامی [illegible]

گروہ میں محدث ابن صلاح، حافظ ابن تیمیہؒ اور امام سیوطی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں مگر یہ حضرات یا ان کے اسلاف یونانی منطق (و فلسفہ) کے پیرو کب تھے، جو ان کی مذمت اور مخالفت کو "بغاوت" کہا جا سکے۔

دوسری شکل منطق کی علمی اور سائنٹفک تنقید تھی۔ اس سلسلے میں چار مکاتب فکر آتے ہیں:

۱۔ متکلمین
۲۔ اشراقیین
۳۔ بعض مشائین (ارسطاطالیسی فلسفہ کے پیرو) جیسے ابو البرکات بغدادی اور
۴۔ بوعلی سینا کے مخالف ناقدین جیسے ابن رشد، عبد اللطیف بغدادی، نجم الدین نخجوانی وغیرہ۔

متکلمین اور اشراقیین کا منطق کے بارے میں پہلے ہی سے اپنا اپنا مستقل نظام تھا جو یونانی منطق سے بالکل آزاد رہ کر، بلکہ ارسطاطالیسی منطق کے مسلمانوں میں رائج ہونے سے پہلے ہی منظم ہو چکا تھا۔ یہ دونوں گروہ یونانی، ارسطاطالیسی منطق کے پیرو ہی نہیں رہے۔ لہٰذا ان کی مخالفت کو یونانی منطق سے بغاوت کس طرح کہا جا سکتا ہے۔ یہ تو اپنے اپنے مکتب فکر کے تفوق کی کوشش تھی۔

اسی طرح ابن رشد اور عبد اللطیف بغدادی وغیرہ کی تنقیدی سرگرمیاں بوعلی سینا کے خلاف تھیں۔ ارسطو کے خلاف نہیں تھیں۔

اب لے دے کے صرف ابو البرکات بغدادی کا نام رہ جاتا ہے۔ اس نے "کتاب المعتبر" میں قدیم منطق کے مسلمات پر ضرور اعتراضات وارد کئے ہیں اور بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ارسطو کے خلاف بغاوت کر رہا ہے مگر قاضی نور اللہ شوستری نے محقق طوسی کی تعریف میں جو کچھ لکھا ہے اس

[illegible]

محقق طوسی کی تعریف میں لکھتے ہیں:

"معالم تحقیقات ابوعلی را کہ بتصادم شبہات ابوالبرکات بودی وتشکیکات فخرالدین رازی نزدیک باندراس رسیدہ بود، ازغایت علوحکمت وکمال ادراک استدراک نمود۔"

(مجالس المومنین صفحہ ۳۲۹)

غرض اسلام میں منطق کی ترقی، جونام ہے متاخرین کے متقدمین سے اختلاف کرنے کا یا معاصر کے حریفانہ تصادمِ افکار کا، تمام تر یونانی منطق کے خلاف عقلی بغاوت کا نتیجہ نہیں تھی، بلکہ بہت کچھ متبادل حریفانہ نظامہائے فکر کے اصطدام آرا نیز خود مسلمان منطقیوں کی باہمی چشمک پر مشتمل تھی۔

(۴) دنیائے ریاضیات کے سکون میں محقق طوسی کے تلاطم برپا کرنے کا مفروضہ | ریاضیات میں مسلمانوں کی سرگرمیوں کے بارے میں

علامہ نے حسب ذیل وضاحت فرمائی ہے:

"جہاں تک ریاضیات کا تعلق ہے، یہ یاد رکھنا چاہئے کہ بطلیوس (۸۷ - ۱۶۵ء) کے زمانہ سے نصیر طوسی (۱۲۰۱ــــ ۱۲۷۴ء) کے زمانہ تک کسی نے بھی اُن دقتوں کی طرف سنجیدگی سے غور نہیں کیا جو (اصول) اقلیدس کے خطوط متوازی کے مصادرے کی صحت کو مکان حسی کی بنیاد پر ثابت کرنے میں مضمر ہیں۔ یہ (محقق) طوسی ہی کی ذات تھی جس نے اس سکون میں جو ہزار سال سے دنیائے ریاضیات پر طاری تھا، تلاطم برپا کیا۔ محقق طوسی نے اس مصادرے کی اصلاح کی کوشش میں مکان کے حسی تصور کو ترک کرنے کی ضرورت کا احساس کیا۔ اس طرح انھوں نے ہمارے زمانہ کی فضائے کثیر الجہات کی تحریک کے لئے ہر چند کہ وہ کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو، بنیاد فراہم کی۔"

علامہ کا یہ ارشاد تین دعووں پر مشتمل ہے:

الف۔ ریاضیات کی دنیا بطلیموس کے زمانہ سے [illegible] پہلی مرتبہ

اس میں تلاطم برپا کیا

ب۔ اقلیدس کے "مصادر متوازی خطوط" کی اصلاح کے واسطے محقق طوسی نے مکان کے روایتی تصور کو ترک کر کے نیا تصور پیش کیا۔

ج۔ محقق طوسی نے اس نئے تصور مکان کے ذریعہ عہد حاضر کی "فضائے کثیر الجہات" کی تکفیر کا افتتاح کیا۔

لیکن علامہ کے یہ افادات ناقابل تسلیم ہیں۔ ایسا اندیشہ ہوتا ہے کہ اتنے اہم مسئلے کے حل میں انھوں نے اس ذمہ داری کو ملحوظ نہیں رکھا جو ان جیسے بالغ النظر محقق سے بجا طور پر متوقع کی جاتی تھی۔ اس کے برعکس انھوں نے انتہائی سطحی معلومات جو غالباً انھیں مستشرقین کی "تحقیقات انیقہ" سے حاصل ہوئی تھیں، اعتماد کر لیا۔

مزید تفصیل حسب ذیل ہے:

(الف) علامہ نے ریاضیات کی دنیا کے جس سکون و تلاطم کا ذکر کیا ہے، اس کی کیفیت یہ ہے:

اصول اقلیدس کی بنیاد چند علوم متعارفہ، اصول موضوعہ اور کچھ مصادرات پر ہے۔ ان میں سب سے زیادہ معرکۃ الآرا اقلیدس کا پانچواں مصادرہ تھا جو "خطوط متوازی کا مصادرہ" بھی کہلاتا ہے۔ اقلیدس نے اسے "مصادرہ" قرار دیا تھا۔ مگر بعد کے لوگوں نے اسے "شکل اثباتی" کہا اور دیگر اشکال کی طرح اسے بھی ثابت کرنے کی کوشش کی۔ یورپی ماہرین تاریخ ریاضیات کا خیال ہے کہ یونانیوں میں آخری شخص جس نے یہ کوشش کی وہ بطلیوس (۸۷۔ ۱۶۵ء) تھا۔ اس کے بعد بقول ان یورپی فضلاء کے نہ تو کسی یونانی ریاضی داں نے پانچ سو سال (بعثت اسلام) تک یہ کوشش کی اور نہ محقق طوسی سے پہلے کسی مسلمان ریاضی داں نے۔ اس طرح بطلیوس کے ہزار گیارہ سو سال بعد تک دنیائے ریاضیات پر بقول فضلائے یورپ کے ایک جمود طاری رہا تا آنکہ ساتویں صدی ہجری (تیرھویں صدی مسیحی) کے وسط میں محقق طوسی نے اس مصادرے کو ثابت کرنے کی کوشش کی۔

[لیکن مستشرقین اور دیگر مورخین ریاضیات نے خود محقق طوسی کے پیش کردہ "خطوط متوازی کے مصادرہ" کے ثبوت کے بیان میں جو گل فشانیاں فرمائی ہیں، خوف تطویل اس کی تفصیل سے مانع ہے۔ مختصراً اتنا سمجھنا کافی ہوگا کہ سب سے پہلے یورپی فاضل نے جس کے پاس ۱۵۹۵ء میں اصول اقلیدس کا مطبوعہ نسخہ تبصرہ کے لئے بھیجا گیا تھا، اس کے بارے میں فرمایا تھا:

"وہ اس کتاب کے بارے میں صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہے، جتنا کوئی شخص اس کتاب کے بارے میں کہنے کا مجاز ہے جسے اس نے کبھی نہیں پڑھا۔"

اس سے بعد کے لال بجھکڑوں کی گل فشانیوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے ؏

قیاس کن ز گلستانِ من بہار مرا]

بہر حال یورپی فضلاء ہوں یا ان کے مقلد علامہ اقبال، واقعہ یہ ہے کہ محقق طوسی سے پہلے کم از کم دس مسلمان ریاضی دانوں نے سنجیدگی کے ساتھ اس مصادرے کو ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان میں سے تین ریاضی دانوں عباس بن سعید الجوہری، ابن الہیثم اور عمر خیام کی کاوشوں کا تفصیلی طور پر خود محقق طوسی نے اپنی کتاب "الرسالۃ الشافیہ" میں ذکر کیا ہے۔ عمر خیام کی "شرح ما اشکل من مصادرات اقلیدس" جس میں اس نے اس مصادرہ کا ثبوت دیا ہے شائع ہوگئی ہے۔ ابن الہیثم کی "شرح مصادرات اقلیدس" اور "حل شکوک اقلیدس" جن میں اُس نے "خطوط متوازی کے مصادرہ" کا بدل پیش کیا ہے، ابھی مخطوطہ کی شکل میں موجود ہیں۔ مقدم الذکر کے نسخے آکسفورڈ، فیض اللہ پاشا اور رضا لائبریری رامپور میں موجود ہیں۔ موخر الذکر کا ایک نسخہ اسلامیہ کالج پشاور کی لائبریری میں موجود ہے۔

غرض ان ریاضی دانوں میں قدیم ترین نام عباس بن سعید الجوہری کا ہے، جس نے ۸۳۰ء کے قریب اس مصادرہ کا ثبوت دیا تھا، یعنی محقق طوسی سے ساڑھے چار سو سال پہلے۔

(ب) محقق طوسی کا نیا "تصور مکان" اقلیدس کے "خطوط متوازی کے مصادرہ" سے کوئی تعلق

نہیں رکھتا۔ انھوں نے بھی اپنے پیشروؤں کی طرح اس مصادرہ کو "مکان حسی" ہی کی بنیاد پر ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔

یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ جس چیز کو علامہ اقبال محقق طوسی کا "نیا تصورِ مکان" بتاتے ہیں وہ بُعد "بُعدِ مجرد" کا تصور تھا۔ مگر اس کی دریافت کا شرفِ اولیت بھی محقق طوسی کو نہیں پہونچتا، بلکہ ان کے پیشروؤں کو پہونچتا ہے۔ چنانچہ محقق طوسی کے رمز شناس شاگرد و شارح علامہ حلی نے محقق طوسی کی "تجرید الکلام" کی شرح میں لکھا ہے کہ محقق طوسی سے پہلے ہی افلاطون اور ابوالبرکات بغدادی کا مذہب رہ چکا ہے:

"الذی علیہ المحققون امران: احدھما البعد المساوی لبعد المتمکن وھذا مذھب افلاطون..... وقد اختار المصنف الاول وھو اختیار ابی البرکات۔"

(شرح تجرید از علامہ حلی: بحث مکان)

جس امر پر محققین کا اتفاق ہے، وہ دو باتیں ہیں: یا تو (مکان نام ہے) اُس بعد (مجرد) کا جو متمکن کے مساوی ہو اور یہ افلاطون کا مسلک ہے...... اور مصنف (محقق طوسی) نے اسی پہلے مذہب کو اختیار کیا ہے اور اسی مذہب کو (اُن سے پہلے) ابوالبرکات بغدادی نے اختیار کیا تھا۔

(ج) محقق طوسی کے اس منفرد "تصورِ مکان" اور اسی طرح اُن کے "خطوطِ متوازی کے مصادرہ" کے اثبات کی کوشش کا عہدِ حاضر کی "فضائے کثیر الجہات کی تحریک" سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن اس کی تفصیل ایک جداگانہ اور مستقل پیش کش کی متقاضی ہے۔

یہ ایک مختصر جائزہ ہے علامہ کی گلفشانیوں کا۔ لیکن اگر دقتِ نظر کے ساتھ اس کے اسباب و علل کا تجزیہ کیا جائے تو اس کی تہہ میں دو عامل کارفرما نظر آئیں گے۔

۱۔ یورپی ثقافت کی عظمت و برتری سے ذہنی مرعوبیت: اس کا نتیجہ ہے کہ وہ یورپی تہذیب کی ہر مزعومہ خوبی اور اُس کے ہر انفرادی وصف کو قرآن اور اسلام کی بنیادی تعلیم قرار دیدیتے ہیں۔ اوپر ذکر آچکا ہے کہ اسپنگلر نے جدید یورپی تہذیب کا "اصل الاصول" "کلاسیکیت بیزاری"

"ANTI - CLASSICALISM" بتایا ہے۔ علامہ نے بھی قرآنی تعلیمات کی روح کو اس کی "کلاسیکیت بیزاری" میں منحصر فرما دیا ہے۔

اسی طرح اسپنگلر نے یورپی تہذیب کی انفرادیت کا راز "زمانہ کے احساس شدید" میں مضمر بتایا تھا، علامہ بھی خواہی نخواہی اسے قرآن کریم کی بنیادی تعلیم قرار دیتے ہیں۔

۲۔ مگر اس سے زیادہ بنیادی سبب اسلامی فکر کے "ORIGINAL SOURCES" کے بجائے مستشرقین اور دیگر فضلائے مغرب نے اس کی جو توجیہ و تعبیر کی ہے، اس پر ان کا غیر مشروط اعتماد ہے، اس کی مثال ابھی گزری "مصادرہ توازی خطوط" کا اثبات یا اُس کے بدل کی تلاش قدیم وجدید ماہرین علم الہندسہ کا بڑا محبوب علمی مشغلہ رہا ہے۔ لیکن مورخین ریاضیات نے اس ضمن میں مسلمانوں کے اندر صرف ایک ہی فاضل کا نام گنایا ہے اور وہ ہے، محقق نصیر الدین طوسی حالانکہ خود محقق طوسی نے اپنے فاضلانہ رسالہ "الرسالۃ الشافیہ" میں اپنے سوا تین اور مہندسین اسلام کے نام گنائے ہیں، جنھوں نے اس مسئلہ پر بڑی سنجیدگی سے غور و خوض فرمایا تھا مگر علامہ کی عجلت فرمائی نے اس مسئلہ کے اصل اور معتمد علیہ مآخذ کے بجائے مستشرقین و فضلائے مغرب کی "تحقیقات انیقہ" ہی پر تکیہ فرما لیا۔ اور پھر اس پر اس شدت کے ساتھ اصرار کیا کہ محقق طوسی کے پیشرو مسلمان ماہرین علم الہندسہ کی ساری ہندسی تحقیقات کالعدم ہو گئیں۔

یہ اس عاجز ہی کی رائے نہیں ہے بلکہ دیگر فضلائے عہد کا بھی یہی خیال ہے۔ چنانچہ علامہ کے استاد بھائی پروفیسر ایم ایم شریف صاحب سابق پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ علامہ کی مشہور کتاب

"DEVELOPMENT OF METAPHYSIC IN PERSIA"

کے نئے اڈیشن کے تعارف میں، جسے کچھ دن ہوئے بزم اقبال لاہور نے شائع کیا تھا، فرماتے ہیں:

"IN HIS OBSERVATIONS REGARDING AL FARABI, IBNE - MASKWAIH AND IBNE-SINA HE HAS

MORE OR LESS ECHOED THE VIEWS OF EARLY WESTERN ORIENTALISTS AND HAS DENIED THESE GREAT THINKERS THE CREDIT FOR ORIGINALITY AND DEVATION FROM NEO-PLATONIOM.

THERE IS NO DOUBT THAT IF HE WERE TO REWRITE THE WORK, HE WOULD HAVE DIFFERENTLY EVALUATED THEIR PHILOSPHICAL EFFORTS."

[فارابی، ابن مسکویہ اور ابن سینا پر اقبال کا تبصرہ کم وبیش مستشرقین مغرب کے آرا کی صدائے بازگشت ہے۔ انھوں نے ان مفکرین عظام کو اس شرف سے محروم کر دیا ہے جس کے وہ اپنے کارفکر اور نو فلاطونیت سے انحراف کی بنا پر مستحق تھے]

ان عوامل کا نتیجہ ہے کہ علامہ کے افادات بعض اوقات بڑی مضحکہ خیز شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ اسلامی فکر کے اساطین کے کام تو درکنار ان کے نام بھی صحیح طور پر پیش نہیں کر پاتے۔ متاخر مفکرین اسلام میں میر باقر داماد اور ان کی "الافق المبین" خاص شہرت کے حامل ہیں۔ وہ صدرائے شیرازی (مصنف "شرح ہدایہ الحکمہ" یا "صدرا") کے استاد تھے۔ تصور زماں کے سلسلے میں ان کا نظریہ "حدوث دہری" خاص اہمیت رکھتا ہے جس سے ملا محمود جونپوری نے "شمس بازغہ" میں سخت اختلاف کیا ہے۔ یہ (حدوث دہری کا نظریہ) میر باقر داماد کا خاص کارنامہ ہے۔ ویسے اس سلسلہ میں انھوں نے افلاطون کا قول بھی نقل کیا ہے کہ زمانہ فلک کے ساتھ وجود میں آیا ہے۔

مگر علامہ ہیں کہ میر باقر داماد کے کام کی ترجمانی تو درکنار، ان کے "نام" سے بھی صحیح طور پر واقف

معلوم نہیں ہوتے اور انتہائی مضحکہ خیز طور پر ایک "میر باقر داماد" کی واحد شخصیت کی دو شخصیتیں "ملا باقر" اور "میر داماد" بنا دیتے ہیں اور پھر ان دونوں خود ساختہ شخصیتوں کے لئے بصیغہ جمع ضمیر "THEY" استعمال فرماتے ہیں۔ فیا للعجب۔

اس سے زیادہ افسوسناک اُن مدعیان تصوف کی ذہنیت ہے جن کی کورانہ عقیدت مندی تلخ حقائق کو سن کر تلملا اٹھتی ہے اور سنجیدہ علمی تحقیق وتنقید کے بجائے جہلا کے اطالت لسان کا سہارا ڈھونڈ لیتی ہے۔ شاید انھیں یہ بھی معلوم نہ ہو کہ اسی اقبال نے جب انتہائی بیدردی کے ساتھ ان کے تصوف بالخصوص عقیدۂ وحدت الوجود کے پرخچے اُڑائے تھے تو بڑی بڑی خانقاہوں میں زلزلہ آگیا تھا۔

ایک گمنام دار العلوم

از جناب الحاج سید محبوب صاحب رضوی دیوبند

موجودہ زمانے میں جس طرح سے اسکولوں اور کالجوں کے لئے عمارتیں بنانے اور ان کے لئے ساز و سامان جمع کرنے کا دستور ہے۔ ہمارے قدیم نظام تعلیم میں اس کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی تھی۔ اسلام مسلمانوں کو سادہ زندگی بسر کرنے کی تعلیم دیتا ہے، مسجد نبوی جو سب سے پہلی مسجد ہے درس گاہ کا کام بھی دیتی تھی، اس کے بعد جتنی مسجدیں بنائی گئیں وہ گویا مدارس بھی تھے، حکومتوں کی سرپرستی کے علاوہ خود مسلمانوں کا ذوقِ علم جو انھیں آبا و اجداد سے وراثت میں ملا تھا حکومتوں کے خزانے کا بہت کم ممنونِ احسان رہا ہے، ہماری قدیم تعلیم گاہیں اپنے لئے مستقل عمارتوں کی محتاج نہ تھیں، بالعموم مسجدوں، خانقاہوں اور علماء و امراء کے مکانات میں تعلیم و تعلّم کی بزم آراستہ رہتی تھی، خاص طور پر نامور علماء اپنے گھروں یا مسجدوں میں تعلیم دیتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد:

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ وَّ مُسْلِمَةٍ　　علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے۔

کی تاکید نے حصولِ علم کا عام ذوق پیدا کر دیا تھا، علم کی اشاعت، تعلیم و تعلّم، طلباء کی امداد و اعانت، کتابیں، ضروریات درس و تدریس کی فراہمی، مدارس کی تاسیس اور ان کے مصارف کے لئے جائدادوں کا وقف کرنا، علماء اور طالبانِ علم کی مالی امداد و اعانت موجب خیر و برکت اور

فلاحِ دارین کا باعث سمجھا جاتا تھا، علم کی اشاعت اور اس کی ترقی کے لئے وسائل مہیا کرنا دوسری عام ضروریات کی طرح ان کی زندگی کا لازمی اور ضروری جزو بن گیا تھا۔

اس دور میں چونکہ یہ کام عموماً مسجدوں سے بسہولت لیا جاتا تھا اس لئے قدیم مساجد میں اکثر وبیشتر ایسی عمارتیں ضرور بنائی جاتی تھیں جو درس وتدریس اور طلباء کے قیام کے لئے کام میں آسکیں اس بارے میں مسجد نبوی کا نمونہ مسلمانوں کے سامنے تھا۔ مصر میں جامع ازہر اور مراکش میں جامع قزوین اور جامع زیتونیہ اسی طرز کی مسجدیں ہیں، خود ہندوستان کے شہروں اور قصبات میں بکثرت ایسی مسجدیں اب تک موجود ہیں جن کے صحن کے تین طرف چھوٹے بڑے حجروں اور دالانوں کا وسیع سلسلہ نظر آتا ہے، دہلی میں مسجد فتح پوری اور جون پور کی اٹالہ مسجد ہزاروں لاکھوں میں چند مثالیں ہیں، یہ مسجدیں اپنے وقت کی عظیم درس گاہیں بھی تھیں، آخری دور میں دار العلوم دیوبند بھی اولاً چھتے کی قدیم مسجد ہی میں قائم ہوا تھا۔

اس زمانے میں طلباء کے قیام وطعام کا جو عوامی طریقہ رائج تھا اس کی نسبت مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے مآثر الکرام میں لکھا ہے:

صاحبِ توفیقان ہر معمورہ طلبۂ علم را نگاہ می دارند وخدمت ایں جماعت را سعادتِ عظمیٰ می دانند[1]	صاحبِ استطاعت ہر آبادی میں طالبانِ علم پر متوجہ رہتے تھے وہ طلبہ کی امداد واعانت کو اپنے لئے بڑی سعادت سمجھتے تھے

عام خیال یہ ہے کہ اسلام کی علمی تاریخ میں موجودہ شکل کے باقاعدہ مدارس کی ابتدا پانچویں صدی ہجری میں نیشاپور اور بغداد کے درس نظامیہ سے ہوئی ہے جن کو نظام الملک طوسی (متوفی ۴۸۵ھ/۱۰۹۲ء) نے قائم کیا تھا، لیکن تاریخ کے صفحات میں ان دونوں سے پہلے دو ایسے مدرسوں کا نشان ملتا ہے جو گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں، ان میں سے ایک کو

---

[1] مآثر الکرام ص ۲۲۳

سلطان محمود غزنوی (۳۸۹ھ/۹۹۹ء - ۴۲۱ھ/۱۰۳۰ء) نے ۴۱۰ھ/۱۰۱۹ء میں قائم کیا تھا۔ اور دوسرے کو مصر کے حکمراں الحاکم بامر اللہ (۳۸۶ھ/۹۹۶ء - ۴۱۱ھ/۱۰۲۰ء) نے جاری کیا تھا۔

ابو القاسم فرشتہ نے لکھا ہے کہ ۴۱۰ھ/۱۰۱۹ء میں سلطان محمود غزنوی نے اپنے پایۂ تخت غزنی میں ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کرائی جو اپنی وسعت و عظمت، شان و شکوہ اور حسن و نفاست کے لحاظ سے "عروسِ فلک" کے نام سے موسوم تھی، مسجد کے ساتھ سلطان نے ایک مدرسہ بھی تعمیر کرایا تھا، نیز اس مدرسہ کے ساتھ کتب خانہ بھی قائم کیا گیا تھا جو ہر قسم کی کتابوں سے معمور تھا مسجد اور مدرسہ کے اخراجات کے لئے سلطان نے بہت سے دیہات وقف کر دیئے تھے، فرشتہ کے الفاظ یہ ہیں:

در جوار آں مسجد مدرسہ بنا نہادہ و بنفائس کتب و غرائب نسخ موشح گردانیدہ، دیہات بسیار بر مسجد و مدرسہ وقف فرمود[1]

مسجد کے قریب مدرسہ قائم کیا، مدرسہ کے کتب خانہ میں عمدہ اور کم یاب کتابیں جمع کیں، مسجد اور مدرسہ کے اخراجات کے لئے بہت سے دیہات وقف کر دیئے۔

لیکن مصر میں "عروس فلک" سے چند سال پہلے ایک دار العلوم قائم ہو چکا تھا، علامہ مقریزی نے کتاب الخطط میں تفصیل سے اس دار العلوم کے حالات بیان کئے ہیں، لکھا ہے کہ جمادی الآخر ۳۹۵ھ/۱۰۰۴ء میں الحاکم بامر اللہ نے ایک دار العلوم جس کا نام دار الحکمت تھا جاری کیا، نامور محدثین، فقہاء، قراء اور ہیئت، نحو، لغت، طب، منطق اور ریاضی کے ماہرین اساتذہ بڑی کثرت سے اس دار الحکمت میں ملازم رکھے گئے تھے جو اپنے اپنے فن کے طلباء کو ماہرانہ تعلیم دیتے تھے۔ الحاکم بامر اللہ نے خود اپنے کتب خانہ کی تمام کتابیں دار الحکمت کے لئے وقف کر دی تھیں، ہر قسم کے علوم و فنون کی کتابوں سے یہ کتب خانہ معمور تھا۔ بعض کتابیں مشہور کاتبوں کے

---

[1] تاریخ فرشتہ ص ۳۰ مطبوعہ نول کشور لکھنؤ

ہاتھ کی لکھی ہوئی تھیں، مدرسہ اور کتب خانہ میں زر دوزی قالینوں کا فرش بچھایا جاتا تھا کتنے ہی محافظ، خدام اور فراش وغیرہ انتظام کے لئے مقرر تھے۔

طلبار کے لئے کاغذ، قلم دوات وغیرہ کو ہر وقت مہیا رکھا جاتا تھا، الحاکم بامر اللہ ہر ایک فن کے طلبار کو اپنے سامنے بلاتا، اُن میں باہم دگر بحث و مباحثہ کراتا اور بحث میں بازی لے جانے والے طلبار کو انعام دے کر رخصت کرتا۔

دار الحکمت کے کتب خانہ پر دو ہزار پانچ سو ستر دینار سالانہ خرچ ہوتے تھے۔ دار الحکمت کے کتب خانہ سے ہر شخص کو استفادہ کرنے کی عام اجازت تھی۔ آخر میں علامہ مقریزی نے دار الحکمت کے مصارف کی تفصیل یہ بتائی ہے:

بوریا دس دینار، کاتب ۹۰ دینار، بہشتی ۱۲ دینار، فراش ۱۵ دینار مرمت کتب ۱۲ دینار، قالین سرائی ۵ دینار، فرش ۸ دینار، داروغہ کتب خانہ ۴۸ دینار، کاغذ، قلم دوات ۱۲ دینار، مرمت پردہ وغیرہ ایک دینار

یہ صرف کتب خانہ کے اخراجات تھے، اس سے دار الحکمت کے اساتذہ کے مشاہروں اور طلبار کے وظائف وغیرہ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

دار الحکمت نے ابھی اپنی عمر کے دو تین سال ہی پورے کئے تھے کہ خود الحاکم بامر اللہ نے اس کو ختم کر دیا، اسی لئے غالباً مورخین نے بھی اس کو فراموش کر دیا، مگر حقیقت یہ ہے کہ دنیائے اسلام میں یہی وہ گم نام دار العلوم ہے جو آگے چل کر قیام مدارس کے لئے مشعلِ راہ بنا۔ اگر یہ موت کی آغوش سے محفوظ رہتا تو مدارس کی فہرست کا سرنامہ ہوتا۔

[دار الحکمت کے حالات ابن کثیر کی البدایہ والنہایۃ جلد ۱۱ ص ۳۴۲، اور کتاب الخطط علامہ مقریزی اور حاشیہ تاریخ الکامل ابن اثیر حالات ۳۹۵ھ اور ابن خلکان کے انگریزی مقدمہ سے ماخوذ ہیں]۔

•••

شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ

مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی

ایک علمی رسالے کے مضامین کی ترتیب کا مرحلہ بھی عجیب ہوتا ہے، مولانا سعید صاحب ابھی تازہ تازہ جنوبی افریقہ سے واپس ہوئے ہیں، جون کا برہان بھی ان کی عدم موجودگی میں مرتب ہوا ہے، عین وقت پر معلوم ہوا کہ رسالے کے تین چار صفحات خالی ہیں، عجلت میں اس کے علاوہ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ ان صفحوں کو پر کرنے کے لئے اپنی ریڈیو کی ایک تقریر دے دی جائے، ریڈیو کی تقریروں کا ایک خاص انداز ہوتا ہے، عام طور پر "برہان" میں یہ تقریریں نہیں دی جاتیں، توقع ہے قارئین اس تقریر کو اسی نقطۂ نظر سے پڑھیں گے۔ آل انڈیا ریڈیو کے شکریہ کے ساتھ یہ تقریر شائع کی جا رہی ہے۔

(ع)

حضرت سلطان نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد تصوف و سلوک کے سلسلۂ چشتیہ کے مرکزی نظام کو جس شخص نے وسیع پیمانہ پر چلا کر اس کو موثر اور ہمہ گیر بنایا وہ حضرت شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی ذاتِ والاصفات تھی، ۴۳ سال کی عمر میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر شرفِ بیعت حاصل کیا، بیعت کے شروع زمانہ کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت روشن چراغ حضرت سلطان المشائخؒ کی قیام گاہ کے قریب ایک درخت کے نیچے حیران، پریشان کھڑے تھے، حضرت سلطان المشائخ بالاخانے سے نیچے اتر رہے تھے کہ شیخ نصیر الدین پر ان کی نظر پڑی، خادم خاص کے ذریعہ خلوت میں بلا کر کیفیت دریافت

کی، عرض کیا "درویشوں کی جوتیاں سیدھی کرنے آیا ہوں" یہ جواب سن کر حضرت سلطان المشائخ نے ان کی جانب خاص توجہ فرمائی اور ان کی طلبِ صادق کو محسوس فرمایا، اسی کے ساتھ فرمایا جب میں اپنے مرشد کی خدمت میں رہتا تھا تو اجودھن میں میرے ایک ہم سبق نے میرے پھٹے کپڑے دیکھکر کہا، تمہارا یہ کیا حال ہے' اگر اس شہر میں لڑکوں ہی کو پڑھایا کرتے تو بھی تمھیں فارغ البالی میسر ہو جاتی، میں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا اور مرشد کی خدمت میں حاضر ہوا آپ نے مجھے دیکھکر فرمایا، نظام الدین! اگر تمہارا کوئی دوست تمہارا یہ حال دیکھکر تم سے پوچھے کہ آخر یہ کیا حالت ہے؟ تو اس کا کیا جواب دو گے، میں نے عرض کیا جو ارشاد ہو، فرمایا یہ شعر جواب میں پڑھ دینا۔

نہ ہمرہی تو مرا راہِ خویش گیر و برو　　　　ترا سعادتے بادا مرا نگوں ساری

اس کے بعد ایک خوان طلب فرمایا اور مجھ سے کہا کہ اس کو سر پر رکھکر جہاں تمہارا دوست ہے وہاں لے جاؤ۔ میں نے ایسا ہی کیا، دوست نے میرا یہ حال دیکھکر کہا "تمھیں یہ صحبت اور یہ حال مبارک ہو" حضرت روشن چراغ نے یہ واقعہ اپنے مرشد سے سنا تو قلب میں عشقِ الٰہی کی آگ شعلہ زن ہونے کے ساتھ مرشد کی محبت بھی پیوست ہو گئی۔ اور دل وجان سے شب و روز مرشد کی خدمت کرتے رہے، حضرت شیخ نصیر الدین کو اپنے مرشد سے جو والہانہ تعلق تھا اس کا ایک یہ واقعہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دفعہ حضرت محبوب الٰہیؒ کی خانقاہ میں خواجہ بہاء الدین زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مرید خواجہ محمد گازرونی آکر مقیم ہوئے وہ تہجد کی نماز کے لئے اٹھے تو جماعت خانے میں کپڑے رکھ کر وضو کرنے چلے گئے، واپس آئے تو کپڑے غائب تھے، ان کی تلاش میں شور کرنے لگے، حضرت شیخ نصیر الدین محمود خانقاہ کے ایک گوشے میں ذکرِ الٰہی میں مشغول تھے۔ انھیں خیال ہوا کہ اس شور و غوغا سے مرشد کی عبادت میں خلل آ جائے گا، فوراً خواجہ محمد گازرونی کے پاس پہونچے اور اپنے کپڑے اتار کر ان کو دیدئے صبح کو جب یہ واقعہ حضرت محبوب الٰہیؒ کو معلوم ہوا تو حضرت روشن چراغ کو بالاخانے پر طلب کر کے اپنی خاص پوشاک مرحمت فرمائی اور ان کے لئے دعائے خیر و برکت کی، کچھ دنوں مرشد کی خدمت میں رہنے کے بعد اودھ اپنی والدہ کے پاس چلے گئے لیکن یہاں لوگوں کے ہجوم کی وجہ سے یادِ الٰہی میں سکونِ خاطر میسر نہ آیا اس لئے آپ نے ضعیف والدہ کے ا

نے درخواست کی کہ ان کو جنگل کی تنہائی میں عبادت کرنے کی اجازت دی جائے، حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا "تعیرسے کہدو کہ عام لوگوں میں رہو اور مخلوق کی جفاؤں اور ظلم و زیادتی کو برداشت کرو۔ اس ایثار کا بدلہ ملے گا" چنانچہ آخر دم تک پیر و مرشد کے اس فرمان پر عمل پیرا رہے۔ کوئی جفا اور تعدی ایسی نہ تھی جس سے انھیں واسطہ نہ پڑا ہو۔ لیکن ان کی زبان پر کبھی کوئی حرفِ شکایت نہیں آیا۔

حضرت چراغ دہلوی کو ارشاد و اصلاحِ خلق کا کام انتہائی نامساعد حالات میں کرنا پڑا۔ دہلی اب علاء الدین خلجی کی دہلی نہ رہی تھی اب یہ شہر ایک مطلق العنان بادشاہ کے بدلتے ہوئے افکار و تصورات کا بازیچہ بنا ہوا تھا ایسے بحرانی دور میں ایک مرکزی روحانی نظام کو چلانے کے لئے زبردست فکری اور عملی صلاحیتیں درکار تھیں۔ روشن چراغ ایک مضبوط و مستحکم چٹان کی طرح اپنی جگہ پر قائم رہے اور صبر و ہمت سے کام کرتے رہے۔ بادِ مخالف کے تیز و تند جھونکے بھی ان کے پائے استقلال میں لغزش نہیں کر سکے، وقت کے اقتدارِ اعلیٰ سلطان محمد تغلق نے انھیں طرح طرح سے پریشان کیا، لیکن انھوں نے اپنے مرشد کے حکم سے سرِمو انحراف نہیں کیا اور شب و روز اصلاح و تربیت اور خدمتِ خلق کے کام میں لگے رہے۔

حضرت روشن چراغ دردمندیِ خلق اور مہر و محبت کی نورانی تصویر تھے، ان کے کردار و اخلاق کی عظمت اندازہ کرنے کے لئے صرف ایک ہی واقعہ کافی ہے۔ "خیر المجالس" جو حضرت کے ملفوظات و فرمودات کا نہایت مستند مجموعہ ہے اس کے تکملہ میں درج ہے کہ ایک روز ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد جماعت خانہ سے حجرۂ خاص میں تشریف لے گئے، حضرت کے یہاں کوئی دربان نہیں رہتا تھا، ان کے خادمِ خاص ان کے بھانجے زین الدین علی تھے، وہ بھی کبھی خلوت میں موجود رہتے تھے کبھی نہ ہوتے تھے، شیخ مشغولی اور مراقبہ کی حالت میں تھے کہ دفعتاً ایک بے باک قلندر جس کا نام تراب تھا، خلوت میں آ پہنچا اس کے پاس ایک چاقو تھا، اس نے شیخ پر چاقو سے وار کرنے شروع کر دیئے، شیخ کے جسم مبارک پر اس نے سترہ وار کئے، حضرت استغراق کی حالت میں تھے مطلقاً بچاؤ نہیں کیا، وہاں ایک نالی تھی جس سے خون بہہ کر باہر نکلنا شروع ہو گیا بعض مریدوں نے دیکھا تو اندر آئے، کیا دیکھتے ہیں کہ قلندر

چاقو کے مسلسل وار کر رہا ہے اور حضرت جنبش تک نہیں کرتے، ارادت مندوں نے چاہا
وحشت ایذا پہونچائیں مگر حضرت نے گوارا نہ کیا اور قلندر کو نہ چھوڑا کہ ایسا نہ ہو اس کو کوئی کسی طرح کی ایذا
پہونچائے۔ عبدالمقتدر تھانیسری کہ مریدانِ خاص میں تھے اور شیخ صدر الدین طبیب اور خادم خاص ... حال ہے'
علی کو اپنے پاس بلایا اور قسم دی کہ کوئی شخص قلندر کو ضرر نہ پہونچائے، اس کو خاص انعام دیا اور فرمایا اب نہیں
شاید چاقو مارنے میں اس کے ہات کو تکلیف پہونچی ہو۔ سبحان اللہ اہلِ بصیرت کو ان کے حسنِ سیرت تمہارا
اور اعلیٰ کردار کا اندازہ ہونا چاہئے کہ زندگی میں تسلیم و رضا کا کتنا اعلیٰ مقام اور درجہ رکھتے تھے

اس حادثے کے تین سال بعد ۱۸ رمضان المبارک ۷۵۷ھ مطابق ۱۳۵۶ء کو حضرت روشن چراغ
نے وصال فرمایا۔ ان کا وصال درحقیقت چشتیہ سلسلے کے دورِ اول کا خاتمہ تھا اور اس کی تا
کا وہ دور جو خواجہ خواجگان حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے شروع ہوا تھا اپنی غیر معمولی خصو
کے ساتھ ختم ہو گیا۔

تاریخ کا یہ عجیب واقعہ ہے کہ جس وقت چشتیہ سلسلے کا دورِ اول ختم ہوا اسی وقت سلطنت
دہلی نے بھی دم توڑا اگر ایک طرف حضرت چراغ دہلی کے وصال کے بعد سلسلۂ چشتیہ کا مرکزی نظام
ہو گیا تو دوسری طرف فیروز شاہ کے انتقال ۱۳۸۸ء کے بعد سلطنت دہلی کی مرکزی حیثیت بھی فنا ہو
صوبوں میں خود مختار حکومتیں قائم ہو گئیں اور دہلی کی امتیازی شان جاتی رہی۔ حضرت روشن چراغ
کے ملفوظات و ارشادات کے مجموعے "خیر المجالس" کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے اور جو نہایت
قابل توجہ ہے کہ اس میں اس وقت کے حالات کا جائزہ امیروں کے نقطۂ نظر سے نہیں، غریبوں
کے زاویۂ نگاہ سے لیا گیا ہے، اس دور میں مشترکہ تہذیب کی داغ بیل جس طرح پڑی اور سما
کے جن طبقوں سے اس کو تقویت پہونچی اس کی تفصیل بھی ان ملفوظات میں ملتی ہے۔ اس زما
میں ہندوستان میں اگر کوئی جگہ ایسی تھی جہاں سماج کے ہر طبقے اور ہر مذہب کے لوگ بے جھجک
بے ... لوگ جمع ہو سکتے تھے تو وہ انھیں صوفیائے کرام کی خانقاہیں تھیں، ان بزرگو

احترامِ انسانیت کی تلقین، اخوت ومساوات کی تعلیم، خدمتِ خلق کے لئے ایک جذبۂ بےتاب۔ ذخیرۂ
[illegible]مت، اور اصلاح کی دوسری تعلیمات سے ان ملفوظات کے صفحات مزین ہیں۔ آخر میں یہ بھی سنتے جائیے
کہ حضرت شاہ نصیر الدین کا لقب، چراغ دہلی کیسے ہوا۔ تاریخوں میں [illegible] ہے کہ رفتہ رفتہ حضرت خواجہ
نصیر الدین کی اصلاح وتربیت اور رشد وہدایت کی شہرت دور دور پھیل گئی۔ جب حضرت مخدوم جہانیاں
جلال الدین بخاریؒ مکہ معظمہ تشریف لے گئے تو وہاں کے شیخ امام عبداللہ یافعی سے ایک عرصہ تک تعلیم و
تربیت حاصل کرتے رہے، ایک موقع پر شیخ مکہ نے حضرت جلال الدین سے فرمایا اگرچہ شہر دہلی کے بڑے
بڑے مشائخ اٹھ گئے پھر بھی ان کی برکات کا اثر شیخ نصیر الدین محمود میں موجود ہے، ان کی ذات بابرکات
نہایت مغتنم ہے وہ "چراغ دہلی" ہیں، حضرت سید جلال الدین بخاری نے یہ سنا تو ان کو حضرت شاہ نصیر الدین
سے ملنے کا اشتیاق ہوا وہ مکہ معظمہ سے آئے اور حضرت کی قدم بوسی کر کے شیخ مکہ نے جو کچھ کہا تھا اس کو بیان
[illegible] کیا، اس کے بعد سے حضرت خواجہ نصیر الدین محمود کا لقب چراغ دہلی ہو گیا۔ عام لوگوں میں اس کے متعلق
[illegible] ایک اور روایت بھی مشہور چلی آرہی ہے، وہ یہ ہے کہ حضرت شیخ نصیر الدین محمود نے اپنے مرشد کے حکم
کی تعمیل میں باؤلی کی تعمیر کی نگرانی کا کام سنبھالا تو اس کی تمام ذمہ داریاں مثلاً معماروں اور مزدوروں
کی فراہمی، ان پر کام تقسیم کرنا اور ان سے کام لینا بھی شامل تھا، سلطان محمد تغلق بادشاہ کو چونکہ آپ سے
[illegible] تھی، اس نے اہل کاروں کی معرفت خاص حکمت عملی سے کام میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی اور
[illegible] مختلف تعمیری منصوبوں کے تحت تمام معماروں اور مزدوروں کو شاہی تعمیرات پر کام کرنے کے لئے متعین
[illegible] دیا، ادھر شاہ نصیر الدین کے ساتھ عوام کے جوشِ عقیدت کا یہ عالم تھا کہ تمام کاریگروں نے اپنے
[illegible] پر محنت شاقہ برداشت کی اور شیخ سے عرض کیا کہ ہم سب رات میں کام کر کے باؤلی کی تعمیر مکمل کریں گے،
[illegible] راتوں میں تعمیر کا کام شروع ہو گیا، شہنشاہِ وقت کو یہ خبر ہوئی تو اس کی پیشانی پر ناگواری کی شکنیں
[illegible] اور دکانداروں کو اس پر آمادہ کر دیا گیا کہ تیل کی فروخت بند کر دیں، مزدور اور معمار حسبِ معمول
[illegible] مطابق کام پر آئے لیکن اندھیرے کی وجہ سے کام شروع نہیں کر سکے، اس کی خبر حضرت سلطان
[illegible] کو ہوئی تو آپ نے شیخ نصیر الدین کو کہلا بھیجا کہ چراغوں میں پانی بھر کر جلائیں، چراغوں میں پانی
[illegible] اور حضرت شیخ نصیر الدینؒ کے جلانے پر تمام چراغ روشن ہو گئے اس واقعہ کے بعد سے آپ
[illegible] چراغ" مشہور ہو گئے۔ ...

دی مغل لائن لمیٹڈ

(حکومت ہند کا تجارتی ادارہ)

پروگرام حج سنہ ۱۹۷۴ء

حج سنہ ۱۹۷۴ء کی تمام درخواستیں مغل لائن کی جانب سے جاری کردہ نئے درخواست فارم پر قبول کی جائیں گی لہذا پرانے درخواست فارم قطعی طور پر استعمال نہ کئے جائیں۔

بمبئی سے بحری جہازوں کی روانگی: ہم انتہائی مسرت کے ساتھ ذیل میں حج سنہ ۱۹۷۴ء کے لئے جہازوں کی روانگی کا عارضی پروگرام پیش کرتے ہیں:

بمبئی سے روانگی		جدہ سے روانگی	
(قبل رمضان)			
۱۔ ایم، وی، اکبر	۲۰ر ستمبر سنہ ۱۹۷۳ء	ایس، ایس مظفری	۹ر جنوری سنہ ۱۹۷۴ء
(بعد رمضان)			
۲۔ ایم، وی، اکبر	۳ر نومبر سنہ ۱۹۷۳ء	ایم، وی، اکبر	۱۳ر جنوری سنہ ۱۹۷۴ء
۳۔ ایس، ایس، سعودی	۸ر نومبر سنہ ۱۹۷۳ء	ایس، ایس، سعودی	۱۵ر جنوری سنہ ۱۹۷۴ء
۴۔ ایس۔ ایس، مظفری	۱۴ر نومبر سنہ ۱۹۷۳ء	ایس، ایس، مظفری	۲۸ر جنوری سنہ ۱۹۷۴ء
۵۔ ایم، وی، اکبر	۱۹ر نومبر سنہ ۱۹۷۳ء	ایم، وی، اکبر	۳۱ر جنوری سنہ ۱۹۷۴ء
۶۔ ایس، ایس، سعودی	۲۷ر نومبر سنہ ۱۹۷۳ء	ایس، ایس، سعودی	۵ر فروری سنہ ۱۹۷۴ء
۷۔ ایس۔ ایس، مظفری	۲ر دسمبر سنہ ۱۹۷۳ء	ایس، ایس، مظفری	۱۵ر فروری سنہ ۱۹۷۴ء
۸۔ ایم، وی، اکبر	۵ر دسمبر سنہ ۱۹۷۳ء	ایم، وی، اکبر	۱۷ر فروری سنہ ۱۹۷۴ء
۹۔ ایس، ایس، سعودی	۱۷ر دسمبر سنہ ۱۹۷۳ء	ایس، ایس، سعودی	۲۵ر فروری سنہ ۱۹۷۴ء
۱۰۔ ایس، ایس، مظفری	۲۰ر دسمبر سنہ ۱۹۷۳ء	ایس، ایس، مظفری	۴ر مارچ سنہ ۱۹۷۴ء
۱۱۔ ایم، وی، اکبر	۲۳ر دسمبر سنہ ۱۹۷۳ء	ایم، وی، اکبر	۷ر مارچ سنہ ۱۹۷۴ء

کرایہ جہاز: بمبئی، جدہ، بمبئی کے سفر کا کرایہ مندرجہ ذیل ہے، صرف واپسی ٹکٹ جاری کئے جائیں گے

فرسٹ کلاس	کرایہ مع خوراک	محصول بندرگاہ جدہ و کرایہ مکان	فارن ٹریول ٹیکس	پلگرم پاس وغیرہ کی فیس	مجموعی رقم
بالغ	۲۲۴۰ روپے	۱۵۰ روپے	۲۷۲ روپے	۱۴ روپے	[illegible] روپے
بچے ۳ تا ۵ سال	۱۲۴۰ ،،	—	۱۸۶ ،،	۱۴ ،،	۱۴۴۰ ،،
بچے ۱ تا ۳ سال	۱۰۷۴ ،،	—	۱۹۱ ،،	۱۴ ،،	[illegible]

اسپیشل ڈیک کلاس صرف ایم، وی، اکبر میں } یہ انتظام بالائی ڈیک میں مزید سہولتوں مثلاً آرام دہ بستر اور ۶ تا ۱۲ بستروں کے علیحدہ علیحدہ کمپارٹمنٹ کے ساتھ کیا گیا ہے۔

	کرایہ مع خوراکی	محاصل [illegible]	فارن ٹریول ٹیکس	پلگرم پاس وغیرہ کی فیس	مجموعی رقم
بالغ	۹۵۰ روپے	۱۵۰ روپے	★ مستثنیٰ	۱۴ روپے	۱۱۱۴ روپے
بچے ۳ تا ۵ سال	۴۷۵ "	- -	★ "	۱۴ "	۴۸۹ "
بچے ۱ تا ۳ سال	۴۲۵ "	- -	★ "	۱۴ "	۴۳۹ "

ڈیک کلاس

	کرایہ مع خوراکی	محاصل [illegible]	فارن ٹریول ٹیکس	پلگرم پاس وغیرہ کی فیس	مجموعی رقم
بالغ	۹۰۰ روپے	۱۵۰ روپے	★ مستثنیٰ	۱۴ روپے	۱۰۶۴ روپے
بچے ۳ تا ۵ سال	۴۵۰ "	- -	★ "	۱۴ "	۴۶۴ "
بچے ۱ تا ۳ سال	۴۰۰ "	- -	★ "	۱۴ "	۴۱۴ "
ایک سال سے کم	- -	- -	★ "	۱۴ "	۱۴ "

★ بشرطیکہ درخواست گزار، ان عازمین حج میں ہو جنھیں حکومت ہند نے زرمبادلہ دینا منظور کیا ہے بصورت دیگر کرایہ کا دس فیصد ٹیکس روانگی کے وقت بمبئی میں ادا کرنا ہوگا۔

سال گزشتہ کے جن عازمین کا کرایہ مغل لائن میں جمع ہے وہ اپنے حوالہ نمبر کے اندراج کے ساتھ مزید درکار رقم کا ڈرافٹ روانہ کریں۔

پابندیاں حکومت ہند نے عازمین حج کے مفاد عامہ اور ان کی بھلائی کے پیش نظر بعض پابندیاں عائد کی ہیں۔ لہٰذا عازمین حج کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ ان عائد کردہ پابندیوں کو اچھی طرح سمجھ کر درخواست دیں۔ درج ذیل عازمین کی درخواست ناقابل قبول ہوگی۔

(الف) وہ افراد جو گزشتہ پانچ سال یعنی [illegible] تا [illegible] کے درمیان ہندوستان کے کسی بھی حصہ سے فریضۂ حج ادا کر چکے ہیں۔ ایسے افراد حج بدل پر بھی نہ جا سکیں گے۔

(ب) وہ بچے جن کی عمر ۵ اور ۱۴ سال کے درمیان ہوگی۔

(ج) قبل رمضان سفر کرنے والے وہ عازمین جن کے پاس دو ہزار (۲۰۰۰) روپے اور بعد رمضان سفر کرنے والے وہ عازمین جن کے پاس ۱۷۰۰ روپے سولہ سو ستر روپے سے کم رقم ہو قبل اور بعد رمضان کے عازمین کو زیادہ سے زیادہ دو ہزار روپے تک زرمبادلہ دیا جائے گا۔

(د) وہ خواتین جنھیں جہاز پر سوار ہوتے وقت پانچ ماہ یا اس سے زائد کا حمل ہو۔

(و) حسب ذیل بیماریوں اور متعدی امراض میں مبتلا افراد

(۱) دماغی امراض (۲) تپ دق یا سل (۳) قلبی امراض (۴) شدید دمہ (۵) متعدی جذام (۶) دیگر شدید متعدی بیماریاں یا جسمانی معذوری

شدید بیماری یا خاتون کے حمل پر شبہ کی حالت میں بمبئی میں ان کا طبی معائنہ کیا جائے گا۔ لہٰذا عازمین حج غلط بیانی سے درخواست نہ دیں۔

درخواست بھیجنے کا طریقہ

حج ۱۹۷۳ء کے تمام عازمین کے لئے انتہائی ضروری ہے کہ وہ مغل لائن سے بلاقیمت تقسیم کئے جانے والے نئے درخواست فارم پر درخواست دیں پرانے فارم پر دی گئی درخواست قبول نہیں کی جائے گی

رخواست کے دونوں فارم ہر طرح سے مکمل ہونے چاہئیں اور ان کے ساتھ ہی پوری رقم کا فرسٹ کلاس
یل ٹوبک کلاس یا ٹک کلاس کا بنک ڈرافٹ بھی ہونا چاہئے۔ درخواست فارم اور بنک ڈراف
ت رجسٹرڈ پوسٹ کے ذریعہ مغل لائن لمیٹیڈ ۱۶ بنک اسٹریٹ، فورٹ، بمبئی ۱ کے نام
ولائی ۱۹۷۳ء تک پہنچ جانے چاہئیں۔
ا ریاست جموں وکشمیر (۲) منی پور (۳) جزائر انڈمان ونکوبار (۴) جزائر لکادیپ، منی کوئی اور امین دا
درخواستوں کا انتخاب ریاستی حج کمیٹی / ایڈمنسٹریٹر کرتے ہیں لہذا ان مقامات کے عازمین حج صرف متعلق
م کو درخواستیں دیں گے۔

خواستیں وصول ہونے کی آخری تاریخ

حج ۱۹۷۴ء کے لئے مقررہ فارم پر تمام درخواست
مذکورہ بالا طریقہ کے مطابق ہر اعتبار سے مکم
رڈ پوسٹ کے ذریعہ اس طرح روانہ کی جائیں کہ وہ کمپنی کے رجسٹرڈ آفس پر ۳۰ جولائی ۱۹۷۳ء یا ا
قبل پہنچ جائیں۔ دستی طور پر کوئی درخواست دفتر کے کاونٹر پر قبول نہیں کی جائے گی۔ ۳۰ جولائی ۷۳ء
جد پہنچنے والی کوئی درخواست قبول نہیں کی جائے گی اور اسے بھیجنے والے کو لوٹا دیا جائے گا۔

خواست فارم

نئے جاری کردہ درخواست فارم برائے حج ۱۹۷۴ء صرف عازمین حج کو ان کی گذارش
مغل لائن مفت مہیا کرتی ہے۔ عازمین حج کے لئے لازمی ہے کہ وہ حج ۱۹۷۴ء
لئے چھپے ہوئے نئے فارم کا استعمال کریں اور پرانے فارم قطعاً استعمال نہ کریں۔ یہ بات خاص طور پر
جاننا چاہیے کہ فارم مہیا کرنے، درخواستیں اور کرایہ کی رقم قبول کرنے یا اس طرح کا کوئی کام انجام دینے کے
ل لائن نے اپنی کوئی شاخ، نمائندہ یا ایجنٹ مقرر نہیں کیا ہے۔
مذکورہ بالا معلومات حج ۱۹۷۴ء کے لئے مغل لائن کے جاری کردہ اعلان کا اختصار ہے۔ مکمل تفصیلا
درخواست فارم کے لئے لکھیے:

مغل لائن لمیٹیڈ

۱۶ بنک اسٹریٹ، فورٹ، بمبئی ۱

تار کا پتہ: مغل بمبئی "MOGUL" BOI
ٹیلی فون: ۲۵۶۸۳۵
ٹیلیکس: ۰۱۱-۲۰۴۹

Phone : 262815

سالانہ قیمت دس روپے

فی پرچہ ایک روپیہ

[illegible]